روحانی نمبر

دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

اشاعت کے 37 سال

APRIL / MAY
2020

■ ”رباط“ سچی کہانیاں کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ مایہ ناز مصنف کاوش صدیقی کے قلم سے

■ مسئلہ یہ ہے، آپ کے مسائل کا روحانی حل سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

WWW.PAKISTANIPOINT.COM

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: حماد زیدی
ثمینہ روزی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا 88-C-II فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل
(یونائیٹڈ بیکری کے اوپر) ڈیفنس فیز-7 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0309-2773279

سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ
اقبال حسین
0311-2827690
محمد عاصم
0336-3407268

لیگل ایڈوائزر
دانیال شمسی (ایڈووکیٹ)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

قیمت فی شمارہ: 100 روپے ❋ جلد: 37 - شمارہ: 04 ❋ اپریل 2020ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

صفحہ	عنوان	مصنف
06	اداریہ	منزہ سہام
07	احوال	مدیرہ اعلیٰ
25	حضرت آسیہ	تہمینہ عمیر
30	حضرت پیر مہر...	ایم حسن نظامی
34	نور فیض	حنا بشریٰ
44	مناظرہ	عبدالغفار عابد
48	جسے راستہ مل گیا	کوثر اسلام صوابی
52	نگر نگر پھرا...	ملازم حسین شیرازی
62	تم تجارت...	مجید احمد جائی
7	نادیدہ ہاتھ	عالی مان آفاقی
83	آج کا شاعر	ایم اے خالق بھٹی
86	سکون کی کھڑکی	سیدہ عروج فاطمہ
8	روحانی سفر کی...	نور شاہد حسین
97	حضرتِ انسان	حمائل فاطمہ
103	اللہ اجر دے گا	دستگیر شہزاد

صفحہ	عنوان	مصنف
115	کتاب تبصرہ	مجید احمد جائی
118	میرا رب وارث	منزہ سہام مرزا
121	صاحبِ کرامات	جاوید راہی
130	خواجہ سرا	فرح انیس
137	رباط	کاوش صدیقی
152	سارے جگ کی بوا	ایم اے خالق بھٹی
155	مین پنجتن کی...	ایمان فاطمہ ارمان
160	درویش لوگ	چوہدری امین
163	آسمانی مصیبتیں	اقراء جبار
166	لوحِ محفوظ کی...	ڈاکٹر [illegible] آکاش
172	روشن وجود	غزالہ عزیز
190	مرشد کامل	حافظہ مومن بخاری
196	اس کا خدا	شگفتہ مشتاق
209	مسئلہ یہ ہے	ادارہ
216	ڈائری	قارئین
224	پاکستانی شوبز	حماد زیدی

021-35893122-35893123 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 1250 روپے، افریقہ 75 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 75 ڈالرز، ایشیا، یورپ 65 ڈا

شتر بے مہار

جو موت سے نہ ڈرے اُسے بہادر کہتے ہیں تاریخ گواہ ہے کہ اس زمین نے بڑے بڑے سورما پیدا کیے جن کی ہیبت سے کیا دشت کیا جنگل سب کانپ اٹھتے تھے۔ تیمور لنگ، محمود غزنوی، چنگیز خان، کوئین میری، ہٹلر اور ایسے بہت سے نام۔ اپنی اپنی قوموں میں سے یہ جنگجو نکلے اور زمین کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندتے ہوئے گزر گئے۔ دنیا آج بھی ان کو یاد کرتی ہے۔ مگر دنیا میں ایک خطہ ایسا بھی ہے جہاں ایک، دو، دس نہیں بلکہ پوری قوم بہادری کی آخری سرحدوں کو چھو رہی ہے بلکہ شاید کوئی سرحد ہی نہیں ہر حد اور سرحد پار کی جا چکی ہے۔ یہ وہ قوم ہے جو دشمن سے تو ڈرتی ہے موسم کی سختی بھی سہہ نہیں پاتی، روزہ بھی بہت لگتا ہے، پیسے کی تنگی سے تو حالت خراب ہو جاتی ہے، نہیں ہے خوف کسی کا اگر تو وہ خالق کائنات ہے۔ تبھی تو ذخیرہ اندوزوں، سود خوروں، موقع پرستوں اور گراں فروشوں کی ایک فوج ہے۔ انہیں موت کا خوف تو ہے مگر موت کے بعد حساب کتاب کی فکر نہیں، انہیں موقع سے فائدہ اٹھانا تو خوب آتا ہے مگر یہ نہیں پتہ کہ موت موقع نہیں دیتی۔ کرونا وائرس کی وبا نے اللہ تو یاد نہیں دلایا ہاں ماسک اور دیگر جان بچانے والی ادویات کی قیمتیں 200 گنا بڑھا دی گئی ہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں اب ایسی شتر بے مہار قوم کو کیا کہا جائے۔

منزہ سہام مرزا

احوال

مدیرہ اعلیٰ

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

عزیز احوالیو! اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہم سب کو ہر قسم کے وبائی امراض سے محفوظ رکھے۔ اس وقت پورے ملک کی صورت حال ہی تشویشناک ہے مگر کراچی میں کرونا کے مریض بہت زیادہ ہیں اور اس سے بھی زیادہ پورے سندھ میں لہٰذا آپ سب سے گزارش ہے کہ اپنا اور اپنے آس پاس والوں کا خیال رکھیں اور آیئے مل کر دعا کریں کہ جلد اس وبا سے نجات حاصل ہو یہ شمارہ حسب وعدہ روحانی نمبر ہے۔ جون میں عشق نمبر آئے گا لہٰذا اب جلدی سے اپنی تصانیف ارسال کردیں۔ کیونکہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت، روحانی نمبر آپ کو کیسا لگا ضرور بتایئے گا اور اب بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب......

ایم یعقوب احمدانی بلوچ، جام پور سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! آپی جی کیا حال ہیں امید ہے خداوند کریم سے خوش باش ہوں گی۔ مارچ کا شمارہ بہت جلد ہی مل گیا بہت خوشی ملی کہ ٹوٹے لفظوں کو جگہ بخشی اداریہ صرف حکمران ہی لاجواب موضوع لیا تو آج واقعی صرف حکمران ہی ہیں عوام بے بس لاچار ہے اور کچھ نہیں۔ احوالی سے معاملات کرتے ہوئے سب سے پہلے اقراء جبار بہت ہی لاجواب چوہدری یاسر وکی صاحب عمدہ تبصرہ، مور شاہد حسین وری گڈ اروشمہ، ایم اے خالق بھتی صاحب ایم حسن نظامی صاحب لاجواب افضل بھائی اُم مناہل، محمد زبیر گوجرہ سے راکی ولسن ڈاکٹر طارق محمود آکاش، ملازم حسین شیرازی، فریدہ فری، حنا بشریٰ، محسن علی طاب اور لال مرچ عبدالغفار عباد صاحب کے کمال کے تبصروں کے ساتھ رونق افروز نما تھے۔ اللہ پاک ان سب کو سلامت رکھے آمین۔ اب کہانیوں پر تھوڑی نظر وہی اول وہی آخر مہر پرویز دولو بہت ہی عمدہ ایمان کو تازہ کردیا بے شک کوئی مثال نہیں اول اور آخر جیسے رسول پاک ﷺ کی، سب کو نیک عمل کرنے کی خدا ہدایت دے آمین۔ عبرت کا نشان مائی جیونی خوشی کے لمحے بختاں سفارس ایم حسن نظامی، گرداب، بیٹا جی حنا بشریٰ، سوال، رفعت خان پیاسی روح، رقاصہ، غلطی کا احساس اقراء جبار خواب ریت کوہ کن دین کے دشمن وادی لہو رنگ مرد کا پرستار، اور مسئلہ یہ ہے ڈائری، شعر و سخن بہت ہی لاجواب اسٹوریز پڑھنے کو ملیں سب دوستوں نے عمدہ لکھا سب کو مبارکباد ہمیشہ خوش رہو۔ جی آپی جی سب یہ آپ کی محبت کا ثبوت ہے کہ لیٹ کو جگہ دے کر نوازش کی سچی کہانیاں کے بہت احسان ہیں بندہ ناچیز پر، کوشش تو یہی ہے کہ کچھ لکھ سکوں ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو پلک سنوار کے سچی کہانیاں کے اوراق میں جگہ بخشی انشاء اللہ میری کوشش کو ترتیب دینے کا احسان فرمائیں۔ سازشوں کے انبار بہت ہیں امید ہے نظر ثانی ہوگی ہر لکھاری یا قاری کی طرح ہی ادارہ سمجھے گا ادنیٰ انسان کو سب احوالی کو الفت بھرا سلام۔

☆ یعقوب بھائی کوئی سازش نہیں سب اپنے ہیں۔ سچی کہانیاں کے مزاج کے مطابق کہانی لکھیے میں ضرور شائع کروں گی۔

ایم حسن نظامی، قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ منزہ سہام مرزا صاحبہ آداب عرض امید ہے آپ اور پورا اسٹاف بخیریت ہوں گے۔ روحانی اور غیر مرئی مخلوق کی تحریر 'مقدس جنات' حاضر خدمت ہے۔ اس کا تعلق میرے آبائی گاؤں شہر جیلانی سے ہے اور میں نے ہمیشہ حقائق پر لکھنے کو ترجیح دی ہے۔ نئی چیز قارئین کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاگرد جنات کی نشانی جو بہت ریسرچ کے بعد اوپن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ قارئین، طویل مسافتوں کے بعد ہی وقت صدیوں میں بدلتا ہے۔ کوئی پیڑ مہینوں تک سرسبز و شاداب

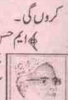

پتوں کا پیراہن اوڑھے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن اچانک واحد دن یا کسی رات اسکی سبز پتیاں زرد ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ ایک ایسے ہی گاؤں کی داستان حیات' اس کے آشیانے کا دامن مسرتوں سے بھرا تھا۔ مسرتوں اور سکون کی کونپلیں پھوٹ چکی تھیں۔ زندگی کے خوبصورت رنگوں سے بھرے دن اسی طرح روشن تھے کہ عرصہ سے ان کا رنگ نہیں کملایا تھا۔ ایک دن اچانک نفرت کی دھوپ سے بھرے روشن دن تاریکیوں میں بدل گئے ساز یہ تھرکتے تارے کی لرزش یکدم تھم گئی۔ کتاب زیست کے تمام اوراق بکھر کر رہ گئے۔ چھوٹی سی بدگمانی جو سرزد ہو گئی تھی۔ صبح بیدار ہوئے تو اللہ والے بزرگ جا چکے تھے اپنے ابدی سفر پر شاید وہ بھی حیران و پریشان ہوئے اپنی غلطی کوتاہی پر اور حیرت و صدمے نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ آپ اور پوری ٹیم عمدہ معیاری اور اصلاحی مواد کی طرف گامزن ہے خداوند کریم آپ بھی اور ہمیں سدا اس سفر پر گامزن رکھے آمین۔

☆ نظامی بھائی! نفرت اور حسد ان سے بڑا تو کوئی دشمن ہی نہیں بس اللہ سب کو محفوظ رکھے۔

☙ عبدالغفار عابد' چیچہ وطنی سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! دعا ہے اللہ تعالیٰ سے کہ وہ راحتوں اور مسرتوں کو ہمارا مقدر بنا دے خواہشوں اور چاہتوں کو ہمارے لیے آسان کر دے اور اللہ ہم پر اپنی عنایات کو بے شمار کر دے آمین۔ عزیز ساتھیو ہماری شکایت تھی گلہ تھا کہ سچی کہانیاں لیٹ مارکیٹ آتا ہے ادارے نے ہماری اس شکایت پر توجہ دی اب پرچہ یکم دو تک مل جاتا ہے اس بار احوال کی محفل پہلے سے زیادہ پُر رونق تھی ہم نے اگر ہر سو محبتیں تقسیم کیں تو اس رونق میں مزید اضافہ ہو گا ہماری آپس کی محبتوں کا اثر سچی کہانیاں کی سرکولیشن پر بھی پڑے گا اور لوگوں کے دلوں پر بھی ہو گا۔ اداریے دونوں پُر اثر اور غور طلب تھے غلطیاں دونوں طرف ہیں۔ سیاستدانوں کو اپنے ذاتی مفاد عزیز ہیں اور عوام بنا سوچ سمجھے اپنی من مانی میں لگے ہوئے ہیں چودہ سو سال سے کہا اور سنا جا رہا ہے کہ ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے مال جمع کیا اور گن گن کے رکھا مگر مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسی فیصد آمدنی بیس فیصد لوگوں کے پاس ہے باقی اسی فیصد لوگ بیس فیصد پر گزارہ کر رہے ہیں یہ ناانصافی ہے اسی لیے تو ہمیں کرونا وائرس جیسی کئی پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے جس رب نے حضرت موسیٰؑ کو پانی سے بچایا حضرت ابراہیم کو آگ میں محفوظ رکھا وہی اب ہمیں کرونا وائرس سے محفوظ رکھے گا۔ اس کی تفصیل مہر پرویز کی ایمان کو تازہ کر دینے والی تحریر ہی اول وہی آخر' میں موجود ہے خوبصورت زندگی خود بخود نہیں بن جاتی اس کے لیے حکم الٰہی کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ انسانوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ جانوروں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ زندگی کو جینا پڑتا ہے اس لیے کم اور اپنوں کے لیے زیادہ تب جا کے کہیں خوشی کے لمحے میسر آتے ہیں۔ یہاں کھانے پینے کے آداب ہوتے تھے آج وہاں انسانوں کے جملے کاٹنے کے بھی باقی نہیں رہے۔ بھوک کی ماری بے بس عوام دہائیاں دے رہی نہ انہیں انصاف مل رہا ہے اور پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی ہے دلوں میں احساس ختم ہو چکا ہے ہمارے رویے ہمارا کردار انسانیت کو رونے پر مجبور کر رہا ہے اپنی ایک لمحے کی خوشی کی خاطر دوسروں کی پوری زندگی دکھوں کے حوالے کر دیتے ہیں دھوکہ وہی سے عزتوں کو نیلام کیا جا رہا ہے۔ ملازم حسین شیرازی کی عبرت کا نشان' فوزیہ احسان رانا کی بختاں میمونہ صدف کی مائی جیونی نسیم سکینہ صدف کی ساون کے دکھ' حنا بشریٰ کی بیٹا جی' اور رفعت خان کی خاندانی وقار' پڑھی کہیں انسانیت نظر نہیں آئی کاش ہم سمجھ لیں کہ زندگی کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ جب ہم روٹھ جائیں تو کوئی منانے والا ہو' محبت یہ نہیں کہ تم تڑپو اور اسے خبر نہ ہو محبت یہ ہے کہ تمہارا دل تڑپے اور اس کے دل پر قیامت گزرے اپنی غلطی کا احساس اقرا جبار کی اچھی تحریر تھی عظیم اور بہادر لوگ وہی ہوتے ہیں جو اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔ ملازم حسین شیرازی یہ میرا کمال نہیں آپ کی پرکھ اور سوچ کا کمال ہے۔ فریدہ فری آپی اللہ آپ کو سلامت رکھے آمین۔ یاسر بھائی ضرور کوشش کروں گا میرے تبصرے اور کہانیوں پر اپنی قیمتی رائے دینے والوں کو سلام کہتا ہوں عزیز ساتھیو آپ سے ایک دو باتیں کرنا چاہتا ہوں شاید دوبارہ کسی کو بے نامی خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑے مخالف اور اختلاف دو الگ الگ چیزیں ہیں میرا کسی کی سوچ اور کردار سے اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر مخالفت نہیں اور نہ ہی دوران تربیت مجھے مخالفت کا سبق پڑھا

گیا ناصر بھیا کی وفات کے بعد ایک دن آفس گیا نئے ایڈیٹر کے موضوع پر بات ہوئی باجی نے بتایا کاشی دوبارہ آنا چاہتا ہے اس بات کا میں خود بھی گواہ ہوں کاشی نے مجھے فون کیا کہا میں دوبارہ سچی کہانیاں میں کام کروں یا نہ کروں میں نے کہا آپ باجی سے بات کرو۔ میں نے باجی سے بھی کہا اگر آپ کاشی کو دوبارہ ایڈیٹر بنانا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا میں سب سے پہلے اس کو خوش آمدید کہوں گا۔ بہ شرط کہ پہلے وہ آپ کو یقین دلاتے کہ ادارے کی پالیسی اور معیار کو اہمیت دے گا دوسری اور اہم بات جو میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا میری کسی سے کوئی لڑائی نہیں کوئی مخالفت نہیں وہ چاہے ممتاز بھائی ہو مجید جائی ہو یا ساحل ابڑو انسانیت کو زندہ رکھنے اور اس محفل کو رونق بڑھانے کے لیے تمام اختلافات ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں آئیں سب ایک ہو جائیں محبت ہی دنیا کا حسن ہے۔

☆ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو محفوظ رکھے گا اور غفار بھائی میرا تو ماننا ہے ناراضگیاں صرف وقت ضائع کرتی ہیں۔ زندگی ویسے ہی مختصر ہے خوش رہنا چاہیے۔

☙ مور شاہد حسین' قمبر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں۔ آپی منزہ سہام سلام و آداب سچی کہانیاں 2020ء کا تیسرا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ پانچ مارچ کو ملا صرف حکمران بہترین اداریہ محفل احوال اپنے عروج پر تھی۔ تمام احوالی بہن بھائیوں کو سلام و دعائیں اسلامی کہانی اچھی تھی خوشی کے لمحے بے حد پسند آئی۔ عبرت کا نشان' خاندانی وقار' غلطی کا احساس' خوب ریت کے گھروندے' بس آموز تحریریں پڑھنے کو دیں بے حد شکریہ' مائی جیونی' ساون کے دکھ' بختاں' سفارش' گرداب' بیٹا جی' سوال' پیاسی روح' رقاصہ عمدہ تحریریں تھیں۔ رباط عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کتاب تعارف انٹرویو' مسئلہ یہ ہے' ڈائری شعر و سخن اور پاکستانی شوبز بہترین سلسلے ہیں باقی تحریریں اچھی تھیں۔ آپی مزاح نمبر کے لیے دلچسپی سے بھرپور تحریر بھیج رہا ہوں امید ہے پسند آئے گی آخر میں گزارش ہے کہ احوال میں خط کے ساتھ میری نئی تصویر لگائیں پلیز پلیز نوازش ہو گی۔

☆ لیجیے شاہد بھائی! آپ کی نئی تصویر لگا دی اب تو خوش ہیں ناں؟

☙ غلام رسول ابڑو' جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ میں طویل عرصہ سے سچی کہانیاں کا قاری ہوں۔ اپنے محبوب دوست مور شاہد حسین کی محبت نے کئی بار لکھنے پر مجبور کیا لیکن مصروفیات مزید لکھنے کی اجازت نہیں دیتی بس کبھی کبھی احوال کا چکر لگا لیتا ہوں سچی کہانیاں مجھے ہمیشہ اپنا سا لگا میں پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں میری وائف بھی سچی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔ ہماری اکثر محبت بھری لڑائی ہوتی ہے کہ میں سچی کہانیاں پہلے پڑھوں۔ محترمہ میں سرکاری ملازم ہوں اور جیکب آباد ایئرپورٹ میں نوکری ہے میری وائف کے اگلے ماہ پیپر ہیں ان کے لیے دعا کریں نوازش ہو گی۔ انشاء اللہ سچی کہانیاں میں حاضری لگواتا رہوں گا بس آپ کی توجہ اور محبت چاہیے۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے کسی ایک کہانی کا ذکر کرنا باقی سے زیادتی ہو گی۔ آپ کا انتخاب بھی بہترین ہوتا ہے۔ سچی کہانیاں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

☆ غلام رسول بھائی! آپ کی بیگم کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں اور امید کرتی ہوں کہ اب آپ پابندی سے احوال میں شرکت کیا کریں گے۔

☙ اُم مناہل' ایبٹ آباد سے لکھتی ہیں۔ منزہ باجی السلام علیکم! امید ہے تمام اسٹاف خیریت سے ہو گا اپنی کہانی کو انعام یافتہ لسٹ میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ واہ منزہ باجی ڈابر آملہ کی کیا بات ہے میرے بال بھی بہت روکھے اور بے رونق ہیں سوچ رہی ہوں ڈابر آملہ استعمال کرنا شروع کر دوں سب سے پہلے منورہ آنٹی کی کہانی 'وڈکا پرستار' پڑھی جو کہ مزہ دے کر پھر سے منورہ آنٹی کی یادیں تازہ کر گئی صرف حکمران بے شک کرپشن ہر دور میں رہی اور ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں' مگر چھوٹے بڑوں سے ہی تربیت لیتے ہیں اگر بجلی کا یونٹ غریب کی تنخواہ کے حساب سے ہو تو کیوں کوئی بجلی چوری کرے اور یہی مثال باقی اداروں کے لیے بھی ہے اب تو دنیا میں ہر چیز کا معیار امیر کے حساب سے ہے غریب بے چارہ تو ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے جیسے 'ساون کے دکھ' اور سفارش والی میں ہے بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے عورت زیادہ

قربانی دیتی ہے یا بچوں کو دو وقت کی روٹی دینے کی خاطر مرد زیادہ قربان ہوتا ہے اس بات کا تو تجزیہ کیا ہی نہیں جا سکتا پاکستان پر عورت نے بھی حکومت کی اور مرد نے بھی مگر عوام ہر دورِ حکومت میں روتی اور پستی رہی۔ عبرت کا نشان وہی صحیح چیز کا غلط استعمال یا والدین کی غلط تربیت کچھ بھی کہہ لیں جھوٹی محبت میں اندھی ہو جانے والی بدنصیب لڑکی کی داستان عبرت ایک سبق آموز تحریر تھی۔ قربانی عورت یا مرد نہیں دیتے وہی دیتا ہے جس کے اندر احساس ذمے داری ہو بھوک افلاس، غربت، مرد کی بے حسی اور عورت کی لاچاری جس معاشرے کا حصہ ہوں وہاں مائی جیونی اور بختیاں جیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ گرداب یہ کہانی تو اب گھر گھر کی کہانی بن گئی ہے بڑھاپے میں ماں باپ کو گھر کا فالتو پرزہ سمجھنے والوں کو ایسے ہی مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہر وہ بیٹا جو آج اپنے ماں باپ سے بدظن ہے اس کے لیے بہت بڑا سبق اس کہانی میں موجود ہے اللہ جب رسی دراز کرتا ہے تو شاید اسی لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے بندے کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہے کہ اے بندے سنبھل جا مگر نامراد بندہ بھی اس وقت تک غفلت میں پڑا رہتا ہے جب تک اس کے اپنا بھگتنے کا وقت نہیں آتا ہے۔ کوہ کن ایک معجزہ تحریر تھی ورنہ تو اکثر اس طرح کانوں میں دبنے والے مزدوروں میں سے کبھی بھی کوئی زندہ نہ نکلا۔ حسرتوں کا جنازہ ماں باپ جب اپنی ضد پر اڑ جائیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہر رشتے میں عیب نکال دیں تو ان کے گھروں سے کنواری بوڑھی بیٹیوں کے جنازے حسرتوں کا ماتم کرتے ہوئے ہی نکلتے ہیں ایسے ماں باپ اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے گناہ گار بندوں میں شمار ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر والدین کو عقلِ سلیم عطا فرمائے اور انہیں بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی طاقت دے ایسے والدین کو یہ نہیں پتہ ہوتا ہے کہ بیٹیوں کو بے جا بٹھا لینا آخرت میں ان کے لیے کتنی بڑی پکڑ ہے۔ ملکہ زبیدہ تاریخ ساز شخصیت کے بارے میں بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئی عاطر شاہین سے ملاقات اچھی رہی۔ وادی لہو رنگ پاکستان کے وجود کو کبھی بھی ہندوستان نے قبول نہیں کیا جس کا بدلہ وہ ستر سال سے نہتے کشمیری مسلمانوں سے لے رہا ہے اور اپنا غلام بنا رکھا ہے ایک طرف مسلمان 1947ء میں نوے سال کی انتھک محنت کے بعد انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے تو دوسری طرف کشمیری مسلمان ہندوؤں کی غلامی میں چلے گئے کشمیر کی جنگ ایک ایسا سانحہ تھی جس کے رونما ہونے کے بعد لگنے والی چوٹوں کے زخم آج ستر سال بعد بھی تازہ ہیں اللہ سے دعا ہے جلد کشمیری بھائیوں کو بھی آزادی کا سورج دکھائے اس کے ساتھ ہی اجازت دیں اور ہاں باجی انعام کی رقم آپ ابو کے پتے پر ہی بھیج دیجیے گا ورنہ ہمارے پتے پر تو رُل جائے گی۔

☆ اُمِ مناہل! شاید اس بار انعامی رقم ملنے میں کچھ تاخیر ہو جائے وجہ موجودہ حالات ہیں بہرحال جیسے ہی انعامی رقم ملے مطلع کر دینا۔

✽ شمیم حسنین، حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہن منزہ سہام السلام علیکم! محترم سہام مرزا کی محنت، خلوص، جانفشانی دراصل اب رنگ لا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ آپ نے جس حوصلے اور مضبوط قوتِ ارادی سے اس ادارے کو سنبھالا ہے۔ وہ خود قابلِ ستائش ہے۔ اس نے لکھنے والوں کی جس طرح پذیرائی کی اور انہیں آگے بڑھنے کا موقع دیا وہ بھی دیدنی ہے۔ صرف حکمران نہیں ہم سب ذمہ دار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ حکمرانوں نے ہمیں جو اسلامی وطن دیا تھا ہم نے خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کیا۔ تو حکمران ہم میں سے ہی ہونے لگے۔ تبصرے اتنے جاندار اور حقیقت لیے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن سے خود کہانیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ ایم اے خالق بھٹی، ایم حسن نظامی، اُمِ مناہل اور بھائی ملازم حسین شیرازی کیا لاجواب تبصرے تحریر فرماتے ہیں کہ دل خوش ہونے کے ساتھ حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے اور ذہنی طور پر خود کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو یاد تو رکھتے ہیں یہی قربت کی دلیل ہے ایسا لگتا ہے بلکہ لگتا نہیں حقیقت ہے کہ سچی کہانیاں ایک علمی اور ادبی ماہنامہ کی صورت اختیار کر رہا ہے اور اس کو منزہ سہام، ملازم حسین شیرازی، ایم حسن نظامی، حنا بشریٰ، بشریٰ خان اور سب بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ خوشی کے لمحے واہ واہ مزاح نمبر تو ابھی سے ہی شروع ہو گیا۔ میں بہت ہنسا۔ مائی جیونی، بختاں، بیٹا جی، ہمارے دور کا المیہ اور ہم سے سوال ہے کیا ہم ایسے ہی ہیں، پیاسی روح، معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہے لکھتے ہوئے

جیجل میتلو کی آنکھیں نم ضرور ہوئی ہوں گی۔ آب دیدہ، آنکھیں، دیکھیے انشاء اللہ سفالہ پوش بھی ارسال کروں گا۔ وہی اول وہی آخر لازوال حقیقت ہے، ودکا پرستار زندہ زندہ تحریر ہے۔ ملکہ زبیدہ تاریخ ساز شخصیت یہ بھی حقیقت ہے۔

☆ شمیم صاحب! بس پھر تو طے ہو گیا اب آپ جلدی سے مجھے مزاح نمبر کے لیے اپنی تحریر ارسال کر رہے ہیں میں منتظر رہوں گی۔ یہ آپ سب کی مہربانی ہے جو آج میں اس قابل ہوں کہ اپنے دونوں شماروں کی مدیرہ ہوں خوشی کی بات یہ ہے کہ اب سچی کہانیاں اور دوشیزہ کی مدیرہ کوئی حادثاتی مدیرہ نہیں بلکہ اپنے دور کے بہت بڑے صحافی سہام مرزا کی نہ صرف دختر ہے بلکہ ان کی زیرِ تربیت بھی رہی ہے لہٰذا دونوں پرچوں میں اب ان کا رنگ نظر آنا چاہیے اور آئے گا بھی اور میں امید کرتی ہوں کہ آپ جیسے سینئر شخصیات میری رہنمائی ضرور کریں گے۔

✽ چوہدری یاسر وکی، دیپالپور سے لکھتے ہیں۔ تمام قارئین کو محبت بھرا سلام قبول ہو امید ہے سب دوست خیریت سے ہوں گے مارچ کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے بڑھتے ہیں احوالیوں کی طرف اقراء جبار، غلام مرتضیٰ علوی، سلمان شبیر، مور شاہد، عروشمہ خان ان کے خط اچھے تھے۔ ایم اے خالق بھٹی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ایم حسن نظامی قبولہ شریف آپ کی محبت ہے جو ہر ماہ مجھے یاد رکھتے ہیں۔ پرنس افضل شاہین تھینکس سر حوصلہ دینے کا شکریہ۔ اُمِ مناہل زبیر ساغر گوجرانوالہ کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ راکی ولسن ارے بھائی غزلیں پسند کرنے کا شکریہ ایم یعقوب احمدانی سر ماشاء اللہ بڑی مدتوں بعد آپ نے سچی کہانیاں کی طرف انٹری ماری ہے یار آتے رہا کرو۔ وہی اول وہی آخر مہر پرویز احمد دولو دین کے متعلق کی گئی باتیں کہانی کی شکل میں اچھی تھیں۔ خوشی کے لمحے منزہ سہام مرزا بیسٹ اسٹوری تھی۔ عبرت کا نشان ملازم حسین شیرازی اچھی اسٹوری تھی۔ سفارش ایم حسن نظامی قبولہ شریف کیا بات ہے۔ سر اچھی اسٹوری تھی دل باغ باغ ہو گیا پڑھ کر اللہ آپ کو ایسے ہی لکھتے رہنے کی توفیق دی۔ نزہت جبیں ضیاء اچھی اسٹوری تھی آپ کی بشریٰ خان جیجل میتلو، رقاصہ ریاض سب اسٹوریاں اچھی تھیں۔ آخر میں آپی منزہ آپ سے ریکسویسٹ ہے کہ میری اسٹوری جلد سے جلد شائع کریں اور دوسری ریکویسٹ یہ ہے کہ مجھے اعزازی پرچہ دیا جائے سارے رائٹروں کو اعزازی پرچہ دیا جا رہا ہے مجھے بھی اعزازی پرچہ دیا جائے آپ کی عین نوازش ہو گی اور میری حوصلہ افزائی بھی ہو جائے گی۔ امید ہے آپ ناامید نہیں کریں گی۔

☆ یاسر! شمارہ اعزازی طور پر بھی ملتا ہے اور کہانی شائع ہونے پر تو ضرور ملتا ہے آپ بھی جلدی جلدی حاضری لگوایا کریں آپ کو شمارہ پابندی سے ملے گا۔

✽ ارشد اقبال چوہان، فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا بہت پیار دعائیں السلام علیکم! احوال میں حاضر ہوں کچھ گھریلو مصروفیات اور پرچہ کا دیر سے ملنا، پھر بھی معذرت مجھے یہ تحریر کرتے ہوئے کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہو رہی کہ میری سمجھ دار بہن کا سرکولیشن منیجر کا انتخاب کوئی اتنا اچھا نہ ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ پہلے اُسے کسی تجربہ کار آدمی کے زیرِ سایہ کام کرواتیں۔ پھر اتنی بڑی ذمہ داری سونپتی۔ میری تو رائے ہے کہ یہ ذمہ داری میرے بھانجے زین کو اضافی دے دیں۔ پھر نتیجہ دیکھیں۔ فیصل آباد پاکستان کا تیسرا بڑا شہر اور یہاں سچی کہانیاں جیسے پرچہ کا نہ ملنا افسوس کی بات ہے آگے آپ بہتر جانتی ہیں۔ اب مارچ کے شمارے کی طرف آتا ہوں۔ اتنا جامع اداریہ ہمارے معاشرے کی مکمل تو نہیں مگر خاصی حد تک عکاسی ہے۔ اس کی وجہ صرف ہمارے دین سے ہماری دوری ہے یقیناً آپ کو اتفاق ہو گا۔ مہر پرویز احمد دولو کی تحریر پڑھ کر بے اختیار درود پاک کا ورد زبان سے جاری ہو گیا۔ خود آپ نے بہت دیر بعد انٹری دی مگر آپ کی تحریر ڈابر آملہ ہیئر آئل کا اشتہار ہی لگی۔ شیرازی صاحب میرا خیال ہے کہ احوال میں میرے خط کے بعد آپ کا شکوہ دور ہو گیا ہو گا۔ آئندہ کوشش کروں گا کہ غیر حاضر نہ ہو۔ آپ حسبِ معمول چھا گئے۔ ہمیں واقعی اپنی نئی نسل کے لیے بہت کچھ سوچنا اور کرنا ہو گا۔ آپ کی تحریر آپ کی زندگی میں گزرے سچے واقعات پر مبنی ہوتی ہے اس لیے زیادہ چاشنی ہوتی ہے۔ میمونہ صدف صاحبہ اتنی پیاری تحریر پر مبارکباد قبول کریں۔ سکینہ صدف کی ساون کے دکھ پر ایک بہت پرانا شعر عرض ہے۔

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں

جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

فوزیہ صاحبہ ہمارے ملک میں غریب واقعی کتوں سے بدتر ہیں۔ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو رہے ہیں قانون ہے پابندی نہیں، عدالتیں ہیں انصاف نہیں، ظلم ہے مگر کوئی روکنے والا نہیں، ہمیں کسی آئین کی قانون کی ضرورت ہیں ہمیں ہمارے اللہ نے اپنے کلام میں پورا ضابطہ حیات عطا کیا ہے ایک دفعہ صحیح طرح نافذ تو کر کے دیکھیں زکوۃ لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ جن قوموں نے اپنے ممالک میں عمر لاء نافذ کیا۔ وہ ترقی یافتہ ہیں یہ ہماری قوم اور رہنماؤں پر ایک سوالیہ نشان ہے؟ نظامی صاحب آپ کی سفارش نے رُلا دیا۔ پیار کی قربانی صدف صاحبہ جیسے کردار ہی دے سکتے ہیں۔ ہر کوئی نہیں، بہت خوب اتنی پیاری تحریر پر خصوصی مبارکباد قبول فرمادیں رباط دن بدن نکھرتی جارہی ہے۔ کاوش صاحب آپ جس طرح پلاٹ کو پھیلا رہے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ ایک لمبا عرصہ ہماری بصارتوں کا رزق بنتی رہے گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... ہر کہانی پر تبصرہ کرنا خط کو طویل کر جاتا ہے اور میں حق تلفی کا قائل نہیں جو بغیر تبصرہ کے ہیں اس کا مطلب یہ نیں کہ وہ اچھی نہیں سب تحریریں پیاری ہیں۔ میری بہن ایک اچھے مالی کی طرح باغ سے خوشبودار اور خوبصورت پھولوں کا انتخاب کر کے گلدستہ تیار کرتی ہیں جو ہر گلدان میں پیارا لگتا ہے۔ وادی لہو رنگ افتخار چوہدری کی کشمیر کے بارے میں تحریر، کاش ہمارے کسی غیرت والے حکمران کی نظر سے گزر جائے آمین۔ مرحومہ منورہ نوری صاحبہ کی تحریر بہت دیر بعد پڑھنے کو ملی۔ آپ کا شکریہ اللہ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے کسی کو بھی اگر کوئی بات ناگوار گزرے تو اُس کی معذرت، سچی کہانیاں کے قبیلہ کے ہر فرد کے لیے ایمان والی زندگی کی دعا کے ساتھ اجازت اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ تحریری ملاقات ہوگی۔ مارچ کا پرچہ بروقت مل گیا تھا بہت شکریہ۔

☆ارشد بھائی! آپ نے درست فرمایا فیصل آباد پاکستان کا تیسرا بڑا شہر ہے اسی لیے پرچا وہاں بروقت ملے ہم نے ایجنٹ تبدیل کرلیا ہے نئے ایجنٹ کا نمبر شمارے میں موجود ہے اب فیصل آباد میں بھی سچی کہانیاں آسانی سے دستیاب ہوگا اور درست کہا آپ نے میری تحریر کردہ کہانی اشتہار ہی تھا۔

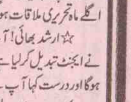

مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ، سلام مسنون، سرورق خوبصورت حسینہ کے قدرتی

حسن کا شاہکار تھا۔ آپ کا اداریہ بائیس کروڑ عوام سے سوال تھا کہ آپ کتنے سچے، مخلص اور فرض شناس ہیں۔ یقین بوٹوں والوں کی حکومت ہر دور میں ووٹوں والوں سے بہتر رہی ہے۔ معذرت، ہم سے ہمارا فرض نہ پوچھیں احوال میں کرسی صدارت کی مہمان اقرا اجبار اپنا حال سنا رہی تھیں۔ ہمیں پتہ ہوتا تو ضرور بیمار پرسی کرتے، فروٹ پھولوں کے ساتھ دو چار لیٹرز خون کی بوتلیں بھی دے آتے، محترم سلمان بشیر، مور شاہد حسین، ایم حسن نظامی، اُم مناہل استاد ملازم حسین شیرازی، عثمان غنی اور حافظہ مون کا ممنون ہوں ناچیز کی حوصلہ افزائی کی۔ محسن علی طاب آپ کو خلوص بھرا اسلیوٹ وہ اس لیے کہ آپ نے رباط کو پسند کیا۔ شمارے کی سیر کی سر سید کہانی مگر قربان جاؤں قارئین کے ذوق کے کہ کسی نے دو لفظ لکھنا گوارا نہ کیے۔ محترم ایم حسن نظامی استاد جناب ایم سلیم اختر کی وفات پر مضموم نظر آئے محترم منزہ سہام کے خوشی کے لمحات خوب تخیل تھا۔ بس گزارش اتنی ہے کہ مٹر چھیلے نہیں جاتے چھلیوں سے نکالتے جاتے ہیں اور ڈابر آملہ کی تصویر ہوتی تو صفحات مزید خوبصورت لگتے، ملازم حسین شیرازی کو نیکی گلے پڑی اور لڑکیوں نے زندگی کے فیصلے بھی لمحوں میں کرنا شروع کر دیے یہ جلدی زندگی کا تاوان دے کر بھی پیاسی رہتی ہے۔ مائی جیونی میمونہ صدف کی بہترین تحریر تھی۔ عزت کے بدلے زندگی کی سانسیں خریدیں۔ فوزیہ احسان رانا کی بختاں حقیقت پر مبنی تحریر تھی۔ آج ہر جگہ غریبوں کی بجائے کتوں کے آگے بچا کچھا سالن ڈال دیا جاتا ہے اور چاول جب بو مار جاتے ہیں تو ڈنگروں کے آگے ڈال دیے جاتے ہیں۔ مگر کسی انسان کو کھانے کے لیے نہیں دیتے کیونکہ غریب نے کون سا کام آنا ہے۔ ایم حسن نظامی کی سفارش محبت اور دولت کے پتواروں سے چلنے والی کشتی تھی۔ مگر آج میں جیت پاپی پیٹ کی ہوئی۔ جس کو بھرنے کے لیے سچی محبت سے ہاتھ دھو کر روپوں کی خاطر غیر کی ڈولی میں بیٹھ کر صاحبہ ہار گئی یا شاید جیت گئی۔ نزہت جبیں کا گرداب ہے وہ گرداب ہے جس سے شاید قیامت تک ساس اور بہو نہ نکل سکیں۔ بہوئیں

جب سانسیں بنتی ہیں تو سابقہ زندگی کے تمام تجربات، واقعات، پانی کے بلبلوں کی طرح پھونکیں مار کر مٹا دیتی ہیں۔ حنا بشریٰ کے بیتا جی میں کچھ قصور محترمہ کا بھی تھا اور ہمیشہ صنف نازک سے آشیرباد ملنے پر ہی مرد حضرات انتہائی قدم اٹھاتے ہیں۔ بشریٰ خان کا سوال بہت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ بچے تو من کے سچے ہوتے ہیں۔ رفعت خان خاندانی وقار کو بچانے میں آخر کار کامیاب ہوگئیں۔ تین لاکھ تو ہاتھوں کی میل ہے اور عزت تو کروڑوں خرچ کرنے سے بھی واپس نہیں آتی۔ کاشف حسین عائز کی غزل بہت خوب تخیل پر مبنی تھی۔ جیجل میتلو ایک تلخ حقیقت لے کر آئیں۔ سگی ماں نے اپنی عزت کے ساتھ بیٹی کی عزت بھی لٹوا دی اور پھر خالی ہاتھ ارمانوں کے ساتھ دنیا سدھار گئی۔ شاہد حسن کا عمر کا نوحہ حسرتوں کا رونا تھا۔ عمر تو عمر ہوتی ہے۔ صبغہ احمد کی رقاصہ میری نظر میں اول انعام کی حقدار ہے۔ آخری جملے یاسر نے مہر کا جلا ہاتھ دیکھا تو یہ پڑھ کر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ زندگی کا قرض یوں بھی چکانا پڑتا ہے جیسے مہرین چکا رہی تھی۔ رباط محترم کاوش صدیقی کی تحریر میری پسندیدہ کہانی ہے۔ زہرہ کو جاگیردار سے نجات دلانے قاسم کو جاگیردار بنانے کے بعد اک نئی منزل کی طرف رباط گامزن ہے۔ عاطر شاہین سے ملاقات خوب رہی۔ صاحب تو چھپے رستم نکلے واقعی رستم تھے ہیں لاعلم تھا۔ اقراء جبار اپنی زبان میں ہم جنس کی اصلاح کی کوشش کرتی نظر آئیں کراچی لاہور دھکے کھانے کے بعد آخر حیدر ہی سائباں بنا۔ اروشمہ خان عنبر کی متکبر سوچ والی زندگی پر روشنی ڈال رہی تھی۔ دھکے کھا کھا کر آخر ماں باپ کی دہلیز پر ہی سکون آیا۔ نازیہ بتول نے حاجی صاحب کی ہٹ دھرمی پر کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ مونا شہزاد آخر کار وہ کن بچانے میں کامیاب ہوگئی۔ عالی مان آفاقی ہندوؤں کی درندگی پر روشنی ڈال رہے تھے جن کے سنگ گزری تھی۔ افتخار چوہدری نے خوبصورت الفاظ مظلوم کشمیریوں کے حالات زندگی بیان کیے۔ ایم اے خالق بھٹی کا تعارف منورہ نوری ایمان افروز تحریر لاجواب تھی۔

☆پرویز بھائی! یہ کیا لکھ دیا آپ نے بھئی احوال میں شرکت کرنے والے بیشتر لکھاری رباط کو پسندیدگی کی سند دیتے ہیں اور اکثریت سلسلے وار ناول سب سے آخر میں پڑھتی ہے لیکن کیونکہ احوال میں شرکت بھی ضروری ہوتی ہے اس لیے جلد خط لکھ کر ارسال کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جویریہ ندا، کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! بہت ہی قابل احترام منزہ سہام و دیگر مصنفین و قارئین سب

سے پہلے طویل غیر حاضری کے لیے معذرت، بدلتے موسم، خشک گرد آلود ہواؤں، ٹھنڈک کے باعث نزلہ زکام اور بخار کی وجہ سے کچھ لکھ نہ پائی تاہم اس دوران باقاعدگی سے ماہنامہ سچی کہانیاں کا مطالعہ نہ چھوڑا اور ہر تحریر کو بڑھ کر پایا۔ شکریہ ان سب کا جنہوں نے اس ناچیز کی کمی کو محسوس کیا۔ اس ماہ کا شمارہ تھوڑا دیر سے موصول ہوا۔ سرورق پر بنی مڑ کر دیکھتی ہوئی حسینہ کو دیکھ کر ایک شعر ذہن میں کوندا۔

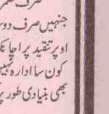

تیری محفل سے اٹھے تھے کسی کو خبر تک نہ تھی
بس تیرا مڑ مڑ کر دیکھنا ہمیں بدنام کر گیا

صرف حکمران منزہ سہام صاحبہ آپ نے صحیح معنوں میں ہم عوام کو آئینہ دکھایا۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ہم وہ ہیں جنہیں صرف دوسروں میں برائی نظر آتی ہے اور اپنا گریبان کوئی نہیں جھانکتا، دوسروں پر تنقید کرنا ہمارا اولین فرض اور اپنے اوپر تنقید پر اچانک بھڑک جانا کہ گویا ہم برائیوں سے پاک ہیں، کرپشن صرف حکومت میں ہی نہیں ہے، پاکستان کا ایسا کون سا ادارہ نہیں ہے جہاں کرپشن نہیں، ہمیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ اس کرپٹ معاشرے کا حصہ رہ کر ہم بھی بنیادی طور پر کرپٹ ہو چکے ہیں۔

برا سمجھوں انہیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

احوال میں ملازم حسین شیرازی، ایم حسن نظامی، حنا بشریٰ، اُم مناہل، اقرا اجبار، ڈاکٹر طارق محمود آ کاش، پرنس افضل شاہین، غلام مرتضیٰ علوی، حمیرا انجم، ثمرا احمد، محسن علی طاب، ایم اے خالق بھٹی و دیگر کے خطوط اور تبصرے شاندار رہے۔

آتے ہیں تحریروں کی طرف ایمان کو تازہ کرتی ہوئی مہر پرویز احمد دولو کی پہلی تحریر وہی اول وہی آخر بلاشبہ بہترین تھی۔

تیری قدرتوں کا شمار کیا
تیری وسعتوں کا حساب کیا
تو محیط عالم رنگ و بو
تیری شان جل جلال ہو

بے شک دنیا و آخرت کی بہتری اور کامیابی اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کے بنائے ہوئے راستے میں ہے۔

کی محمد ﷺ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

خوشی کے لمحے بالآخر ایک عرصے بعد منزہ سہام صاحبہ کی تحریر نظر آئی۔ یقین مانیے دل خوش ہو گیا شادی کے مسائل لڑکیوں کی پریشانیاں' زلفوں کے حوالے سے مختصر رومانی تحریر ثابت ہوئی مختصر اً مگر پُر اثر......

کبھی ٹوٹ ٹوٹ برسیں کبھی بوند بوند ترسیں
تیری زلف کے یہ بادل بڑے بے لگام ٹھہرے

ملازم حسین شیرازی کی تحریر عبرت کا نشان' واقعی عبرت انگیز سچائی تھی۔ معاشرے کا کڑوا سچ اور کریہہ چہرہ جس سے شاید ہم دانستہ طور پر منہ پھیرتے ہیں۔ جہاں دور جدید کی ایجادات نے حضرت انسان کو آسانیاں دیں وہاں ان ایجادات کا بے دریغ اور فضول استعمال نے عقل پر تالے ڈال دیے۔ ہر چیز کی اچھائی اور برائی ہوتی ہے اور ہم نے اس کی برائیاں لیں کیونکہ برائی بظاہر بڑی خوشنما نظر آتی ہے۔ کھلاؤ سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نگاہ سے' اس مقولے کو شاید والدین بھی بھول گئے ہیں۔ والدین کو شاید یہ اسلامی تعلیمات دینا بھولتے جا رہے ہیں کم عمر نوجوان لڑکے لڑکیوں کے ہاتھوں میں موبائل فونز دے کر اپنی ذمہ داری سے مبرا ہو جاتے ہیں ان کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ نہیں رکھی جاتی اور آنکھ تب کھلتی ہے جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ میمونہ صدف کی تحریر مائی جیونی نے بحیثیت بنجاروں کی زندگی اور جائز خواب دیکھنے والی عورت کی زندگی کا خوبصورت طریقے سے احاطہ کیا۔

میری حقیقت بھی ہے اک خواب کی طرح
خواب بھی وہ کہ جس کی کوئی تعبیر ہی نہیں

نسیم سکینہ صدف کی تحریر ساون کے دکھ' مختصر انداز میں لکھی گئی' برسات کے دوسرے پہلو کو اجاگر کرتی ہوئی تحریر قرار پائی' برسات کے پکوان' میگھ ملہار' لانگ ڈرائیونگ صرف یہی برستی ساون کے منظر نہیں ہیں حقائق میں آئیں پکی عمارتوں کی چھتوں سے ٹپکتا پانی' سیلاب' کچے گھروں کا مخدوش ہو جانا' بجلی کے تاروں سے جان سے ہاتھ دھونے کے واقعات' اگر ایک طبقہ ساون کو انجوائے کرتا ہے تو اکثریت پر مشتمل دوسرا طبقہ اذیتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

شفاف ہو گئیں ' سبھی اونچی حویلیاں
ایک جھونپڑی کی چھت نہ رہی بارشوں کے بعد

ایم حسن نظامی کی خوبصورت الفاظ اور ادھوری محبت پر گندھی تحریر سفارش آنکھوں میں آنسو لا گئی یقیناً سفارش' رشتے ناطے' محبت' انسانی جذبات کو قربانی کی نہج پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے بعض اوقات روشن مستقبل محبت کی قربانی بھی مانگ لیتا ہے۔ عرض کیا ہے۔

ملنا اتفاق تھا بچھڑنا نصیب تھا
وہ اتنا ہی دور ہو گیا جتنا قریب تھا
ہم اس کو دیکھنے لیے ترستے ہی رہے
جس شخص کی ہتھیلی پر ہمارا نصب تھا

نزہت جبیں ضیاء کی گرداب ایک سبق آموز تحریر رہی۔ دوسروں کے ساتھ برا کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ وقت کا پہیہ گول گول گھومتا ہے اپنا کیا واپس سود سمیت ہمارے پاس واپس آئے گا۔ جو ہم نے بویا وہی کاٹیں گے۔ یقیناً ہم رشتوں کا تقدس بھول گئے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں تمہارے بچے وہ نہیں کریں گے جو تم ان سے کہتے ہو بلکہ وہ کریں گے جو تم خود کرتے آئے ہو۔ شاید یہی مکافات عمل کی صورت ہے۔

ازل سے ہے مکافات عمل کا سلسلہ قائم
رلایا جس نے اوروں کو وہ خود بھی چشم تر ہوگا

حنا بشریٰ صاحبہ کی تحریر بیٹا جی بہترین رہی۔ ہمیشہ کی طرح حنا بشریٰ نے اپنے قلم کی نوک سے بہترین الفاظ کے چناؤ اور جملوں کی برجستہ ادائیگی کمال مہارت سے کی ہے اور معاشرے کے ان گھناؤنے چہروں کی نشاندہی کی ہے اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس دنیا میں اللہ کے بعد ماں باپ سے زیادہ مخلص رشتہ اور کوئی نہیں ہے نیز یہ بھی بتایا کہ گھر والوں کی تربیت اور کڑی نظر کس قدر ضروری ہے۔ آپ کسی کی نیت اور فطرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بس صرف اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ آپ سے مخلص وہی رشتے ہیں اور وہی رشتے پاکیزہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے جائز اور محرم بنائے ہیں۔ جن میں پہلا رشتہ ماں باپ کا ہے بے لوث رشتہ......

انسان کی فطرت کو سمجھتے ہیں صرف پرندے
جتنا بھی محنت سے پاس بلاؤ مگر پاس نہیں آتے

بشریٰ خان کی تحریر سوال جامع الفاظ میں لکھی گئی مختصر اور پر اثر تحریر ثابت ہوئی بچوں کے سوال معصوم ضرور ہوتے ہیں مگر ملاوٹ سے پاک' سچائی پر مبنی ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہم اس معاشرے کے دوزخی انسان ہیں دوسروں کو تلقین حالات کے لحاظ سے اور تعلیمات الگ تربیت کے لحاظ سے' ایسے میں ان معصوم ذہنوں میں یقیناً سوال اٹھے گا کہ قول و فعل میں تضاد کیوں؟ اقرا جبار کی تحریر' عذرا کی کہانی عذرا کی زبانی ایک سبق آموز اور پر سنبھل جانے والی عورت کی سبق آموز کہانی تھی۔ نازیہ بتول رضا کی درد بھری لیکن معاشرے کی کڑوی کسیلی حقائق پر مبنی تحریر حسرتوں کا جنازہ اچھی رہی۔ ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی اور سخت رویہ عذرا جیسی شریف لڑکیوں کو گھر کی دہلیز پر ہی زندہ لاش بنا دیتی ہے بقول شاعر کے......

اب تلخیوں کا سامنا کرنے کا وقت ہے
اب عمر خواب دیکھنے والی نہیں رہی

حب الوطنی کے جذبے سے بھرپور عالی مان آفاقی کی تحریر دین کے دشمن اور کشمیر کے حالات پر لکھی گئی افتخار چوہدری کی تحریر وادی لہو رنگ جوش و جذبے سے گندھی رہی۔ منورہ نور خلیق (مرحومہ) کی اُم المومنین حضرت جویریہؓ بنت حارث پر لکھی گئی خصوصی تحریر ودکا پرستار سب میں بہترین رہی۔ اسلامی تاریخی واقعے کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مصنفین جیجل میتلو' صبغہ احم' اروشمہ خان کی تحریریں بھی اچھی تھیں۔ کاوش صدیقی کا سلسلہ وار' رباط' زبردست جا رہا ہے کتاب تبصرہ مینار محبت کا شہزادہ اور عاطر شاہین کا انٹرویو بھی اچھے رہے۔ میری طرف سے منزہ سہام صاحبہ' مصنفین اور دیگر قارئین کو رمضان المبارک کی پیشگی مبارکباد' اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس رمضان المبارک کے تمام روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے ہر ناگہانی آفات سے محفوظ رکھے اور ہمارے ہر اچھے عمل کا اجر اللہ قبول فرمائے آمین ثم آمین۔ تمام خاص نمبروں کا اعلان سن کر بے حد خوشی ہوئی اور تحاریر کے متعلق موضوع اور اسٹوری لائن مرتب کرنے کا ٹائم بھی مل گیا۔ انشاء اللہ اس دفعہ سچی کہانیاں کی تحاریر کا حصہ بننے کے لیے نئے آئیڈیاز پر کام کروں گی اور آپ تمام سینئرز کی رہنمائی بھی درکار ہے۔ خط کا اختتام اس دعا کے ساتھ کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ماہنامہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے اور آپ ہمیشہ صاف ستھرا ادب اور نو آموز لکھاریوں کو بہترین پلیٹ فارم فراہم کرتے رہیں آمین ثم آمین۔

☆جویریہ! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے لاجواب خط اور بے مثال تبصرہ ارسال کرنے کا شکریہ۔

ملازم حسین شیرازی، بھکر سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہن منزہ سہام مرزا صاحبہ امید ہے بخیریت ہوں گی۔ مارچ کا تازہ شمارہ ماشاء اللہ بہت خوبصورت دیدہ زیب ہے۔ خوبصورت ماڈل رنگوں کی کہکشاں میں گردن ختم کیے مقابلہ پر اکسا رہی ہیں کوئی ہم سا ہے تو سامنے آئے اداریہ آپ نے صحیح فرمایا نیچے سے اوپر تقریباً سب کرپٹ ہیں اگر کوئی نیک بنا پھرتا ہے تو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ تم نیک اس لیے ہو کہ برائی کرنے کی جرأت نہیں۔ مہر پرویز احمد دولو کی اسلامی کہانی وہی اول وہی آخر ایمان کو تازہ اور مہمیز کرتی خوبصورت تحریر اللہ پاک اور اس کے پیارے محبوب ﷺ کا ذکر کرنا اعلیٰ ترین عمل اور بیش بہا بصیرت و خوش نصیبی ہے۔ ڈاہر آملہ ہیر آئل اس کی خوبی کو منزہ سہام نے خوبصورت کہانی میں ڈھال کر خوب اجاگر کیا اب تو لازماً پسندیدگی کی سند ملے گی بہت خوب، سفارش ایم حسن نظامی سفارش اور رشوت گھن کی طرح معاشرے کو چاٹ رہے ہیں ایک طویل اور اچھا پیغام دیتی بے مثال کہانی بہت عمدہ، نسیم سکینہ صدف میرے حسین شہر بھکر سے تعلق رکھنے والی خوبصورت تحریر کی ملکہ یونہی ادبی دنیا میں رونقیں بڑھاتی رہیں خوش رہیں بیٹا جی حنا بشریٰ کسی کو بیٹی بیٹا بہن کہنا آسان ہے لیکن رشتوں کے تقدس اور ان کی پائیداری کو قائم رکھنا۔ سنبھالنا، سمجھنا نہایت ذمہ داری کا کام ہے ہر انسان کے اندر ایک دوسرا انسان ہوتا ہے اسے وہ خود یا رب العزت جانتا ہے ہم چہروں کی پہچان نہیں کرسکتے۔

لباس خضرؑ میں یہاں سینکڑوں رہزن بھی پھرتے ہیں
اگر دنیا میں جینا ہے تو کچھ پہچان پیدا کر

خاندانی وقار رفعت خان کوئی کسی کو اپنے جال میں نہیں پھنسا سکتا جب تک پھنسنے والا خود مائل اور دام الفت کا شیدائی نہ ہو عبرت ناک بہترین کہانی، پیاسی روح جیجل میتلو درد بھری کربناک کہانی بہترین کاوش، رباط کاوش صدیقی اسرار تجسس سے بھرپور بے مثال آپ بیتی سلسلہ کامیابی کی طرف رواں مصنف راکی ولسن کی مینار محبت کا شہزادہ جسے جناب مجید جائی نے اپنے موثر تبصرہ سے نوازا، خوبصورت الفاظ سے پذیرائی کی کامیابی کے لیے دعا، عاطر شاہین سے لیا گیا محسن علی طاب کا انٹرویو نہایت شاندار رہا، عاطر شاہین کی ادبی خدمات نے بہت متاثر کیا۔ نہایت عمدہ، اپنی غلطی کا احساس اقراء جبار ٹھوکر کھا کر سنبھلنے والے جیت ہے تیری ہار نہیں اثر انگیز سبق آموز کہانی ماشاء اللہ، زبیدہ ان جیسی نیک رحم دل صورت و سیرت میں یکتا اعلیٰ کردار و اقدار کی بے مثل خاتون تاریخ کے اوراق میں بہت کم ملتی ہے تہمینہ عمیر کی عمدہ تحریر، ایم اے خالق بھٹی نے بہاولپور کے سابق میئر مخلص ہمدرد علم دوست، قابل احترام سیٹھ عبدالرحمن کے بارے میں چشم دید واقعات و معلومات نہایت عمدگی سے فراہم کیں ماشاء اللہ منورہ نوری خلیق واقعی اس ماہ کی خصوصی لاجواب تحریر، اروشمہ خان نادیہ بتول رضا عالی مان آفاقی کی تحریر کردہ تحاریر بہترین رہیں۔ باقی کہانیاں بھی شاندار ہیں ہر کہانی پر فرداً فرداً تبصرہ خط کی طوالت کا باعث بنتا ہے۔ خطوط سب سے پہلے ذکر کرنا چاہوں گا اپنی پیاری بیٹی حافظہ مون بخاری کا جو عرصہ تین ماہ بعد صفحہ زیست ادب پر جلوہ افروز ہیں۔ خوبصورت تحاریر پڑھنے کا انہوں نے ایسا چسکا اور شوق دیا کہ عدم دستیابی دل ملول رہا۔ نگاہیں دل نشین الفاظ کو ڈھونڈتی رہیں لیکن کوئی خط، کہانی نہ ملی، تازہ شمارہ میں آپ کی کہانی نہیں لیکن اس کی تشنگی کی کمی کو آپ کے دل لبھا خط نے پوری کی سلامت رہیں۔ قاری عثمان غنی آپ ہماری پیاری نامور لکھیت بیٹی حافظہ مون بخاری کے برادر بزرگ ہیں ہمارے لیے قابل احترام ہیں خوش آمدید، اقراء جبار اللہ پاک آپ کو اچھی صحت سے نوازے، خطوط، کہانیاں قابل رشک ہوتی ہیں بہت خوب، غلام مرتضیٰ علوی عرصہ بعد آپ رونق محفل ہیں۔

اک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے

امید ہے آئندہ شرکت باقاعدگی سے ہوگی۔ چوہدری یاسر وکی آپ کا تکیہ کلام یار یار میرے خیال میں آپ کو اچھا لگتا ہے، بہرحال……

یار یار کر دم دل من قرار نیست

عالم تمام گشتم مثل تو یار نیست

سلمان شبیر خط پڑھ کر خوشی ہوئی عمدہ تحریر ہوتی ہے ماشاء اللہ، ایم اے خالق بھٹی سچی کہانیاں میں آپ کی باقاعدہ شرکت قابل تحسین ہے تحریر پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے، کہانی خط پسند کرنے کا شکریہ ایم حسن نظامی آپ بھی سچی کہانیاں کے بے بدل اور الفاظ کی قلم کاری کے استاد ہیں خوبصورت تحریر کرنا آپ کا وصف اولیٰ ہے ماشاء اللہ، افضل شاہین سچی کہانیاں کے بارے میں صحیح کہا آپ نے، آپ کا کہا مبنی برحق ہے خط کہانی پسند آئے شکریہ میرے لیے بڑی سعادت ہے آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہوکر بھرا کرتی ہے پیمانہ

ام مناہل ناراض لگتی ہیں بہن، آپ کی تحریر کے تو ہم شیدائی ہیں طرز بیان، انداز تحریر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن آپ کا ادبی کھنچاؤ رنجیدہ کردیتا ہے سلامت رہیں۔ راکی ولسن، وعلیکم السلام، بہت شکریہ، ڈاکٹر طارق محمود، تحریر پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تحریر بھی لاجواب، بے مثل ہوتی ہے۔ ملک صفدر خوبصورت الفاظ میں تعریف کرنا اپنے موثر جذبات کا اظہار کرنا…… انسان دوستی اور علمی کاوش ہے آپ کا خط نہایت اثر انگیز ہے، فریدہ فری اللہ پاک آپ کو رحمت دو عالم ﷺ کے صدقے صحت یاب رکھے۔ حنا بشریٰ آپ کا مفصل اور بار آور خط پڑھ کر گھنٹوں ذہن سوچ و بچار کی جوار بھاٹا میں غوطہ زن رہتا ہے کہ الفاظ کی ترتیب، تشکیل استعمال کس خوبصورتی سے ادا ہوتی ہیں۔ میری کہانیاں خطوط کو پسندیدگی کی سند عطا کرتی ہیں جو میرا سرمایہ زیست ہے آباد رہیں۔ محسن علی طاب آپ کی ادبی کاوشیں لائق صد تحسین ہیں اسی طرح قلم کی جولانیاں قائم رکھیں۔ عبدالغفار عابد مفصل تحریر سے اگر قارئین کو دلچسپ و لطف آمیز مواد ملے تو یہ ان کے تحفہ خاص ہے ایسی تحریر زیر قلم کرنا عبدالغفار عابد کا اوج کمال ہے، بہت خوب، ایم یعقوب ہمدانی دیر آید درست آید سونزاں سائیں، طویل غیر حاضری سے دکھ درد کے دریچے وا ہوتے ہیں تھوڑا خیال کریں۔ باقی گزارش ہے کہ قارئین نے نوٹ کیا ہوگا کہ پچھلے کچھ عرصے سے پرچہ بام عروج کی منازل بخوبی طے کررہا ہے اگر مدیرہ اعلیٰ اور ادارے کی کاوشوں کا نتیجہ ہے تو لکھاریوں اور قارئین کی محنت شاقہ شامل حال ہے۔ سچی کہانیاں کے مصنف (ادباء) پیشہ ور نہ ہیں پھر بھی ان کی ادبی خدمات، لگن، جوش جنوں قابل فخر ہے ان رائٹرز میں ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، اعلیٰ تعلیم یافتہ ملیں جن کی تحریر کے سب معترف ہیں اگر ساحر لدھیانوی، احسان دانش، سعادت حسن منٹو، قراۃ العین حیدر، سجاد حیدر، جوش، فیض و دیگر کی نظم و نثر میں خدمات ہیں تو معاشرہ کے پسے ہوئے افراد کی خدمات و دلچسپیوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ادب کی حسین جبیں پر جھومر کی طرح منور و روشن ہیں۔ پیاری بہن گوادر کی دوسری قسط اگر اس ماہ اشاعت میں شامل ہوا ایران یاترا تو نوازش ہوگی اعجاز حسین پراچہ کی غزل کی اشاعت کے لیے استدعا ہے۔ اجازت دیں۔

☆شیرازی بھائی! مدیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پرچے کو اولاد کی طرح چاہے اور میرٹ کا قتل نہ کرتے۔

قیصر محمود، گجرانوالہ سے لکھتے ہیں۔ محترم منزہ سہام مرزا صاحبہ السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ خدا کے فضل سے خوشحال اور تندرست ہوں گی۔ میں نے آپ کا رسالہ سچی کہانیاں شمارہ مارچ 2020 پڑھ لیا ہے۔ تمام کہانیاں سبق آموز اور دلپسند ہیں بس اگر ہر کوئی میری طرح تربیت حاصل کرنے کے انداز سے سوچ سمجھ کر پڑھے سب سے زیادہ اعلیٰ اور موثر تحریر احوال ہے، جس میں آپ اپنے قارئین کی نصیحت کرتی یا تربیت کرنے کے انداز میں ہم کلام ہوتی ہیں مجھے آپ کی شائع کردہ تمام کہانیوں میں احوال اور آپ کے خطوط کے جوابات دینا بہت پسند ہے۔ آپ کا اپنے قارئین سے خطوط کے جواب دینے کا انداز بہت اعلیٰ اور موثر ہے۔ پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ صرف مجھ سے ہم کلام ہو کر مجھے نصیحت تربیت یا مجھ سے میری ذاتی زندگی کو گزارنے کے طریقے مجھے سمجھا رہی ہیں۔ میں آپ کو ایک اچھے ٹیچر کی حیثیت، استاد کے رتبے درجے کے انداز میں بہت پسند کرتا ہوں آپ کی ان تحریروں میں زندگی کو تاریکی سے نکال کر روشن راہ پر گامزن کرنے کے بہت سے

وسائل نظر آتے ہیں جس سے میں خود بہت استفادہ حاصل کرتا ہوں' آپ میری بہت اچھی استاد اور دوست ہیں۔ آخر میں میں آپ کے لیے دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ ترقی' خوشحالی اور کامیابی کی منازل طے کرنے کی توفیق دیتا رہے آمین۔

☆ قیصر! مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم ان کہانیوں کو بطور کہانی نہیں لیتے بلکہ مصنف کے تجربے سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہو ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم اپنے قاری کو ستی تفریح کے ساتھ ساتھ اچھا سبق بھی دے سکیں کیونکہ کتاب دوستی کامیاب معاشرے کی طرف پہلا قدم ہے۔

❁ فوزیہ فرید احمد' کراچی سے لکھتی ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحبہ السلام علیکم! میں اپنی تحریر کالاعلم کے عنوان سے بھیج رہی ہوں گزشتہ تحریروں کی طرح یہ بھی بالکل سچی تحریر ہے اور امید کرتی ہوں کہ جلد ہی شائع کر دی جائے گی آپ کا بے حد شکریہ۔

☆ ڈیئر فوزیہ' تمہاری تحریر مل گئی ہے انشاء اللہ پُراسرار نمبر 1 کا حصہ ہوگی۔

❁ نفیسہ سعید لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ ہمیشہ رہو اور یوں ہی کامیابی سے ترقی کی منازل طے کرتی رہو واٹس ایپ نے خط وکتابت کا سلسلہ تو تقریباً ختم ہی کر دیا ہے اور تم سے بھی ہمیشہ ہر بات واٹس ایپ پر ہی ہو جاتی ہے پھر بھی دل چاہا آج تمہیں دو لائن کا خط لکھ کر پرانا زمانے کی یاد تازہ کی جائے کہ میں خط وکتابت کے معاملے میں ویسے ہی کافی ست ہوں اردو بازار جانا نہیں ہوا اور اسکرپٹ پیپرز ختم ہو چکے ہیں یہاں کے بک اسٹالز پر ایک دستہ کی قیمت اتنی ہے جتنے اردو بازار سے میں تین یا چار لے آتی ہوں یہ ہی وجہ تھی کہ بیٹی نے اپنی نوٹ بک کی قربانی دی اور میں نے ان صفحات پر ہی مزاحیہ نمبر کے لیے کہانی لکھ کر بھیج دی ارادہ تو عید نمبر کے لیے بھی لکھنے کا ہے بس اللہ تعالیٰ ہمت اور وقت کی وسعت عطا فرمائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور لکھ کر بھیجوں گی امید ہے کہ جلدی میں لکھی گئی میری یہ تحریر بھی تمہیں ہمیشہ کی طرح پسند آئے گی ورنہ جو ایڈیٹنگ کرنا ہو کر کے قابل اشاعت بنا لینا۔

☆ اچھی نفیسہ! مجھے آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی وقت نکال کر اسی طرح دو لائنیں لکھ دیا کریں مان بڑھ جاتا ہے۔ آپ کی تحریر جلد شائع کروں گی مگر ایک فرمائش بھی ہے مزاح نمبر' سسپنس نمبر اور عشق نمبر کے لیے بھی کچھ مرحمت فرمائیں۔

❁ ایم اے خالق بھٹی' رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ باجی السلام علیکم! بہار کے خوشبو بکھیرتے موسم کی 12

تاریخ کو مابدولت کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اور اس ماہ جن ساتھیوں کی سالگرہ ہے سب کو اللہ تعالیٰ سلامت اور خوشیوں سے ہمکنار کرے آمین۔ ادارے کی طرف سے اعزازی شمارے کی رجسٹر ڈاک سے آمد اور میری تحریر 'سیٹھ محمد عبیدالرحمن مرحوم' کی اشاعت میری سالگرہ کا تحفہ تھی۔ اداریہ میں باجی نے قوم کی حالت کی صحیح عکاسی کی ہے میری نظر میں حکمرانوں کے بدلنے کے باوجود ہماری قوم کی حالت ہمیشہ خزاں رسیدہ ہی رہتی ہے۔ باجی اقراء جبار اپنی خراب صحت کے باوجود ہم سب کی محبت میں شریک محفل ہوئی ہیں شکریہ۔ عبدالغفار عابد اپنے نونہال برہان غفار کی پیدائش پر ہمیں مٹھائی کھلائیں یا نہ کھلائیں لیکن ادارہ والوں کا تو حق بنتا ہے، مبارکباد قبول فرمایئے اور اس مرتبہ سب تبصروں میں آپ کا تبصرہ کمال تھا۔ غلام مرتضیٰ علوی نے دیار غیر سے آئے ہوئے اپنے کزن عظمت اعوان صاحب کو سچی کہانیاں کے شمارے گفٹ کر کے ہم سب کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ چوہدری یاسر سروکی آپ کی ادارے کے ساتھ محبت ہمارے لیے ضرب المثل ہے۔ سلمان شبیر میاں ہمارے ملک کا تو آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے اپنا دل مت جلایئے۔ مور شاہد حسین محکمہ ڈاک کو چھوڑے یہ دیکھیے کہ آپ کا لیٹر کہاں کہاں کی سیر کر کے آپ تک پہنچا ہے۔ سسٹر اروشمہ خان جب سے باجی نے ادارے کو سنبھالا ہے ٹوکری بی نو دو گیارہ ہو گئی ہے۔ محترم ایم حسن نظامی صاحب آپ کا ادارے کی محبت میں گوندا ہوا لیٹر حقیقت پر مبنی تھا خوش رہیں۔ پرنس افضل شاہین جی باجی نے آپ کے لیٹر کا وقت درشن بھی بتا دیا ہے اب آپ ڈاک بابو کو مت کوسیے گا کیونکہ ایک سال والے دوست نے بھی صبر کر لیا ہے۔ راکی ولسن، حمیرا انجم، ثمر احمد، حافظہ مون بخاری اور شمیم حسنین اتنا ننھا منا لیٹر؟ ڈاکٹر طارق محمود آکاش آپ کے دعائیں دینے پر مجھے اصحاب قاف والی مووی میں دعائیں دینے کا دلنشین منظر آنکھوں کے سامنے

گھومنے لگا ہے شکریہ۔ ملازم حسین شیرازی صاحب شمارے پر بہت اعلیٰ تبصرہ کیا ہے ویلڈن سر۔ ملک صفدر خان آپ نے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر خط لکھا ہے باجی منزہ صاحبہ کا کسی ایڈیٹر اور رائٹر سے جلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا باجی ملازم نہیں بلکہ ملک ہیں انہوں نے ہر فیصلہ بہتری کی طرف کرنا ہے کیونکہ ان کا سرمایہ لگا ہوا ہے ویسے بھی اب ماضی قصہ پارینہ بن چکا ہے راقم بھی 2000ء سے وابستہ ہے، ابھی باجی شمارے کو سابقہ منزل پر لانے کے لیے انتھک محنت کر رہی ہیں انشاء اللہ جلد ایوارڈ کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا یہ باجی کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے غلط اندازوں پر مشتمل لیٹر بھی شائع کر دیا ہے، بس اپنا دل صاف کر لیں۔ باجی فریدہ فری صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت عطا کرے یہ آپ کی ہم سب سے محبت ہے کہ آپ چلی آئی ہیں۔ سسٹر حنا بشریٰ غلط فہمی کی کسک بہت ہی پریشان کن ہوتی ہے خوش رہیے۔ محسن علی طاب آپ نے ماضی میں میل رائٹر کی فی میل کے نام سے لکھنے کے حوالے سے اچھی معلومات دی ہیں بہت اعلیٰ بھائی۔ ایم یعقوب احمدانی آپ کا یہ فقرہ بہت اچھا لگا سیاستدان اور چوہوں میں اب کوئی فرق نہیں۔ مہر پرویز احمد دولو' وہی اول وہی آخر' بہت اعلیٰ پائے کی تحریر تھی۔ باجی منزہ سہام مرزا کی 'خوشی کے لمحے' پڑھنا شروع کی ادھر کڑکتی بجلی کی آواز میں بارش کی جھڑی لگ گئی اور کہانی کے اختتام پر بارش بھی بھاگ دوڑ گئی معلوم نہیں بارش اور کہانی میں کیا رشتہ داری تھی باجی بتایئے گا اور آمنہ کی مشکل ڈاہر آملہ ہیر آئل نے حل کر دی۔ سینئر رائٹر ملازم حسین شیرازی 'عبرت کا نشان' میں موبائل فون کی خرابیوں اور انسانی ہمدردی میں دی ہوئی ضمانت کا نتیجہ دیکھ لیا لہٰذا نوجوان لڑکیوں کو چاہیے کہ موبائل کو صرف تفریح کے لیے استعمال کریں لیکن کسی کے سہانے خواب دکھانے پر اپنوں کو چھوڑ کر ہرگز نہ جائیں ورنہ انجام کار اس کہانی سے ظاہر ہے۔ میمونہ صدف نے 'مائی جیونی' کا قصہ لکھا ہے جو اپنے خاندان کو بھیک سے بچا کر ایک اچھی روایت قائم کی ہے۔ حنا بشریٰ 'بیٹا جی' اور بشریٰ خان' سوال' کے نام سے سبق آموز تحریریں لائی ہیں گڈ۔ ایم حسن نظامی کی 'سفارش' میں صاحبہ جیسی خوش بخت اور احسن جیسے بدنصیب کی کہانی لکھی ہے جو ہمارے معاشرے کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اروشمہ خان 'خواب ریت کے گھروندے' میں عنبر کی زندگی کے نشیب وفراز کو اچھے الفاظوں سے سنوارا ہے۔ نازیہ بتول رضا 'حسرتوں کا جنازہ' ضد بھی کیسے کیسے غلط فیصلے کراتی ہے۔ مجید احمد جائی نے راکی ولسن کی شعری پر مشتمل تصنیف مینار محبت کا شہزادہ کا بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ محسن علی طاب نے کہانی نویس عاطر شاہین کا بہترین تعارف کرایا ہے۔ باقی تحریروں کا مطالعہ جاری ہے۔

☆ سچ کہا آپ نے خالق بھٹی صاحب ردی کی ٹوکری نو دو گیارہ ہو گئی ہے میں نئے لکھنے والوں سے بھی یہی کہتی ہوں کہ ایک بار میں آپ کی کہانی اگر ضرورت پڑی تو ری رائٹ بھی کر دوں گی مگر پھر سمجھ جائیں کہ کیسے لکھنا ہے۔

❁ حافظہ مون شاہ' سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ پیاری آپی منزہ سہام السلام علیکم! آپی جان سرورق کے رنگ پھیکے سے لگ رہے تھے۔ پلیز سرورق پر توجہ دیں۔ آپ کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ حکمران کے ساتھ عوام بھی خاصی حد تک کرپٹ ہے۔ مگر اپنے گریبان میں جھانکنے کا ہنر ہمیں آتا کہاں ہے بزم احوال خوب سجی تھی۔ اقرا جبار صاحبہ کی بات پر حیرانی ہوئی کہ طبیعت مطالعہ کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ بھئی ہم تو سچی کہانیاں موصول ہوتے ہی باقی زیر مطالعہ مواد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ نصابی کتابوں کو بھی؟ اس مرتبہ احوال میں میرے پیارے بھائی جو بین الاقوامی ثناء خواں ہیں اور مجھے اُن پر فخر ہے یعنی قاری محمد عثمان غنی قادری ان کی شرکت نے بھرپور مسرت سے ہمکنار کیا۔ بھائی ہم کو رسالے پڑھنے اور لکھنے سے منع کرتے کرتے آپ بھی آخر مان ہی گئے کہ سچی کہانیاں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کیوں ٹھیک کہا ناں؟ خوش آمدید' ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنی انتہاؤں کو چھوتی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر آئندہ بھی سچی کہانیاں کی ٹیم کا حصہ بنتے رہیں گے۔ محترم ایم حسن نظامی نے بہترین تبصرہ کیا۔ مور شاہد حسین نے تحاریر کی کچھ غلطیوں یا تضاد کی اچھی نشاندہی کر ڈالی۔ پرنس افضل شاہین کی تمام باتوں سے میں متفق ہوں۔ محترم ملازم حسین شیرازی ہم یہیں ہیں بس آپ کی دعاؤں کے طالب ہیں۔ عاطر شاہین کا انٹرویو اور مینار محبت کا شہزادہ مطلب راکی ولسن کی کتاب کا تعارف اچھا لگا۔ عمران سیریز کی تو میں بھی دلدادہ ہوں۔ مونا شہزاد کی کوہ کن کا موضوع بہت اچھا تھا۔ دین کے دشمن پڑھ کر بے ساختہ کہا کہ وطن میرا حوالہ ہے وادی لہورنگ نے آنکھیں نم کر دیں سوال بھی اچھا اٹھایا گیا

پیام بھی موثر دیا گیا۔ غلطی کا احساس کاش سب ہی کر لیں گڈ خواب ریت ہونے کے لیے ہی تو ہوتے ہیں خوب ریت ہوئے افسوس محترمہ نزہت جبیں ضیاء کی گرداب مختصر مگر موثر تھی۔ کہانی کو تھوڑا لمبا ہونا چاہیے ویسے...... سفارش میں لڑکی نے اتنی بڑی قربانی دے ڈالی۔ مخلص تھی اس لیے' مگر ہیرو نے قدر ہی نہ کی۔ مجھے اچھا نہیں لگا لڑکے کا اسے بے وفا کہنا یہ تو وطیرہ ہے دنیا کا وہ قربانیوں کو تسلیم کرتی بھی کہاں ہے؟ بہر حال اچھی تحریر تھی۔ ایم اے خالق بھٹی کی یادداشتیں قابل قدر تھیں ملکہ زبیدہ سے کون واقف نہیں پُر لطف تاریخی تحریر' اور اس شمارے کی سب سے اعلیٰ و انمول تحریر وو کا پرستار ٹھہری۔ اس کے بعد مائی جیونی کی لفاظی کو دل نے سراہا۔ بیٹا جی اور بختاں نہایت سبق آموز حضرت انسان کی منافقت کے راز کھول رہی تھی۔ ساون کے دکھ دل میں اترے ہوئے لگے۔ وہی اول وہی آخر سبحان اللہ لاریب' جزاک اللہ' خوشی کے لمحے ہمیں بھی خوش کر گئے۔ ڈابر آملہ کے کمال تو کمال تک پہنچ گئے۔ پیاری آپی کے قلم کی بدولت' محترم ملازم حسین شیرازی کے قلم نے خوب رنگ جمایا کاش کچے ذہنوں تک رسائی ہو جائے۔ صبغہ احم نے پہلی بار میں اچھا لکھا۔ جیجل میتلو کا نام ہی کافی ہے۔ حسرتوں کا جنازہ بس ٹھیک تھی خاندانی وقار یعنی کہ ناک کا مسئلہ جی خوب ہے رباط پر تبصرہ محفوظ ہے۔ آپی میرے خیال میں ابار میں نے ہر تحریر پر تبصرہ کر دیا ہے اگر میری رائے اتنی اہم ہے تو پھر ہر بار تمام تحاریر پر تبصرہ ہوگا ویسے تو پہلے بھی ہوتا ہے۔ بس پچھلی بار جلدی میں سمیٹا معذرت' اپنے دیگر مضامین کی اشاعت کے لیے منتظر ہوں۔ کافی مواد یقیناً آپ کے پاس محفوظ ہے اپنا خیال رکھیے گا سب احباب کو دعائیں اور نیک تمنائیں قبول ہوں۔

☆ مون! مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس بار کا ٹائٹل پسند آیا ہوگا۔

✍ قاری محمد عثمان غنی' سرائے عالمگیر سے لکھتے ہیں۔ آپ نے مجھے عزت کے قابل گردانا میں ممنون ہوں جزاک اللہ' میں دراصل ذاتی نعت اسٹوڈیو حضرت حسانؓ بن ثابت کی نسبت سے (H.D.S) کا مالک ہوں نیز ثناء خوانی کی مصروفیات کے سلسلے میں اندرون بیرون ملک آنا جانا لگا رہتا ہے تو وقت کی قلت کی وجہ سے کافی چیزوں پر مکمل توجہ دینا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسالے کا مطالعہ جامع طور سے نہیں کر سکتا۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ ہر ماہ شرکت کو یقینی بنا سکوں اور جتنا مطالعہ ممکن ہو سکے اس پر رائے دے سکوں۔ امید ہے آپ میری مجبوری کو سمجھ پائیں گی بر سبیل تذکرہ یہاں مون سے کہوں گا وہ بھی میری مجبوریوں سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود ناراض مت ہوا کرے۔ میری اچھی بہن اب شمارے کی بات ہو جائے میں چونکہ طبعاً زیادہ جھکاؤ مذہب کی طرف رکھتا ہوں تو اس لیے شمارے میں موجود اسلامی مضامین کو ترجیحاً پڑھا۔ منورہ نوری خلیق صاحبہ کی وو کا پرستار شاندار تحریر تھی۔ وہی اول وہی آخر ماشاء اللہ عقیدتوں کا بھرپور اظہار تھا۔ تاہم حضور سرور کائنات ﷺ کی توصیف مکمل طور سے بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جذبہ حب الوطنی پر مبنی عالی مان آفاقی اور دیگر مصنفوں کی تحاریر بھی کمال تھیں۔ آپ کی تحریر خوشی کے لمحے' نظر سے گزری۔ یوں تو کافی لکھاریوں کو میں نے پہلی بار پڑھا ہے مگر آپ کو قطعاً پہلی بار پڑھا۔ مجھے اشتیاق تھا آپ کیسا لکھتی ہوں۔ اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوا بے حد روانی سے آپ کا قلم انصاف کرتا ہے کہانی کے کرداروں کے ساتھ تاہم خوشی کے لمحے میں صنفِ نازک کی کمزوری کو اجاگر کیا گیا کہ کیسے وہ جذباتی ہوتی ہیں اور یہی بات ہے میرا چونکہ رجحان کم ہے اسی لیے کسی منفرد معاشرتی موضوع پر آپ کے قلم سے نکلی جادو سیاہی کا منتظر رہوں گا۔ البتہ آپ کے اداریے حالات حاضرہ سے مکمل باخبری کا ثبوت دیتے ہیں۔ میری بہن مون ہمیشہ آپ کے اداریوں کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتی ہے جو کہ حقیقت ہے۔ عبرت کا نشان کہانی پڑھی اور فکر میں اضافہ ہوا۔ بہت حساس موضوع تھا۔ وقتاً فوقتاً ایسی اصلاحی کہانیاں شامل ہونا چاہئیں۔ شاید نئی نسل اپنی سمت کو درست کر ہی لے۔ بہن حنا بشریٰ صاحبہ کی تحریر بیٹا جی بھی مخصوص مرد کے تخریب کار خیالات کو ظاہر کر رہی تھی۔ صبغہ ارحم بہنا کی کاوش بس ٹھیک لگی۔ آخر میں آپ کو دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ میرے قریبی احباب اور جاننے والے حیران ہیں کہ مجھے رسالوں میں لکھنے کا وقت کیسے مل جاتا ہے؟ نیز یہ شوق کہاں سے لاحق ہو گیا' میں یہ سب باتیں سن کر مسکراتا ہوں اور صرف یہ کہتا ہوں سچی کہانیاں عام جرائد سے ہٹ کر صاف ستھرا ادب پیش کر رہا ہے اور اس میں کوئی فحاشی و بے باکی کا عنصر نہیں ہے' اس لیے مجھے یہ شوق ہوا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

سچی کہانیاں ملنے میں اگر دشواری ہے تو ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

کراچی ایجنٹ	0300-2680248	
لاہور ایجنٹ	042-37249813	0300-4009578
راولپنڈی	051-5765665	0345-5058891
ملتان	061-4586533	0300-6301461
حیدر آباد	022-2780128	0321-3060477
پشاور	091-2212515	0344-9290185
فیصل آباد	0300-6698022	041-8503629
نواب شاہ	0244-362138	0344-3445464
الفتح نیوز ایجنسی، سکھر	0300-9313528	071-5613548

نمائندہ خصوصی

جاوید راہی	0300-9479844	اوکاڑہ
ارشد اقبال چوہان	0300-9657926	فیصل آباد/جڑانوالہ
عبدالغفار عابد	0300-4319264	چیچہ وطنی/ساہیوال
مور شاہد	0301-2868143	قمبر/شہداد کوٹ
مجید احمد جائی	0301-7472712	ملتان
چوہدری یاسر وکی	0303-3334464	دیپالپور

☆ قاری صاحب! مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو میری تحریر اچھی لگی اور اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی کہ آپ کو سچی کہانیاں نے مایوس نہیں کیا۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اسی طرح صاف ستھرا ادب اپنے پڑھنے والوں کو مہیا کرتے ہیں۔

شہزادانور‘ نوشہرو فیروز سے لکھتے ہیں‘ محترمہ مدیرہ صاحبہ السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ عرصہ دراز سے سچی کہانیاں کا قاری ہوں میری پسندیدہ ڈائجسٹ ہے اور بہت شوق سے مطالعہ کرتا ہوں کچھ لکھنے کی طرف بھی مائل ہوں۔ تازہ شمارے میں پُراسرار کہانیاں نمبر کا پڑھا تو رہ نہ سکا اور اپنی ایک پُراسرار کہانی جنی آپ کو ای میل کر دی ہے اس کی ہارڈ کاپی بھی ارسال خدمت ہے۔ آپ کو اطمینان ہو کہ یہ پہلے کہیں نہیں چھپی امید ہے کہ غور ضرور فرمائیں گے۔ نہایت احسان مندر ہوں گا۔

☆ شہزاد! آپ کی تحریر مل گئی ہے اور پُراسرار نمبر کے لیے سنبھال بھی لی ہے۔ امید کرتی ہوں اب پابندی سے احوال میں شرکت کیا کریں گے۔

طیبہ صدف لکھتی ہیں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ میرا نام طیبہ صدف ہے اپنی دوست شبانہ کے ریفرنس سے میں یہ کہانی بھیج رہی ہوں امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔ میرا تعارف یہ ہے کہ میں شادی سے پہلے کہانیاں لکھا کرتی تھی مگر پھر شادی کے بعد میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ میں نے ایم اے انگلش کیا ہوا ہے پنجاب یونیورسٹی سے اور بی اے میں‘ میں نے اردو ادب رکھا تھا۔ یہ چونکہ سچی کہانی ہے تو امید کرتی ہوں آپ اسے ضرور جگہ دیں گی اپنے رسالے میں۔ میری دوست شبانہ چونکہ جانتی ہے کہ میں تھوڑا بہت لکھ سکتی ہوں تو اس نے مجھے زور دیا تا کہ میں مصروف ہو جاؤں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ میری کہانی ضرور چھاپیے گا۔ انٹرنیٹ بہت زیادہ عام ہو جانے کی وجہ سے میں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا جبکہ مجھے اپنی پوئٹری کی کتاب بھی چھپوانی تھی میں تھوڑا بہت شاعری کا بھی شغف رکھتی ہوں۔ میرا انتخاب میں بھی ایک دفعہ میں لکھ چکی ہوں۔ رسالہ خود خرید کر دیکھوں گی کہ میں کیا لکھ کر دوں شمارے کے لیے اور اگر فون پر بات ہوئی تو آپ مجھے گائیڈ کیجیے گا۔ کوشش کی ہے کہ انگلش کے لفظ کہانی میں استعمال نہ کروں اور بہت کوشش کر کے کہانی کو مختصر کر کے لکھا ہے۔ کیونکہ میں پہلی بار آپ کے رسالے میں لکھ رہی ہوں تو مجھے ڈر تھا کہ کہیں لمبا ہونے کی وجہ سے رد نہ ہو جائے آپ کی نوازش کی منتظر۔

☆ طیبہ! آپ کی تحریر موصول ہو گئی ہے پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

اقراء جبار‘ چیچہ وطنی سے لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم! منزہ آپی اس بار مارچ کا شمارہ ہاتھ میں پیاری بجی سجائی ماڈل کو دیکھ کے اچھا لگا پھر سب سے پہلے میں لسٹ چیک کی اور بس پھر میری خوشی کی انتہا نہ رہی دل خوشی سے چھلانگیں مارنے لگا اپنی اسٹوری دیکھ کے بہت شکریہ‘ منزہ آپی اور سچی کہانیاں ریڈرز اینڈ رائٹرز مجھے انتظار رہے گا آپ سب کی رائے کا کیسی لگی آپ سب کو میری کہانی باقی اس بار بہت سارے جانے پہچانے نام دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ پیاری بہن نازیہ بتول رضا کی کہانی حسرتوں کے جنازے‘ نسیم سکینہ صدف کی کہانی ساون کے دکھ پیاری فوزیہ احسان کی کہانی بختاں‘ ملازم حسین شیرازی کی عبرت کا نشان‘ سر کاوش کی سلسلہ وار کہانی رباط‘ عالی مان آفاقی بھائی کی کہانی دین کے دشمن بہت اچھی کہانیاں تھیں‘ نزہت جبیں آپی میں آپ کی فین ہوں آپ ماشاء اللہ ہماری سینئر لکھاری ہیں آپ کی کہانی گرداب زبردست تھی اللہ آپ کو صحت تندرستی دے آپا آمین‘ باقی سلسلے بھی بہترین تھے۔ غلام مرتضیٰ علوی‘ سلمان شبیر‘ مور شاہد‘ ایم اے خالق‘ حسن نظامی‘ پرنس افضل‘ ام مناہل‘ ڈاکٹر طارق‘ ملازم حسین شیرازی‘ حمیرا وحید حنا بشریٰ‘ محسن طاب‘ عبدالغفار کے خط اچھے تھے۔

☆ اقراء! اسی طرح تم خوش رہو‘ میری کوشش ہوتی ہے کہ سب کو شمارے میں شرکت کا موقع دوں اور تم تو ہمیشہ وقت پر حاضری لگواتی ہو۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے متعلق کوئی بھی بات ہو بلا جھجک مجھ سے کہیے۔ میں منتظر رہوں گی۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام مرزا

سوال نامہ برائے رائٹر/ ریڈرز

☆......آج کل زندگی کیا کہہ رہی ہے؟

☆...... ماضی کے جھروکوں کو وا کرنے پر کیسا محسوس کرتی ہیں/ کرتے ہیں؟

☆......لکھنے کا آغاز کب کیا اور کیا مطمئن ہیں آج کل جو چھپ رہا ہے اُس سے؟

☆......تبدیلی پر یقین رکھتی ہیں/ رکھتے ہیں؟

☆......کون سے ایسے رویے ہیں جو دکھ دیتے ہیں؟

☆......سردیوں کی بارش سے خوشی محسوس ہوتی ہے یا یاد کے جگنو آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں؟

☆......فلموں سے دلچسپی ہے؟ کیسی فلمیں پسند ہیں؟

☆......کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں، زندگی سے کیا سیکھا؟

☆...... سچی کہانیاں/ دوشیزہ کا ساتھ کیسا پایا؟

جنابِ آسیہ زوجہ فرعون

فرعون نے جناب آسیہ سے مقابلہ کی ٹھان لی، غضبناک ہوا، اس کے غضب کی آگ بھڑک اٹھی، لیکن آسیہ کی ثابت قدمی کے مقابلہ میں ہار گیا، اس نے آسیہ کو شکنجہ دینے کا حکم دیا اور اس عظیم خاتون کے ہاتھ پیر کو باندھ دیا

تہمینہ عمیر

پڑھا دیا سبق صنف نازک کو مصر کی شہزادی نے
جو ہو قلب ایمانی تو فرعون بھی ریزہ ریزہ ہے

خالق کائنات نے پہلے انسان کو حضرت آدم علیہ السلام کی شکل میں پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت حوا کو تخلیق کیا۔ یہ دونوں ایک تخلیق ہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے مذکر تخلیق کیا اور اسی سے اس کی مونث کو پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا تذکرہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ قرآن پاک میں کئی پاک باز پارسا اور قوت ایمانی رکھنے والی خواتین کا ذکر ہوا ہے۔

انہیں میں سے ایک اللہ کی محبت میں درجہ کمال رکھنی والی خاتون حضرت آسیہ علیہ السلام ہیں۔

اور خدا نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی زوجہ کی مثال بیان کی کہ اس نے دعا کی کہ پروردگار میرے لیے جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے درباریوں سے نجات دلا دے اور اس پوری ظالم قوم سے نجات عطا فرمادے۔

(قرآن، سورۃ تحریم آیت 11)

آسیہ بنت مزاحم مصر کے بادشاہ فرعون کی بیوی تھیں۔ مشہور قول کے مطابق حضرتِ آسیہ بادشاہِ مصر ریان بن وَلید کی اولاد میں سے تھیں۔ آپ کا نسب کچھ یوں ہے۔ آسیہ بنتِ مُزاحم بن عُبید بن رَیّان بن وَلید۔ یہ رّان بن وَلِید وہی ہیں جو حضرتِ سیّدنا یُوسُف علیہ السّلام کے زمانے میں بادشاہِ مصر تھے اور آپ علیہ السّلام پر ایمان لے آئے تھے۔

حضرتِ آسیہ مصر کے انتہائی ظالم و جابر بادشاہ فرعون کی بیوی تھیں۔

بادشاہِ وقت کی بیوی ہونے کے سبب آپ کے پاس مال و دولت کی کثرت تھی لیکن اس کے باوجود آپ غرور و تکبر کا شکار نہیں تھیں بلکہ آپ کا دل غریبوں کی محبت سے سرشار اور ان پر شفقت و مہربانی کے جذبے سے معمور تھا، آپ دل کھول کر ان پر صدقہ وخیرات کیا کرتیں اور اسی وجہ سے آپ کو اُمّ

ال مَسَاکِین (یعنی مسکینوں کی ماں/ پناہ گاہ) کہا گیا۔

آسیہ، فرعون کی زوجہ تھی، وہ فرعون جس میں غرور وتکبر کا نشہ بھرا تھا، جس کا نفس شریر تھا اور جس کے عقائد اور اعمال باطل وفاسد تھے۔

قرآن مجید نے فرعون کو متکبر، ظالم، ستم گر اور خون بہانے والے کے عنوان سے یاد کیا ہے اور اس کو ''طاغوت'' کا نام دیا ہے۔

آسیہ، فرعون کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی، اور فرعونی حکومت کی ملکہ تھی، تمام چیزیں ان کے اختیار میں تھیں۔

وہ بھی اپنے شوہر کی طرح فرمانروائی کرتی تھی اور اپنی مرضی کے مطابق ملکی خزانہ سے فائدہ اٹھاتی تھی۔

ایسے شوہر کے ساتھ زندگی، ایسی حکومت کے ساتھ ایسے دربار کے اندر، اس قدر مال و دولت، اطاعت گزار غلام اور کنیزوں کے ساتھ میں اس کی ایک بہترین زندگی تھی۔

فرعون کہ دربار میں ایک نجومی نے بتایا کہ فرعون کی قوم میں سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کا تختہ الٹ دے گا چنانچہ فرعون نے یہ ظالمانہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو وہ قتل کردیا جائے اسی دوران حضرت موسیٰؑ علیہ سلام پیدا ہوئے آپ کی والدہ نے ان کو تین ماہ تک چھپا کر رکھا مگر جان کا خطرہ محسوس ہوا تو اللہ کہ حکم سے دریائے نیل میں صندوق میں بند کر کہ چھوڑ دیا یہ صندوق بہتا ہوا فرعون کہ دربار تک پہنچا جب فرعون اور حضرت آسیہ نے اتنا خوبصورت بچہ دیکھا تو حضرت آسیہ نے فرعون سے منت سماجت کی کہ اس کو قتل نہ کیا جائے یونہہ اللہ نے اپنی قدرت سے حضرت آسیہ کہ ذریعے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کروائی۔

اس کا ذکر قرآن کریم میں یونہہ ہوا ہے کہ.....

''اور فرعون کی بی بی نے کہا یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ بے خبر تھے۔''

حضرت موسیٰؑ حضرت آسیہ کی سرپرستی میں رہے پھر ایک وقت آیا جب انہوں نے اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔

حضرت آسیہ کہ لیے بے شمار احادیث اور واقعات ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ اپ کس قدر پاک صفت اور صالحہ خاتون تھیں جن کو بیشمار فضیلتیں عطا کی گئیں۔

''جنتی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم، اور مریم بنت عمران رضی اللہ تعالی عنھن اجمعین ہیں مسند احمد حدث۔''

ایک جوان اور قدرتمند خاتون نے اس ماحول میں پیغمبر الہی جناب موسی بن عمران کے ذریعہ الہی پیغام سنا، اس نے اپنے شوہر کے طور طریقے اور اعمال کے باطل ہونے کو سمجھ لیا، چنانچہ نور حقیقت اس کے دل میں چمک اٹھا۔

حالانکہ اس کو معلوم تھا کہ ایمان لانے کی وجہ سے اس کی تمام خوشیاں اور مقام ومنصب چھن سکتا ہے یہاں تک کہ جان بھی جاسکتی ہے، لیکن آپ نے حق کو قبول کرلیا اور وہ خداوند مہربان پر ایمان لے آئیں اور اپنے گزشتہ اعمال سے توبہ کرلی اور نیک اعمال کے ذریعہ اپنی آخرت کو آباد کرنے کی فکر میں لگ گئیں۔

ان کا توبہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس کی وجہ سے اسے اپنا تمام مال و دولت اور منصب ترک کرنا پڑا، اور فرعون وفرعونیوں کی ملامت ضرب وشتم کو برداشت کرنا پڑا، لیکن پھر بھی وہ توبہ، ایمان، عمل صالح اور ہدایت کی طرف قدم آگے بڑھاتی رہیں۔

جناب آسیہ کی توبہ ،فرعون اور اس کے درباریوں کو ناگوار گزری، کیونکہ پورے شہر میں اس بات کی شہرت ہوگئی کہ فرعون کی بیوی اور ملکہ نے فرعونی طور طریقہ کو ٹھکراتے ہوئے مذہب کلیم اللہ کو منتخب کرلیا ہے، سمجھا بجھا کر، ترغیب دلا کر اور ڈرا دھمکا کر بھی آسیہ کے بڑھتے قدم کو نہیں روکا جاسکتا تھا، وہ اپنے دل کی آنکھوں سے حق کو دیکھ کر قبول کرچکی تھی، آپ نے باطل کے کھوکھلے پن کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا، لہٰذا حق وحقیقت تک پہنچنے کے بعد اس کو ہاتھ سے نہیں کھوسکتی تھیں اور کھوکھلے باطل کی طرف نہیں لوٹ سکتی تھیں۔

جی ہاں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا کو فرعون سے، حق کو باطل سے، نور کو ظلمت سے، صحیح کو غلط سے، آخرت کو دنیا سے، بہشت کو دوزخ سے، اور سعادت کو بدبختی سے بدل لے۔

جناب آسیہ نے اپنے ایمان، توبہ و استغفار پر استقامت کی، جبکہ فرعون دوبارہ باطل کی طرف لوٹانے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔

فرعون نے جناب آسیہ سے مقابلہ کی ٹھان لی، غضبناک ہوا، اس کے غضب کی آگ بھڑک اٹھی، لیکن آسیہ کی ثابت قدمی کے مقابلہ میں ہار گیا، اس نے آسیہ کو شکنجہ دینے کا حکم دیا اور اس عظیم خاتون کے ہاتھ پیر کو باندھ دیا، اور سخت سے سخت سزا دینے کا حکم دے دیا، لیکن جناب آسیہ نے دنیا و آخرت کی سعادت وخوش بختی حاصل کرنے کے لیے صبر کیا اور ان تمام سخت حالات میں خدا سے لو لگائے رکھی۔

جب فرعون نے آپ کو ایمان سے پھیرنے کی تمام تدبیریں کرلیں اور اسے ناکامی کا سامنا ہوا تو اس نے آپ کو شہید کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شہادت سے پہلے آپ نے بارگاہِ الٰہی میں جو اِلتجا کی اسے قرآنِ پاک میں یوں بیان فرمایا گیا۔

”اے میرے ربّ میرے لیے اپنے پاس جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے کام سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات بخش۔(پ28، التحرم:11)

آپ کی شہادت کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ فرعون نے اپنے کارندوں سے کہا۔ ایک بڑی چٹان لاؤ، اگر چٹان دیکھ کر بھی یہ ایمان پر قائم رہتی ہے تو چٹان اس پر گرادو اور اگر ایمان سے پھر جاتی ہے تو یہ میری بیوی ہے اسے مت مارنا۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے چٹان لائی گئی تو آسمان کی طرف آپ کو اپنا جنتی محل نظر آیا جس سے آپ کے عزم و اِستقلال میں اور بھی اضافہ ہوگیا اور اسی حالت میں آپ کی روح پرواز کرگئی، اس کے بعد جب آپ پر چٹان گرائی گئی تو وہ ایسے بدن پر گری جس میں روح نہیں تھی آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا کا مزارِ مبارک مصر میں واقع ہے۔

جناب آسیہ کی حقیقی توبہ، ایمان و جہاد، صبر و استقامت، یقین اور مستحکم عزم کی وجہ سے قرآن مجید نے ان کو قیامت تک مومن و مومنات کے لیے نمونہ کے طور پر پہنچوایا ہے، تاکہ ہر زمانہ کے گناہگار کے لیے عذر و بہانہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور کوئی یہ نہ کہہ دے کہ توبہ، ایمان اور عمل صالح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

توبہ، ایمان، صبر اور استقامت کی بنا پر اس عظیم الشان خاتون کا مرتبہ اس بلندی پر پہنچا ہوا تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا۔

”جنت چار عورتوں کی مشتاق ہے، مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون، خدیجہ بنت خویلد دنیا و آخرت میں ہمسر پیغمبر، اور فاطمہ بنت محمد۔“

□□.....❀.....□□

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہوجایئے۔
یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......
خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......
اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔
اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان واقعات وحادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔
نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔
تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔
ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔
تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:
II 88-C ۔خیابانِ جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی
ای میل :pearlpublications@hotmail.com

حضرت پیر سید مہر علی شاہ رحؒ

منزل عشق جہاں تاب کے راہی بن کر
ہم انا الحق کی صدا پھر سے اٹھائے نکلے

ایم حسن نظامی

آپ کی پیدائش یکم رمضان المبارک 1275ھ بمطابق 14 اپریل 1859ء کو راولپنڈی سے گیارہ میل دور گولڑہ نامی بستی میں ہوئی۔

شجرہ نسب:

پیر سید مہر علی شاہ صاحب کا شجرہ نسب پچیس واسطوں سے حضرت غوث الاعظم اور چھتیس واسطوں سے حضرت سیدنا امام حسنؓ سے جاملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم:

آپ کو قرآن کریم پڑھنے کے لیے خانقاہ کے درس میں اور اردو فارسی کے لیے مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ حافظہ کی یہ حالت تھی کہ قرآن مجید کا روزانہ سبق آپ حفظ کر کے سنادیا کرتے تھے۔ جب آپ نے قرآن مجید ختم کیا تو اس وقت سارا قرآن پاک آپ کو بلاارادہ حفظ ہو چکا تھا۔

آپ نے عربی فارسی اور صرف ونحو کی تعلیم مولوی غلام محی الدین سے حاصل کی جنہوں نے آپ کو کافیہ تک تعلیم دی۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب نے آپ کو کتاب 'قطر النداء کے ایک ایسے حصے کی عبارت یاد کرنے کی ہدایت کی جو کرم خوردہ (کتاب کو کیڑا لگنے سے) ہونے کی وجہ سے پڑھی نہیں جاسکتی تھی۔ جب آپ نے عذر کیا کہ جو مضمون کتاب میں موجود ہی نہیں اسے کیسے یاد کیا جاسکتا ہے تو مولوی صاحب نے غالباً آپ سے ماورزادولی ہونے کی شہرت کی تصدیق کی غرض سے کہا کہ میں نہیں جانتا اگر کل یہ عبارت یاد نہ ہوئی تو سزا ملے گی۔

پیر صاحب فرماتے ہیں کہ میں آبادی سے باہر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے کتاب کے کرم خوردہ حصہ کو سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر میں نے دعا کی۔

''یا اللہ تجھے تو معلوم ہے کہ یہ عبارت کیا ہے اگر تو مجھے بتا دے تو میں استاد کی سزا سے بچ جاؤں گا۔''

یہ کہنا تھا کہ اچانک درخت کے پتوں میں سبزی مائل ایک عبارت نمودار ہوئی جسے میں نے حفظ کرلیا تو وہ غائب ہوگئی۔ میں نے اسی وقت جا کر وہ

استاد صاحب کو سنادی۔ انہوں نے کچھ شبہ کا تو میں نے کچھ افشا کیے بغیر کہا کہ مجھے اس ہونے میں اس قدر یقین ہے کہ اگر اس کا مصنف بھی قبر سے نکل کر آجائے اور کہے ہے تو میں نہ مانوں گا۔ چنانچہ استاد صاحب صحت کے لیے اسی روز راولپنڈی گئے اور ایک سے میری بتائی ہوئی عبارت کو درست پا کر اور بصد حیرانی اس کی صحت کا اعتراف کیا۔ (44)

گولڑہ شریف میں مولوی غلام محی الدین سے نحو پڑھنے کے بعد آپ موضع (حسن ابدال) چلے گئے جہاں مولانا محمد شفیع کے درس میں شامل ہوگئے۔ بھوئی کے درس آپ نے ڈھائی سال میں رسائل میں منطق نحو اور اصول کے درمیانہ اسباق پڑھے۔ اس کے بعد آپ انگر (ضلع سرگودھا) میں سلطان محمود صاحب کی خدمت میں حاضر اور ان سے شرح ہدایت الحکمۃ از مصنف الدین شیرازی پڑھی۔ تقریباً ڈھائی سال انگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ گولڑہ شریف تو درس نظامی سے صرف فلسفہ، معقول، ریاضی کی آخری کتب اور حدیث شریف میں صحاح تفسیر میں بیضاوی وغیرہ باقی رہ گئی تھیں۔ ان کی تعلیم کے لیے ان دنوں عام طور پر طلبا ان کے مدارس کا رخ کرتے تھے آپ نے تعلیم کے لیے ایک روز سکندر نامہ سے فال لی فرملا۔

ملک ایراں مراشد تمام
ہندوستان داد خواہم لگام

چنانچہ 1290ھ میں پندرہ برس کی عمر میں آپ ان روانہ ہوگئے۔ حضرت مولانا لطف اللہ کے پاس علی گڑھ پہنچے اور ان کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے تقریباً اڑھائی برس آپ علی گڑھ میں رہے وہاں سے فارغ ہو کر سہارنپور آئے اور مولانا احمد علی محدث کے درس میں شریک ہوگئے۔

مولانا احمد علی نے بہت جلد محسوس کرلیا کہ یہ طالب علم محققانہ بصیرت کا مالک ہونے کے ساتھ عشق الٰہی کے بھی ایک اعلیٰ مقام پر فائض تھے اور اللہ تعالیٰ اس سے علوم ظاہری و باطنی کے ساتھ شریعت و طریقت کی خدمت بھی لینے والے ہیں۔ چنانچہ ایک روز اچانک انہوں نے اپنے دولت کدے پر پیر صاحب کی دعوت کی اور سند حدیث سپرد کر کے فرمایا۔

آپ کو مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں وطن تشریف لے جایئے اور دین کی خدمت کیجیے یہ 1295ھ کی بات ہے پیر صاحب کی عمر اس وقت بیس برس تھی۔

حضرت شمس العارفین کی خدمت اقدس میں:

انگر میں پیر صاحب کے استاد محترم مولانا سلطان محمود صاحب، شمس العارفین خواجہ خواجہ شمس الدین سیالوی چشتی نظامی سے بیت ہوئے۔ وہ سال میں کئی بار سیال شریف اپنے پیر و مرشد کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب بھی اپنے استاد محترم کے ساتھ سیال شریف حاضر ہوتے۔ جہاں خواجہ شمس العارفین آپ پر بے حد شفقت فرماتے۔

اب آپ سہارنپور سے سند حدیث لے کر لوٹے تو سیال شریف حاضر ہوئے اور سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں حضرت خواجہ شمس العارفین کے دست حق پرست پر بعیت سے مشرف ہوئے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میرے شیخ علم طریقت کے مجتہد اور مجدد تھے۔ پیر

ومرشد سے محبت وعقیدت کا یہ حال تھا کہ خود فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ شمس العارفین کا رخ انور دیکھ لینے کے بعد کوئی چہرہ نظر میں جچتا ہی نہیں۔

ایک یادگار مناظرہ:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے گولڑہ شریف میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا گولڑہ شریف کے نزدیک ہی بھیکہ نامی ایک گاؤں ہے جہاں اکثر حسینی سادات (جو مذہبا شیعہ تھے) رہتے تھے۔ انہوں نے راولپنڈی میں ایک شیعہ افسر کی امداد سے پیر صاحب کو مناظرہ کا چیلنج بھیج دیا جو آپ نے منظور فرمایا اور مقام مناظرہ پر تشریف لے گئے۔ شیعہ حضرات نے لکھنو سے ایک مجتہد کو بلایا تھا۔

موضوع بحث باغ فدک مقرر ہوا۔ شیعہ مجتہد نے پہلی تقریر کر کے دعویٰ کیا کہ فدک جناب سیدہ کا حق تھا اور حضرت صدیقؓ نے اس کو ظلماً (معاذ اللہ) روک لیا تھا اور ظالم خلیفہ نہیں ہوسکتا۔

پیر صاحب نے جواباً کہا کہ فدک پر حضرت سیدہ کے استحقاق کی کوئی دلیل پیش کیجیے محض ادعا کافی نہیں کیونکہ صرف دعویٰ کی صورت میں تو دوسری جانب سے بھی خلافِ دعویٰ ہوسکتا ہے۔ اس پر مجتہد نے سورۃ نساء کی گیارہویں آیت پڑھی۔

اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے ضمن میں تم کو وصیت فرماتا ہے۔

”مردوں کے لیے دو عورتوں کی مانند حصہ ہے اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی چھوڑی ہوئی چیز کی ہے اور اگر عورت ایک ہو اس کے واسطے آدھا ہے۔“

آپ نے جواب دیا کہ بے شک ایسی صورت میں کہ جناب سیدہ اپنے والد شریف نبی کریم ﷺ کے بعد اکیلی وارث ہوتیں تو اس آیت کی رُو سے حضور اکرم ﷺ کے متروکہ میں سے نصف حصہ کی مالک ہوتیں۔ لیکن جس صورت میں باپ نے کوئی ترکہ چھوڑا ہی نہ ہو تو نصف کہاں سے ملے گا۔ دوسرے یہ کہ فدک کا ترکہ ہونا کسی دلیل سے ثابت ہے۔

مجتہد نے کہا کہ قرآن پاک سے ثابت ہے کہ فدک اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کا تھا اور یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ: ”اور جو کچھ پھیر لایا اللہ اپنے رسول پر ان میں سے پس نہیں دوڑاتے تم نے اس کے اوپر گھوڑے اور نہ اونٹ‘ لیکن اللہ مسلط کرتا ہے اپنے رسولوں کو جس کو اوپر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

سید پیر مہر علی شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس آیت کے ساتھ ہی جو آگے آیت آتی ہے اس پر بھی غور کیجیے۔

جو کچھ اللہ ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پھیر لایا۔ پس اللہ کے رسول کے قرابت والوں‘ یتیموں اور فقیروں کے واسطے ہے تا کہ نا ہووے ہاتھوں ہاتھ لیا تم میں سے دولت مندوں کے واسطے۔ (سورۃ الحشر)

اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ فدک حضور اکرم ﷺ کا ملک نہ تھا۔ اگر بالفرض ایسا مان بھی لیا جائے تو حدیث شریف ہم معاشر انبیاء اپنا ورثہ نہیں چھوڑتے۔ ہمارا متروکہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فدک کو وقف کر دیا تھا اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ ﷺ نے وقف نہیں فرمایا تو حضرت سیدہ کا حق نصف فدک ہوا نا کہ سارا جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے۔

مجتہد صاحب نے کہا یہ حدیث نصِ قرآنی کے خلاف ہے اور یہ آیت پڑھی۔

”وورث سلیمان داوٗد“ (القرآن)

آپ نے جواب دیا کہ یہاں وارث دینی مراد ہے۔

انہوں نے پوچھا کہ اس تخصیص کی دلیل کیا ہے۔

حضرت پیر مہر علی صاحب نے فرمایا۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کی بہت سی اولادیں تھیں باقی اولاد کو محروم کر کے صرف ایک کو وارث بنایا۔ پیغمبر کی شان کے خلاف ہے لہٰذا تخصیص کا قرینہ سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی تخصیص ہے نیز نحن معاشر الانبیاء لانورث کے معنی میں ہیں کہ انبیا کا وارث غیر نبی نہیں ہوسکتا۔ اگر نبی کا وارث نبی ہو تو یہ حدیث خلاف نہیں اس کی دلیل (معاشر الانبیاء) سے ملتی ہے لہٰذا یہ حدیث شریف کی تائید کرتی ہے نا کہ تردید۔

قادیانیت سے ٹکر:

ملفوظات طیبات میں درج ہے کہ پیر صاحب نے فرمایا۔

عالم رویا میں حضور اکرم ﷺ نے مجھے مرزائے قادیانی کی تردید کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص میری احادیث کو تاویل کی قینچی سے کُتر رہا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔

مرزا قادیانی کی فتنہ طرازی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ انہی دنوں اس نے ’ایام الصلح‘ میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے مشائخ کرام کے بارے میں لکھا۔

اس وقت آسمان کے نیچے کسی کی مجال نہیں جو میری برابری کی لاف مار سکے۔ میں اعلانیہ اور بلا کسی خوف کے کہتا ہوں کہ اے مسلمانو! تم میں بعض لوگ محدثیت اور مفسریت کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور بعض از راہ ناز زمین پر پاؤں بھی نہیں رکھتے۔ کئی خداشناسی کا دم مارتے ہیں اور چشتی‘ قادری‘ نقشبندی اور سہروردی اور نجانے کیا کیا کہلاتے ہیں ان کو میرے سامنے تو لاؤ۔ بحوالہ مہر منیر 206۔

ظاہر ہیں لوگ قادیانیت سے متاثر ہونے لگے تو پیر صاحب اس طرف متوجہ ہوئے اور 1899ء میں ایک کتاب شمس الہدایت فی اثبات حیات المسیح‘ تصنیف فرمائی یہ کتاب ہندوستان کے تمام علماء اور مشائخ میں تقسیم کی گئی اور اس کی ایک کاپی قادیان میں مرزا صاحب کو بذریعہ رجسٹری بھجوادی گئی۔

شمس الہدایت میں پیر صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے اور قیامت کے قریب بجسد عنصری زمین پر نازل ہوکر اسلام کی نصرت فرمانے کو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت کیا ہے اور اسے امت مسلمہ کے اجتماعی اور متفق علیہ عقائد میں سے قرار دیا ہے۔ نیز ثابت کیا ہے کہ ان کی موت اور ان کے مثیل کے دنیا میں بطور مسیح موعود آنے کے قادیانی عقائد غلط اور باطل ہیں۔

فتنہ انکار حدیث کا مقابلہ:

عبداللہ چکڑالوی نے حدیث رسول مقبول ﷺ کا انکار کرتے ہوئے اہل قرآن کے نام سے ایک نیا فرقہ کھڑا کیا تو آپ نے اس فتنہ کے استیصال کے لیے جگہ جگہ دورہ حدیث کے درس جاری کرائے جس سے ان علاقوں میں چکڑالویت کا زور ختم ہوگیا۔

وصال:

ماہ صفر 1356ھ میں پیر صاحب میعادی بخار کا عارضہ لاحق ہوا آخر 29 صفر کو علم شریعت وطریقت کا وہ آفتاب غروب ہوگیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون جس کی نورانی کرنوں سے ایک عالم کے سینے منور ہو رہے تھے یکم ربیع الاول کو بعد نماز عصر آپ کی نماز جنازہ ہوئی۔ جس میں علاقہ بھر کے زائرین نے شرکت کی۔

لاہور سے بھیجی گئی ایک ایسی تحریر جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی

نورِ فیض

اللہ اپنے بندوں کو اشارے ضرور دیتا ہے اگر وقت رخصت نہ آیا ہو نظر چاہیے انہیں سمجھنے کے لیے.....

حنا بشریٰ

''2005 یکم اکتوبر دھوئیں کے سیاہ بادلوں سے یوں اَٹا آسمان کہ اس کی نیلاہٹیں بھی سیاہی مائل ہوگئی تھیں۔ صبح کے اجالے کی تابنا کی اپنے اندر سموئے سورج بھی ان سیاہ بادلوں کی زد میں آ کر 'گرہن زدہ' ہوکر بے رنگ و نور سا ہوا تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔''

''2005' 3 اکتوبر سرمئی اور بھولے رنگ بلند و بالا دیوہیکل پہاڑیوں بھربھرے اور بے دم ہوکر یکے بعد دیگرے زمین بوس ہونے لگے کہ جیسے زمین کی ان 'میخوں' کو کسی نادیدہ ہاتھ نے ترتیب سے اکھاڑ ڈالا ہو یا پھر عزرائیلؑ کے ہاتھوں سے 'تازیانہ اجل' پڑنے سے یہ دیو قامت پہاڑیوں غائب ہوگئے کہ جیسے سرے سے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔''

''2005' 6 اکتوبر زمین کے سینے کو بے دردی سے چیرتی بھیانک دراڑیں کہیں درمیاں سے' تو کہیں دائیں بائیں سے' اس میں ایسے شگاف' عمیق گڑھے اور کھائیاں بناتی چلی گئی کہ بس چشم زدن میں پوری کائنات اوندھے منہ ان شگافوں اور کھائیوں میں جا گرے گی اور پھر پوری کی پوری 'ہستی کائنات' ہمیشہ کے لیے آنکھ سے اوجھل۔'' تھوڑے دنوں کے وقفے سے آنے والا اندر ہولنا کی' تباہی اور بربادی سمیٹے ہوئے یہ کوئی تیسرا خواب تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ خواب قبل از نیند کسی 'ہارر مووی' یا پھر کسی دہشت ناک ناول کے پڑھنے کے زیر اثر نظر آئے۔ یہ تو اس رات بھی آئے جب میں تھکان کی وجہ سے بستر پر لیٹا اور گہری نیند میں چلا گیا اور جب آنکھ کھلی تو یوں لگا کہ میں کسی ایسی وادی سے زندہ سلامت بچ نکل آیا ہوں۔ جہاں چند ثانیوں پہلے کوئی قیامت صغریٰ ٹوٹی تھی۔ جب آنکھ کھلتی تو دل پر عجیب وحشت سی طاری ہوتی۔ تنفس کی تیزی جو دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی کا پتہ دے رہی ہوتی۔ چند لمحوں کے لیے میں سینے پر ہاتھ رکھے حیران پریشان سا بالکل ساکت سا پڑا رہتا۔ یہ سوچتا رہتا کہ یہ

خواب ہے یا پھر سچ سچ میری ذات یہ کوئی حادثہ گزرا ہے۔ شروع میں آنے والے ایک آدھ خواب کو تو میں دن بھر کی مصروفیت میں فراموش کر جاتا مگر آئندہ آنے والی راتوں میں یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ شروع ہوا تو نہ میں فراموش کر سکا اور نہ ہی توجہ ہٹا سکا۔ بلکہ میرے اعصاب کو ان خوابوں میں نظر آنے والی تباہی نے ایسا شق کیا کہ امی کو بھی میری حالت دیکھ کر پریشانی سی لاحق ہو گئی تھی۔ وہ تقریباً ہر صبح ہی میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھ سے وجہ پوچھتے بیٹھ جاتیں تو میرا یہی جواب ہوتا۔

''امی..... بس وہی پریشان کن خواب۔''

میرا یہ جواب اتنا غیر اہم نہ تھا کہ امی کو پریشانی میں ڈالتا۔ میرے خواب عام خواب نہ ہوتے تھے کہ ان کو وہ نظر انداز کر دیتیں۔ وہ تو اشارہ ہوا کرتے تھے گویا کسی طوفان کے آنے کا..... وہ تو الارم ہوا کرتے تھے کہ کسی مشکل و پریشانی کی طرف توجہ دلانے کے لیے میرے خواب تو طوفان سے پہلے چلنے والی ہوا کی طرح اسرار بھرے ہوتے تھے۔ جو 'بادبان' کو اشارہ دینے کا ذریعہ ہوتے تھے کہ کر لو اپنا کوئی حفاظتی انتظام تباہی بس قریب ہے۔

''تو کیا اس بار بھی کوئی تباہی قریب تھی؟''

''مگر کہاں؟''

''کس جگہ؟ کس مقام پر؟'' وہ مقام میری بصارتوں کے لیے نیا تھا۔ میں نے جاگتی آنکھوں سے ابھی وہ نہیں دیکھا تھا بلکہ میں تو اس بات سے لاعلم و ناآشنا تھا کہ کیا وہ جگہ..... وہ مقام اس قطعہ ارض کا حصہ بھی تھا یا نہیں..... کیا وہ جگہ جہاں افتاد ٹوٹتی دکھائی دے رہی تھیں کہ وہ پاکستان میں ہے یا کسی اور ملک میں؟

اور اس لاعلمی کی وجہ یہ تھی کہ میری زندگی کا پہلا حصہ انگلینڈ میں گزرا تھا۔ ابو نے اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے باہر چھوٹی عمر میں ہی بھیج دیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب پاکستان لوٹا تو شعبہ صحافت سے وابستہ ہوا تو اینکر رپورٹر بن گیا۔ پاکستان کے بہت سے شہروں میں ٹیم ممبرز کے ساتھ گھوم چکا تھا مگر وہ جگہ ایک بار بھی ابھی نہیں دیکھی

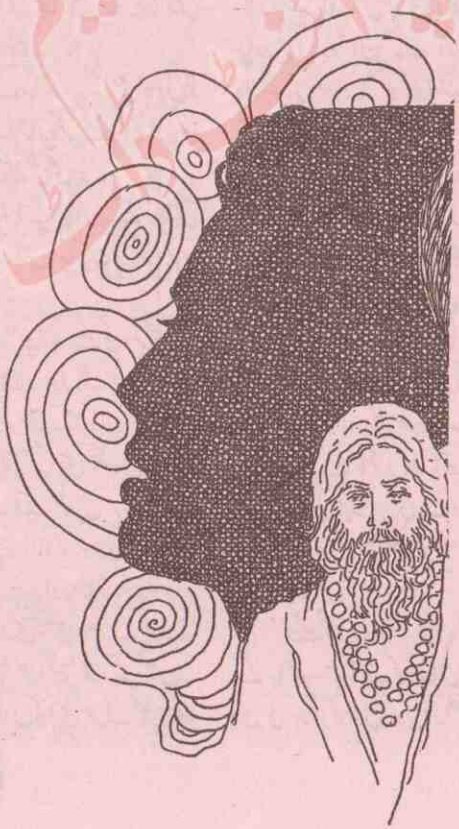

تھی۔ کیونکہ ابھی مختصر عرصہ تو ہوا تھا مجھے اس سرزمین پر قدم رکھے۔

''بلند و بالا پہاڑ..... ریتلی زمین..... اور آسمان پر پہرے داروں کی طرح منڈلاتے سیاہ و سفید بادل..... اور اس پر نازل ہوتا وہ عذاب.....''

تقریباً اب روز ہی امی میری زبانی ٹوٹے بکھرے ہوئے خواب سننے لگیں تو لاکھوں اندیشے دامن گیر ہونے لگے۔ کیونکہ اس بات سے صرف امی ہی واقف تھیں کہ میرے خواب اکثر سچے ہوتے تھے۔ میرا ظاہر تو ذرے کے برابر بھی روحانیت کی طرف مائل نہیں تھا مگر میرا باطن تو شاید پیدائشی طور پر اس سے وابستہ تھا۔ وہ الگ بات تھی کہ کبھی خود کے اندر جھانک کر دیکھا نہیں تھا۔ دیکھتا تو شاید علم بھی ہوتا۔

''اٹھو..... چلو میرے ساتھ.....'' امی کا دل تو جیسے کسی انہونی کی طرف اشارہ کرنے لگا تو ان کی فکرمندی سوا نیزے پر پہنچنے لگی تھی۔

''کہاں؟'' میں جو اپنے پلان کے مطابق تیاری پکڑے ہوئے تھا۔ اس اچانک پروگرام پر کوفت کا شکار ہوگیا۔

''درگاہ شریف.....'' یہ لفظ سننے کی دیر تھی کہ میں نہ صرف کوفت کا شکار ہوا بلکہ سخت قسم کی بیزاریت نے مجھے آن گھیرا تھا۔ میں 'لادین' نہیں تھا۔ مگر دیندار بھی نہیں تھا کہ ایسی جگہوں پر جانا میرا پسندیدہ مشغلہ ہوتا۔ ایک طویل عرصہ مغربی زندگی کے زیر اثر رہنے والا نوجوان کتنا ایسی جگہوں سے متاثر ہوسکتا ہے۔ اور متاثر ہونا تو دور کی بات میری نظر میں تو ایسی جگہیں صرف چونے' مٹی' پتھروں سے بنی بس 'سحر انگیز' عمارتیں تھیں۔ جن پر طاری 'نفسوں' جاہلوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا اور ایسا کھینچتا تھا کہ کوئی ننگے پیر ان کی طرف چل کر جاتے تھے اور کوئی سر کے بل دوڑ کے کسی نے جو دن حاضری کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور کسی نے جمعرات کا.....

حد سے بھی ان کی عقیدتیں دیکھ کر مجھے ہنسی آیا کرتی تھی۔ مجھے ان کی عقلوں پر شک ہوا کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ جاہل لوگ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ ایک عمارت کے چاروں طرف دیوار کھڑی کر کے درمیان میں زمین پر مدفن جسد خاکی کا تصور صرف خیالی ہے۔ اس میں نہ کوئی دفن ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی ایسی کرامات ہوتی ہیں کہ ان کے واسطوں وسیلوں سے اللہ سے مانگا جائے۔ سبز و سرخ چادروں میں ملفوف زمین کا وہ حصہ اور اس پر بچھی گلاب کے پھولوں کی چادریں اور ان سے وابستہ لوگوں کی دلی وابستگیاں سوائے 'گورکھ دھندے' کے سوا کچھ نہیں تھیں۔

''خدا کا نام لیں امی.....'' میں نے عاجز آتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''مجھے نہیں جانا کسی درگاہ..... ورگاہ پر.....''

ناگواری حد سے بڑھی کہ میں اول فول بولنے سے بھی باز نہ آیا۔ مجھے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا مگر امی کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے پہلے مجھے غصے سے گھورا اور پھر سخت سست سنائی۔ وہ تو یہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں کہ جیسے میں نے کوئی بہت بڑی بے ادبی یا گستاخی کر ڈالی ہو۔ بہت اونچی اور مقدس ہستیوں کے حضور..... جبکہ میں بالکل مطمئن تھا۔

''مجھے نہیں جانا..... کسی بھی ایسی جگہ پر آپ کے ساتھ..... آپ کو جہاں جانا ہے جائیں۔'' امی کی ہر ناگواری اور ناراضگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے دٹکا سا جواب دے دیا تھا۔

میں جب سے پاکستان آیا تھا امی مجھے نہ جانے کس کس شہر کے مزاروں پر حاضری کے لیے لے چکی تھیں۔ کبھی داتا علی ہجویری کے مزار اقدس پر' تو کبھی پیر مکی شریف کے قدموں' کبھی شہنشاہ ولی کی درگاہ پر تو کبھی عبداللہ شاہ غازی کی بارگاہ میں کبھی کھجوروں والی سرکار کے دربار میں حاضری کے لیے تو کبھی امام بری کی قبر مبارک پر چادر چڑھانے کے لیے.....

لوگوں کو وہاں عقیدتوں کے چڑھاوے آنسوؤں سے..... پھولوں سے..... ریشمی سنہری چادروں سے چڑھاتے دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ پھر ہنسی آنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ کوفت ہونے لگی۔ میں اکثر امی کی یہ نیاز مندی اور عقیدت دیکھ کر الجھ پڑتا تو وہ شدید برہم ہوجاتیں۔

''تم پر تو بالکل ہی مغربی رنگ چڑھ گیا ہے۔'' ان کی برہمی میں تاسف کا رنگ نمایاں ہوتا اور حیرت بھری ہوتی۔

''جانتے ہو معاذ..... انہی اللہ والوں کے صدقے میں تو تم میری خالی جھولی میں ڈالے گئے ہو۔'' میں جب سے پاکستان آیا تھا امی کی اس طرح کی باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ اُن کے مطابق میں شادی کے دس سال بعد بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ امی ابو نے اولاد کی تمنا میں نا جانے کس کس درگاہ پر حاضری دی تھی اور نیتیں مانی تھیں پھر کہیں ان کی خالی جھولی بھری تھی۔

جب میں نومولود تھا تو امی ابو مجھے ان درگاہوں پر 'برہنہ پا' لے کر حاضر ہوتے تھے۔ یہ بھی ان نظر نہ آنے والی ہستیوں سے عقیدت کا ایک انداز تھا۔ وہ اکثر بتاتے تو میرے اندر عجیب سی بے چینیاں رینگنے لگتیں۔ دماغ میں سوالات کُرلانے لگتے تو ناگواری جنم لینے لگتی۔

''اگر میں اس وقت ہوش و حواس میں ہوتا اور اپنے پیروں پر چل سکتا تو یقین مانیں کہ میں کبھی آپ لوگوں کے ساتھ نہ جاتا۔'' میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا تو امی ناراض ہوجاتیں۔ تو میں نے کھل کر اظہار کرنا تو چھوڑ دیا مگر رائے محفوظ رکھتا تو میرا حق تھا۔ اس 'حق' کو اندر ہی اندر خوب اچھی طرح استعمال کیا کرتا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ میری اس سوچ نے دل میں اپنی 'جڑیں' اتنی مضبوط کرلیں کہ میں کسی بھی ایسے مقام کا نام سن کر وہاں جانے کا پروگرام بنتا دیکھ کر یوں بدک جاتا کہ جیسے گھوڑا..... کسی بھی ناپسندیدہ منظر' نظارے کو دیکھ کر بدک جاتا ہو۔

نہ صرف گھر میں بلکہ دوستوں کے ساتھ بھی میرا یہی حال تھا۔ کسی ٹورٹرپ کے دوران ایسی 'مقدس درگاہ یا مزار' راستے میں آجاتا تو سب تو وہاں رُک کر گھڑی دو گھڑی کے لیے ضرور نذرانہ عقیدت و سلام بجالاتے۔ جبکہ میں ناگواری سے کسی اونچے ٹیلے پر کسی گھنے درخت کے نیچے کسی کھردرے چٹان نما پتھر پر بے نیازی اور لاپروائی کا چوغہ پہن کر بیٹھ جاتا۔ اور دل ہی دل میں ناگواری سے ان 'جاہلوں' کو تکتا رہتا اور ان کی حرکات و سکنات دیکھتا رہتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں نے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا جتنی میری ناگواری شدید ہے اتنی ہی ان سب کی عقیدتیں شدید..... اور شدتیں چاہے منفی ہوں یا مثبت شکل میں..... اگر آپس

میں ٹکرا جائیں تو ایسا سخت معرکہ ہوتا ہے کہ سوائے نقصان کے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ ان کی عقیدتیں میری ناگواری ختم نہیں کر سکتی تھیں اور نہ میری ناگواریاں ان کی عقیدتوں کو پسپا نہیں کر سکتی تھیں۔

اگر کوئی ٹیم ممبر زبردستی ساتھ لے جاتا تو میری حالت یہ ہوتی کہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا تو ضرور ہوتا مگر زبان تالو سے چپکی رہتی۔ میرا دل ہی جن کے وجود سے انکاری تھا۔ میری زبان ان کے لیے کیا نذرانہ عقیدت پیش کرتی؟ اور کس لیے کرتی؟ میرے نزدیک یہ سب نظارے محض بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں تھے۔ سنگ مرمر کے گھروں میں سرخ و سبز چادروں کے نیچے کوئی وجود نہیں تھا۔

''بیکار باتیں بند کرو معاذ...... آج جمعرات ہے حاضری لازمی ہے۔'' جب بھی ایسے پریشان کن خوابوں کا سلسلہ شروع ہوتا تو امی مجھے کسی نہ کسی مزار اقدس پر حاضری کے لیے ضرور لے کر جاتیں' نذر نیاز کرتیں ان ہستیوں کے وسیلے سے اپنی اکلوتی اولاد کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں وہ جگہ کا انتخاب اپنی مرضی سے کرتیں میرے لیے بس یہ حکم ہوتا کہ خاموشی سے ساتھ چلو' بیکار کی بحث بند کرو۔

''یہ بیکار کی باتیں بے ادبی کے زمرے میں آتی ہیں۔'' وہ مجھے سمجھاتیں۔

وہ ساتھ تازہ گلاب کی پتیاں منقش سنہری تاروں کی چادر ساتھ لانا نہ بھولتیں اور یہ سب کچھ میرے ہاتھ سے کرواتیں فرش کے اندر کھدے ہوئے ڈبے میں کچھ نہ کچھ رقم بھی ڈلواتیں یہ سب دیکھ کر میں ماتھا پیٹ کر رہ جاتا۔

''پتہ ہے تمہیں یہ اللہ کے بہت پہنچے ہوئے ولی ہیں۔'' انہوں نے صاحب مزار کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا۔

ایک ہاتھ میں پھولوں کا لفافہ اور ساتھ ہی چادر پکڑے میں مردہ دلی سے اُن کے ساتھ تو چل رہا تھا مگر فون کان سے لگائے اپنے ہیڈ آف اسٹاف سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے اگلے ٹور کے متعلق معلومات دے رہے تھے۔

''معاذ...... میں اولاد کی محرومی کے سبب بہت رویا کرتی تھی۔ پھر اللہ پاک نے ان کے صدقے میں تمہیں میری جھولی میں ڈال دیا۔''

لوہے کا کشادہ سیاہ رنگ کا گیٹ کراس کرتے ہوئے ہم اندر داخل ہوئے تو ایک سرسری نگاہ گرد و پیش پر ڈالتے ہوئے میرے ذہن نے پہلا اندازہ یہی لگایا تھا کہ شاید آج ہم کسی پارک میں شام کی چہل قدمی کے لیے آئے ہیں۔ وہ بہت وسیع و عریض صاف ستھرا لاہور کے بہت بارونق مقام کا مشہور پارک تھا۔ بطور صحافی اتنا تو میں جان گیا تھا مگر امی کے یہاں آنے کا مقصد نہ جان پایا تھا۔

''ایک بار تمہاری خالہ اور نانی یہاں سلام کے لیے آئی تھیں۔ اس وقت یہ باغ نہیں تھا بس مٹی کا میدان ہی تھا۔'' امی کوئی واقعہ سنانے لگیں۔ ہولے ہولے قدموں سے چلتے ہوئے انہوں نے ایک محبت بھری مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ تو ان کی آنکھوں میں نمی بھی مسکرائی تھی۔ میں فون بند کر کے مکمل ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''اُن دونوں نے وضو کرنا تھا......'' دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے انہوں نے چند لمحوں کے لیے زبان پر جاری تسبیح و تحلیل کو روکا۔

''نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا اور پانی نہیں مل رہا تھا۔ وہ دونوں رو پڑیں۔'' دھیرے دھیرے کہتی وہ آگے بڑھ رہی تھیں۔

میں باغ کی خوبصورتی کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے باغ کے چند خوبصورت گوشوں کی تصاویر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے لگا۔

''سن رہے ہو نا؟'' کیمرے کی آواز پر وہ سمجھیں کہ شاید میں متوجہ نہیں تھا۔

''جی سن رہا ہوں آپ بولیں۔'' دائیں طرف اونچی سی سرسبز و شاداب پہاڑی تھی۔ اِرد گرد رنگ برنگے پھولوں کی چادر بچھی تھی۔ باغ میں کافی گہما گہمی تھی جسے میں نے کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔ قدرتی مناظر ہمیشہ سے مجھے اٹریکٹ کرتے تھے۔

''پھر پتہ ہے کیا ہوا؟'' عقیدت اور احترام نے امی کے الفاظ بھگو دیے تھے وہ آہستگی سے چلتے ہوئے باغ کے بائیں جانب مڑ گئیں۔

''کیا ہوا؟'' ہوا میں عطر و گلاب کی پاکیزہ خوشبوئیں تنفس سے ٹکرائیں۔ کبوتروں کی غٹر غوں نے سماعتوں کو متوجہ کیا اور ماحول کے اسرار و سکوت کی کشش نے دل پر سحر پھونکا۔ تو میری توجہ نہ صرف تصویریں اتارنے کی طرف سے ہٹ گئی۔ بلکہ نظروں کے سامنے شفاف براق گنبد ٹھہر گیا۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ یہ صرف پارک نہیں ہے بلکہ یہاں کسی ہستی کا مزار بھی ہے۔ مگر کس کا؟ ابھی یہ میرے علم میں نہیں تھا۔

''ان دونوں نے بہت گڑگڑا کر ان 'اللہ والے' کے وسیلے سے دعا مانگی تو یہاں لگے نلکے میں جو نہ جانے کتنے سالوں سے بند پڑا تھا۔ اُس میں پانی رواں ہو گیا۔ یوں جیسے کہ اُس میں کوئی خرابی ہی نہ تھی۔ اور پانی یوں 'جھر جھر' گرنے لگا کہ جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ ہم دونوں سرخ و سفید شفاف اینٹوں کی باڑ پار کرتے ہوئے ہم دربار شریف کے احاطے میں آ گئے تھے۔

''جانے دیں امی...... زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور ایک آپ...... پتہ نہیں کون سی 'جھوٹی' سنی سنائی کرامات کو سچ مان بیٹھی ہیں۔''

میرا موڈ تو دربار شریف کو دیکھ کر بگڑ گیا تھا۔ کسی کی کرامات پر یقین لانا متاثر ہونا تو ابھی دور کی بات تھی۔ یہ بات میرے لیے بعید از عقل تھی۔

وہ جو دنیا سے جا چکے ہیں وہ آج بھی مخلوق انسانی کے لیے اپنے فیض کا خزینہ لٹا رہے ہیں جو ان کے واسطوں سے اللہ کو پکارتا ہے وہ اُن کی سنتا ہے۔ یہ ہستیاں اپنے عقیدت مندوں پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں اُن کی مدد کرتے ہیں۔ دل اگر ان باتوں پر قائل بھی ہو جاتا مگر دماغ ہنوز انکاری تھا۔ ان کے سلسلہ فیض کا......

کمپیوٹر کے ترقی یافتہ دور میں بھلا کون ان باتوں کو مانتا ہے۔ مگر امی تو نہ صرف دل و جان سے ان کے کشف و کرامات کی قائل تھیں بلکہ مجھے بھی راغب کرتی تھیں۔ وہ ان ہستیوں کے بارے میں مضبوط سے مضبوط دلائل دیتی تھیں۔

مولانا روم نے فرمایا۔

''یہ اولیاء کرام اپنے دور کے 'اسرافیل' ہوا کرتے تھے۔ جس طرح اسرافیل کے صور پھونکنے سے قبروں سے مردے نکل آئیں گے۔ بالکل ایسے ہی ان کی نظر اور تعلیم ایسی ہوتی تھی کہ مردہ قلوب کا احیاء ہو جایا کرتا تھا۔''

یہ اللہ کی تابعدار ہستیاں ہوتی تھیں جن کی تابعداری پر فرشتے بھی رشک کرتے تھے۔ جو نہ تو خود گمراہ ہوا کرتے تھے اور نہ ہی اپنے سے وابستہ لوگوں کو گمراہی کا زہر پینے دیتے تھے۔ یہ تو 'خضرِ راہ' ہوا کرتے تھے۔ جو بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ

دکھاتے تھے۔ ان کی تعلیمات مثلِ 'آب حیات' تھی۔ جو دلوں کو مرنے نہیں دیتا تھا۔

ان کی نگاہ کرم سے تو کافر، سرکش و جادوگر بھی اپنے وقت کے ولی بن جاتے تھے۔ پھر امی نے نا جانے کن کن کا نام لینا شروع کیا۔ جو میں پہلی بار سن رہا تھا۔ کبھی خواجہ غریب نواز کی عظمت پر کوئی جملہ' تو کبھی پیران پیر غوث اعظم دستگیر کی ذات معتبر کی توصیف' کبھی قطب الدین کی شان کا قصہ' کبھی بابا بلھے شاہ اور حضرت نظام الدین اولیاء کے قصیدے' وہ یہ قصے سناتے سناتے جذب و سرور کی کیفیت میں اترنے لگیں کہ میں چند لمحوں کے لیے حیران رہ گیا۔

ان 'نادیدہ ہستیوں' کے حوالے سے (نادیدہ اس اعتبار سے کہ کبھی ظاہری آنکھ سے تو نہ دیکھا تھا) ان کی کرامات پر اتنا یقین' میں حیران تھا۔ سچ مچ حیران تھا مگر دلی طور پر نہ تو قائل ہوا اور نہ ہی متاثر......

ہم چلتے ہوئے مزار اقدس کے سامنے آ چکے تھے۔ عطر و گلاب' اگربتیوں کی خوشبو سے فضاء بھی معطر تھی اور ہوا بھی...... طاقچوں میں رکھے چراغ چہار سو روشنی بکھیر رہے تھے۔ حاضرین دلوں میں عقیدت سموئے اپنے اپنے انداز میں احترام و محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ مزار کے بائیں جانب چند قوال جذب و سرور کے عالم میں نذرانہ عقیدت اشعار کے ذریعے پیش کر رہے تھے۔

آئیں ہیں تیرے در پہ تو کچھ لے کے جائیں گے
ورنہ اس آستاں پہ جاں دے کے جائیں گے

سیڑھیوں کے پاس سفید براق سنگِ مرمر کی جالیاں تھیں۔ ایک کونے میں مستغرق سا مجذوب آنکھیں بند کیے گرد و پیش سے بیگانہ تھا۔ بس چند لمحوں بعد 'حق ہو' کا نعرہ لگاتا اور دوبارہ سے اپنی اسی کیفیت میں ڈوب جاتا۔ مزار کا ایک گوشہ بے حد پُرسکون تھا۔ وہاں سیمنٹ کا مضبوط صاف ستھرا چبوترہ تھا جس پر کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھی تھی۔ ایک پانی کی صراحی ساتھ مٹی کا پیالہ...... پاس ہی کورے کونڈے میں ڈھیروں ڈھیر نمک تھا۔

ایک لاپرواہ قدرے بیزار نگاہ اس سارے ماحول پر ڈالتے ہوئے میں ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ امی قبر اقدس کے پاس موجود تھیں۔ مجھ پر بیزاریت کا غلبہ ہوا تو میں نے کیمرہ نکال لیا۔ جو میں ہر پل اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے تصاویر لینے لگا۔ میرے دماغ میں اس ماحول سے متعلق سوچیں تھیں۔ میرا دماغ مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں اس ماحول پر فیچر لکھوں۔ جس کی میڈیا کے ذریعے تشہیر کروں۔ لوگوں کی دقیانوسیت پر کھل کر زہر اگلوں۔ میں بتاؤں کہ یہ مقام کس طرح لوگوں کی گمراہی کا باعث بن رہے تھے۔

کیسے 'ہڈحرام' 'ہٹے کٹے' ملنگ مجذوبیت کا چوغہ پہنے خود کو پہنچا ہوا ثابت کرتے ہیں۔ اپنی دردمند صدا کے ذریعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بس وہی تو ہیں خاص اللہ والے...... جو بیٹھے تو خاک کے فرش پر ہیں مگر ان کا براہِ راست دلی رابطہ عرش والے سے ہے۔ لنگر کے نام پر کیسے ہزاروں روپے لٹائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غریب و مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ مگر اندر اندر نا جانے اس کا استعمال کہاں ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان پہلوؤں پر سخت گیر تبصرہ کروں کہ کوئی قانون پاس ہو جائے اور ان جگہوں کو سیل کر دیا جائے۔ میں ابھی ان زہریلے خیالات میں مگن تھا کہ ایک آواز سماعتوں کے آر پار ہوئی۔ توجہ کی تو وہ ایک چھ سالہ سفید صاف ستھرے لباس میں معصوم سا بچہ تھا۔

''یہ لے لو......'' سفید کاغذ کا رقعہ میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ مسکرانے لگا تو میں نے وہ پکڑ لیا۔

''سفر کا ارادہ ترک کر دو......'' حکم تھا یا مشورہ سیاہ موٹے حروف سے لکھی عبارت میری نظروں کے سامنے تھی جو مجھے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن کرنے کے لیے کافی تھی کہ اس رقعے میں جو بات لکھی تھی وہ صرف میرے علم میں تھی کہ دو گھنٹے بعد مجھے ٹیم ورک کے لیے مظفر آباد کے لیے نکلنا تھا۔ پروگرام ایمرجنسی میں بنا تھا اس لیے ابھی امی کو اطلاع نہ دے پایا تھا۔ ورنہ کہیں بھی جاتا تو امی کو ضرور بتاتا تھا۔ چاہے ٹور تین گھنٹے کا ہوتا یا تین ہفتوں کا......

''مگر کیوں؟'' میں نے سوال پوچھنے کے لیے نگاہ اٹھائی تو بچہ غائب تھا۔ دائیں طرف گھنے درخت تھے۔ وہ وہاں بھی نہ تھا۔ بائیں طرف عورتیں نذر و نیاز بانٹ رہی تھیں وہ وہاں بھی نہ تھا۔ تجسس بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بے دھیانی میں چلتا ہوا مزار کے سامنے آیا تو امی مجھے تلاش کرتے ہوئے آ گئیں۔

''تم کہاں تھے؟'' وہ شاید کافی دیر سے مجھے ڈھونڈ رہی تھیں جھنجلاہٹ اُن کے چہرے پر رقم تھی۔

''یہیں تھا امی......'' رقعہ ابھی بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میری نظریں بچے کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

''یہیں تھے تو سلام کیوں نہیں کیا؟'' وہ اصل سوال کی طرف آ گئیں۔ انہیں یقیناً مجھ پر غصہ تھا کہ میں یہاں آیا ہوں اور سلام کرنے کی بجائے ایک طرف بیٹھا تھا۔ نہ سلام کیا نہ چادر چڑھائی نہ پھول ڈالے' نہ گلے میں پیسے ڈالے' نہ ہی دعا اور فاتحہ خوانی کی۔

''آپ نے کر لیا ہے نا سلام...... بس بہت ہے۔'' امی نے وہ بات کہہ ڈالی تھی جو میری چھیڑ تھی۔ متلاشی نظریں بچے کے تعاقب میں تھیں۔

''معاذ...... تم باز نہیں آؤ گے اس بے ادبی سے......'' امی نے نہ صرف مجھے ڈپٹا بلکہ بازو پر ایک چپت بھی لگا دی اور پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔

''تم انہی کی دعا سے مجھے ملے ہو...... یہ بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ تم پر خاص نظرِ کرم ہے ان کی۔''

پھر امی نے دو چار واقعات ایسے سنائے جو میری زندگی میں ایسے تھے کہ جن میں موت کے منہ میں جانے سے بچا تھا۔

لینڈ سلائیڈنگ میں پھنسنا...... شمالی علاقہ جات میں دوران سفر آفس بس کا گہری کھائی میں گرنا...... بہت سے چھوٹے بڑے روڈ ایکسیڈنٹ' بہت بار مخالفین کی اندھی گولی کی زد میں آتے آتے بچا' امی یہ سب ان برگزیدہ ہستیوں کے صدقے میں مانتی تھی۔ جن کی نظرِ کرم کے طفیل میری زندگی بہت بار موت کے پنجوں سے بچ نکلی تھی۔

''حق ہو......'' میں ابھی اسی بچے کو ڈھونڈ رہا تھا کہ بہت قریب سے آواز ابھری تھی۔ وہی ملنگ میری نظروں کے سامنے تھا جسے میرے دل و دماغ نے ڈھونگی' ہڈحرام ملنگ کے نام سے پکارا تھا۔

''صدقہ دے اس کا...... جان کو خطرہ ہے مائی تیرے بیٹے کی۔'' نا جانے کون سی اَن دیکھی دنیا سے جسمانی و روحانی طور پر وابستہ اس 'ملنگ' نے ایک جلالی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس شدت کی تھی کہ جیسے خون اترا ہو۔

''موت منڈلا رہی ہے تیرے سر پر۔'' ایک اور اسرار بھری بلکہ دل دہلانے والی بات کہہ کر نہ صرف امی کا دل دہلایا بلکہ گرد و پیش کے لوگوں کو بھی متوجہ کر دیا تھا۔ وہ سب آنکھوں میں خوف و تشویش لیے یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے انہیں ملنگ کی بات پر پورا یقین تھا اور اس کا حرف حرف سچا ہے۔ یہ سننے کی دیر

تھی کہ امی نے لرزتے ہاتھوں سے بیگ سے ہزار کا نوٹ نکالا۔ میرے سر پر سے وارا اور ملنگ کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ایک گرجدار آواز انہیں سہا گئی۔

''نہ مائی نہ...... دھن دولت کی ضرورت ہم فقیروں کو نہیں ہوتی' دے یہ کسی ضرورت مند کو۔'' دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ کڑک دار آواز میں بولا تھا۔ ایک نظر بھی ہزار کے نوٹ پر ڈالے بغیر وہ بے نیازی سے مزار اقدس کے بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

حق ہو کی صدائیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میں جو اس انتظار میں تھا کہ جیسے ہی وہ نام نہاد ملنگ ہزار کا نوٹ پکڑے گا تو میں اس ڈھونگی کا گریبان پکڑ لوں گا اور دو چار گھونسے لگا کر اس کی ساری فقیری نکال دوں گا۔ بلکہ دو چار اس کی تصویریں اخبار میں لگاؤں گا اور میڈیا کے حوالے اُسے کروں گا۔ تاکہ عوام الناس ان فراڈ لوگوں کا اصل و مکروہ چہرہ دیکھ سکیں۔ مگر اس بات کی تو نوبت ہی نہ آئی تھی۔ وہ بے نیازی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا اور میں حیرت و خاموشی میں مبتلا کھڑا تھا۔ ابھی اُس پُراسرار بچے کا معمہ حل نہیں ہوا تھا کہ ملنگ مزید حیرتوں میں دھکیل گیا تھا۔

یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟'' بس امی کی توجہ جانے کی دیر تھی کہ وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئیں۔

''ارے امی کچھ نہیں ہے...... آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔'' میں نے اُن کا دھیان ہٹانا چاہا پہلے وہ بچہ' پھر خط اور اب یہ ملنگ امی کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُن کے علم میں آنے کی دیر تھی کہ آج رات آفس ٹور کی طرف سے مظفر آباد کے لیے نکلنے والا ہوں تو انہوں نے ضد باندھ لی کہ کسی صورت نہیں جانا' مگر میرا جانا اشد ضروری تھا۔ میں انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ ان ساری باتوں کو نیک و پاک ہستی کی طرف سے 'غیبی اشارہ' قرار دے رہی تھیں۔

آخر مجھے مجبوراً نکلنا پڑا تھا جانتا تھا کہ وہ مجھ سے سخت ناراض ہوں گی مگر میں نے ارادہ باندھ لیا تھا کہ واپسی پر انہیں ضرور منا لوں گا۔ دورانِ سفر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ سفر کوئی عام سفر نہیں ہے۔ ابھی سفر کا آغاز کیا ہی تھا کہ اچانک سے بس خراب ہو گئی۔

اللہ اللہ کر کے خرابی دور ہوئی تو وہ اسٹارٹ ہوئی۔ دورانِ سفر مختلف نوعیت کے واقعات پیش آتے رہے۔ کبھی ہماری بس کے سامنے روشنی و نور کے 'سفید ہیولے' کا آنا' کبھی ونڈ اسکرین کے آگے سفید چادر پھیلا دی جاتی کہ ڈرائیور بس روکنے پر مجبور ہو جاتا۔ اسلام آباد کی حدود میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب و غریب واقعے نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ہماری بس کے سامنے ایک عورت آ گئی ڈرائیور نے بروقت بریک لگائی تھی۔ قریب آنے پر انکشاف ہوا کہ وہ میری امی تھیں۔

''بیٹا واپس آ جاؤ' اس سفر میں خیر نہیں۔'' لمحہ بھر کے لیے مجھے لگا کہ میں پھر کوئی خواب دیکھ بیٹھا ہوں۔ تصدیق کے لیے فون کیا تو معلوم ہوا وہ لاہور میں ہی تھیں۔ البتہ میرے حوالے سے کافی پریشان تھیں وہ مجھے بار بار واپس آنے کا کہہ رہی تھیں نا جانے وہ عورت کون تھی جو ہو بہو امی کی ہم شکل تھی۔

ہماری منزل مظفر آباد تھی۔ کوشش تھی کہ سحری سے پہلے وہاں پہنچ جائیں کیونکہ رمضان کا مہینہ تھا۔ مگر یوں لگ رہا تھا کہ قدرت کو یہ سفر منظور ہی نہ تھا۔ بس دو تین جھٹکوں کے بعد رک گئی۔ بظاہر کوئی خرابی معلوم نہ ہوئی۔ ڈرائیور کے بقول اُس نے کچھ دیر پہلے ایک سفید باریش بزرگ کو بس کے آگے آتے دیکھا۔ جنہوں نے دائیں ہاتھ کو فضاء میں بلند کرتے

ہوئے بس رُکنے کا اشارہ کیا تھا۔ بس پھر اُس کے بعد بس نے چلنے کا نام نہ لیا۔

مجبوراً ہمیں اسلام آباد کی جامعہ مسجد میں قیام کرنا پڑا۔ یہاں کے امام صاحب کے ہمارے ٹیم کے ہیڈ سے اچھے تعلقات تھے۔

18 اکتوبر 2005 (رمضان المبارک)

دل کے گوشوں میں رینگتی عجیب سی بے چینی مجھے سفری تھکاوٹ کے باوجود سونے نہیں دے رہی تھی۔ میرے ساتھی روزہ رکھ کر سو چکے تھے۔ بے چینی حد سے بڑھی تو میں مسجد کے کشادہ صحن میں آ گیا۔ جہاں چند نمازی محو عبادت تھے۔ وقت گزاری کے لیے میں نے اپنا کیمرہ نکال لیا ابھی مسجد کی خوبصورتی کی چند تصاویر ہی لی تھیں کہ کیمرے کی 'ریڈ لائٹ الرٹ' نے مسجد میں کسی اَن دیکھے وجود کی موجودگی کا اشارہ دیا۔ 'تشہد' کے انداز میں بیٹھا وہ روشنی و نور کا پیکر غرق عبادت تھا۔ نظر سے اوجھل مگر کیمرے کی آنکھ سے دکھائی دے رہا تھا۔

''آگے جانے کا ارادہ ترک کر دو۔'' میں جو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس 'وجود' کی تصاویر لے رہا تھا۔ اُس کے منہ سے یہ بات سن کر دنگ رہ گیا۔

میں اسے نہیں جانتا تھا مگر وہ 'ہستی' واقف تھی کہ میں سفر پر جا رہا ہوں۔ میرا ارادہ مظفر آباد جانے کا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ 'ہیولہ' ہوا میں یوں تحلیل ہو گیا کہ جیسے وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اُس وجود کو بیسیوں بار 'ویڈیو' میں دیکھتے دیکھتے میں نیند کے ہاتھوں مغلوب ہو گیا۔ مجھے پھر ایک خواب نظر آیا تھا۔

''ایک دراز قامت شخص...... درازی قامت کا یہ عالم تھا کہ اُس کا سر آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ کھڑا زمین پر تھا مگر فضاء میں معلق نظر آ رہا تھا۔ انگشت شہادت سے وہ جس پہاڑ کی طرف اشارہ کرتا۔ پہاڑ یوں ریزہ ریزہ ہو جاتا کہ جیسے عزرائیلؑ تازیانہ اجل ہاتھوں میں لیے دیوہیکل نما پہاڑوں کو مار رہے ہیں۔ وہ یوں بھر بھرے ہو کر زمین بوس ہو رہے تھے کہ جیسے مٹی کی کچی ڈھیریاں...... زمینی میخوں (پہاڑوں) کے اپنی جگہ سے ہلنے کی دیر تھی کہ زمین جیسے لرزنے لگی۔

میرا ہر خواب سچا ہو گیا تھا پاکستان کی سرزمین پر ایسا زلزلہ آیا کہ تباہی نے پورے ملک و ہلا ڈالا۔ اس کا مرکز مظفر آباد اور اس کے گرد و نواح تھے۔ زلزلے کے جھٹکوں سے میری آنکھ کھلی تو پوری مسجد جھول رہی تھی۔ ہر شے لرز رہی تھی پھر دلدوز چیخوں کا وہ طوفان اٹھا جو ہر سماعت نے سنا۔

مظفر آباد میں جہاں ہمارا قیام ہوتا تھا وہ میرے دوست کا گھر تھا جس کا پورے کا پورا خاندان لقمہ اجل بن گیا۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو......؟

آج بھی اس سارے واقعے کے بارے میں سوچتا ہوں تو 'قلبِ منکر' یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ خط والا بچہ' وہ ملنگ' مظفر آباد کے راستے میں پیش آنے والے اسرار بھرے واقعات کسی 'روحانی ہستی' کے فیض کا حصار تھا۔ میری زندگی کے گرد وہ روحانی ہستیاں جن کے وجود کا انکاری ہمیشہ میرا دل و دماغ رہا تھا۔ سوچ نے ان ہستیوں کے ماننے والوں کو ہمیشہ 'بدعقیدہ' قرار دیا۔ مگر اب...... نہ صرف میرے دل نے ان ہستیوں کے وجود' کرامات اور روحانی فیض کو مان لیا ہے بلکہ تسلیم کر لیا ہے کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے باوجود ان کے فیوض و برکات بحکم الٰہی جاری اور ساری ہیں۔

آج یہ بات کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میری زندگی کا چراغ اسی 'نورِ فیض' کی وجہ سے روشن ہے۔

امام ابوحنیفہ ایک شخص سے مناظرہ

ہر طرف نور ہے، ہر سمت ہے جلوہ تیرا
پھر بھی اے پردہ نشیں! کیوں ہے یہ پردہ تیرا

عبدالغفار عابد

اللہ کو نہ ماننے والے شخص کا امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ سے سوال کہ اللہ کہاں ہے ثابت کر کے دکھاؤ امام صاحب کی ایسی دلیل کہ عقل حیران رہ جائے۔

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ کا واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں مہدی جو ایک خلیفہ تھا اس کے دربار میں ایک شخص آیا جو اللہ کی ذات سے انکار کرتا تھا اس کو اپنے علم پر بہت فخر تھا اس نے خلیفہ مہدی کے دربار میں حاضر ہو کر کہا۔

''میں نہیں مانتا کہ اللہ موجود ہے یہ کائنات طبعی رفتار سے خود بخود بنی ہے اور خود ہی چل رہی ہے لوگ مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ یہ دنیا طبعی کارخانہ ہے کوئی بھی اس کا بنانے والا نہیں۔'' یہ اس شخص کا دعویٰ تھا اس کا پیغام تھا کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اس کو میرے مقابلے میں لایا جائے تاکہ میں اس سے بحث کروں اور جو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں اپنی طاقتوں کو فضول ایک غیبی طاقت کے حوالے کر دیا ہے۔ جو سارے جہاں کو چلا رہی ہے میں ثابت کر کے دکھاؤں گا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اگر مسلمانوں میں کوئی اپنے آپ کو بڑا عالم سمجھتا ہے تو اسے میرے سامنے لایا جائے بار جیت خلیفہ کے دربار میں ہوگی۔

اس زمانے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے عالم امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تھے مہدی نے آپ سرکار کے پاس اپنا ایک آدمی بھیجا رات کا وقت تھا خلیفہ مہدی اکثر اپنا دربار رات کو ہی لگاتے تھے آدمی بھیجا گیا کہ آپ سرکار آ کر اس شخص سے بحث کریں اور اس کو سمجھائیں تاکہ اس شخص کو راہِ راست پر لایا جائے وہ آدمی امام صاحب رحمتہ اللہ کے پاس پہنچا اور بغداد کی ایک طرف دریا بہتا تھا جسے لوگ دجلہ کہتے ہیں اس دریا کی ایک طرف محلات تھے اور ایک طرف شہر آباد تھا امام ابوحنیفہ دوسری طرف شہر میں رہتے تھے خلیفہ کے دربار میں دریا پار کر کے آنا پڑتا تھا پیغام دینے والے آدمی نے کہا کہ اصل میں خلیفہ کے دربار میں ایک شخص آیا ہے اور وہ دعویٰ کر رہا ہے کہ خدا کوئی وجود نہیں یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے آپ کو مناظرے کے لیے بلایا ہے خلیفہ خود ان کی باتوں سے پریشان ہے کیونکہ اس کا دعویٰ ہی عجیب و غریب ہے دربار میں بیٹھے سارے لوگ اس کی وضاحت چاہتے ہیں۔

امام صاحب رحمتہ اللہ نے فرمایا۔

''اچھا ٹھیک ہے آپ جا کر کہہ دیں کہ میں آ رہا ہوں۔'' وہ آدمی واپس چلا گیا اس نے آ کر کہا۔

''میں نے امام صاحب کو خبر کر دی ہے وہ تھوڑی دیر میں دربار میں حاضر ہو جائیں گے۔'' دربار لگا ہوا تھا خلیفہ امراء وزراء سب بیٹھے ہوئے تھے وہ شخص بھی بیٹھا ہوا تھا امام صاحب کا انتظار ہو رہا تھا امام صاحب کا انتظار کرتے کرتے رات کے بارہ بج گئے مگر امام صاحب نہیں آئے سب لوگ خاموش بیٹھے تھے دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا خلیفہ خود اس سوچ میں تھے کہ اب اس شخص سے کیسے نمٹا جائے رات کا ایک بجنے والا تھا وہ شخص بولا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب ڈر گئے ہیں اور سمجھ گئے ہوں گے کہ کوئی بڑا فلسفی آیا ہوگا۔ میں اس سے نہیں نمٹ سکوں گا اس لیے امام صاحب گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے آپ یقین کریں وہ نہیں آئیں گے میرے مقابلے میں کوئی نہیں آ سکتا پہلے بھی میں نے بہت سے لوگوں کو لاجواب کیا ہے یہ خبر ضرور آپ کے امام صاحب تک پہنچی ہوگی اس لیے وہ ڈر گئے ہیں اس آدمی کی باتیں سن کر خلیفہ پریشان اور درباری بھی حیران تھے وہ شخص مسلسل باتیں کر کے شوخی دکھا رہا تھا۔ جب رات کا ایک بجا تو امام صاحب بھی آ پہنچے۔ دربار میں حاضر ہوئے آپ کے احترام میں خلیفہ سمیت سب درباری اٹھ کھڑے ہوئے جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو خلیفہ نے امام صاحب سے پوچھا۔

''آپ اتنی دیر میں کیوں آئے آدمی رات آٹھ بجے بھیجا گیا تھا اور اب رات کا ایک بج گیا ہے آخر اتنی تاخیر کی کیا وجہ پیش آئی شاہی حکم تھا اس کی

تکمیل جلد ہونی چاہیے تھی نا کہ اتنی دیر لگا دی جاتی۔'' امام صاحب نے کہا۔

''میں دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں دیر میری سستی یا لاپروائی کی وجہ سے نہیں ہوئی ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے دیر ہوگئی آپ یقین کریں عمر بھر میں نے ایسا واقعہ نہیں دیکھا تھا۔''

''میں حیران ہوں کیا واقعہ پیش آیا۔'' آپ نے یہ قصہ کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ سارا دربار حیران ہوگیا کہ آخر حادثہ کیا پیش آیا۔ فرمایا۔

''بس عجیب و غریب ہی واقعہ تھا اور خود مجھے بھی ابھی تک یہ واقعہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا واقعہ تھا اور قصہ کیا تھا۔'' سب کے سب درباری سرتاپا شوق بن گئے۔ حتیٰ کہ خود خلیفہ نے کہا۔

''فرمایئے واقعہ کیا پیش آیا؟'' آپ رحمتہ اللہ نے فرمایا۔

''واقعہ یہ پیش آیا جب میں شاہی محل کی طرف آنے کے لیے دریا کے کنارے پہنچا تو رات کافی ہو چکی تھی۔ وہاں نہ کوئی ملاح تھا اور نہ کوئی کشتی تھی آنے کا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ میں حیران تھا کہ دریا کو کس طرح پار کروں گا اسی سوچ میں کھڑا تھا کہ میں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود لکڑی کے نہایت عمدہ تختے نکلنا شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آ رہے تھے۔ میں حیرت سے یہ کچھ دیکھ رہا تھا میں حیران تھا یا اللہ دریا سے موتی نکل سکتے ہیں مچھلی نکل سکتی ہے مگر یہ بنے بنائے لکڑی کے تختے کہاں سے آ گئے۔''

''ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تختے خود بخود جڑنے شروع ہو گئے جڑتے جڑتے کشتی کی صورت بن گئی میں نے کہا یا اللہ یہ کس طرح سے کشتی بن گئی آخر لکڑی کے تختوں کو کون جوڑ رہا ہے۔ اوپر نیچے خود بخود تختے لگتے گئے۔ ابھی میں اس حیرت میں تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے کی کیلیں نکلنا شروع ہو گئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھکنے لگیں اور جڑتے جڑتے ایک بہترین قسم کی کشتی بن گئی میں حیرت میں گم تھا کہ یہ کیا ماجرہ ہے...... جڑے ہوئے تختوں کے سوراخوں سے پانی اندر آ رہا تھا پھر وہ سوراخ بھی خود بخود بھر گئے ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھتی ہوئی آئی اور کنارے پر آ کے اسے جھک گئی کہ گویا مجھے سوار کرنا چاہتی ہو۔''

''اللہ کے نیک بزرگ ولی اللہ صوفی دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ تنہا ہوتے ہیں بعض صوفیائے کرام نے تو پوری زندگی عالم تنہائی میں گزار دی مگر وہ کبھی دلبرداشتہ نہیں ہوئے اور آخری سانس تک بھرپور ذوق و شوق اور توانائی کے ساتھ زندہ رہے اہل دنیا انہیں تنہا سمجھتے ہیں مگر حقیقتاً وہ تنہا نہیں ہوتے تھے اللہ کے محبوب بزرگ کسی تاریک غار میں ہو یا خانقاہ کے کسی سنسان گوشے میں جب وہ ذکر الٰہی کرتا ہے تو تنہا نہیں ہوتا۔

حق تعالیٰ کی ذات اقدس اس کے قریب ہوتی ہے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اگر ذکر الٰہی کا عملی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ جب اللہ کا ولی' بزرگ ذکر کرتا ہے تو گویا اپنی تنہائی کو دور کرتا ہے صوفیا و بعض گرو جب بلند آواز سے اللہ کو پکارتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق سے ہمکلام ہیں اور جب کوئی انسان کسی دوسری ذات سے ہم کلام ہوتا ہے تو پھر اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے بزرگان دین کی عبارت اللہ کو پسند ہوتی ہے اس عبادت کے صدقے اللہ ان کی ہر مشکل کو آسان فرما دیتا ہے۔

''میں کشتی میں بیٹھ گیا کشتی پانی کے مخالف رخ کی طرف چل رہی تھی کیونکہ شاہی محل اِدھر کو ہے میں حیران تھا کہ یا اللہ اس کشتی کو پانی کے مخالف سمت کون لے کر جا رہا ہے کشتی اپنی مخصوص رفتار میں آگے بڑھ رہی تھی یہاں تک کہ وہ شاہی محل کے سامنے آ کر رک گئی تاکہ میں اتر جاؤں میں کشتی سے اتر گیا پھر وہ کشتی دیکھتے ہی دیکھتے غائب بھی ہو گئی میں اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک سوچتا رہا کہ یہ کیا ماجرا تھا دیر سے پہنچنے کی بس یہی ایک وجہ تھی میں امیر المومنین سے معافی چاہتا ہوں کہ مجھے آٹھ بجے بلایا گیا تھا اور رات کے ایک بجے پہنچا ہوں۔''

یہ ساری باتیں سن کر وہ شخص بولا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ امام صاحب بہت بڑے عالم' دانشمند اور مفکر ہیں آپ کو دربار میں بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ میرا مقابلہ کسی بڑے دانشمند سے ہو شاید میں نے غلط سنا ہوگا۔ آپ تو بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ پانی میں سے خود بخود تختے نکل آئیں خود بخود جڑنے لگ جائیں اور خود ہی کلیلیں لگ جائیں اور خود ہی رنگ و روغن ہو کر کشتی تیار ہو جائے اور پھر آپ کو سوار کر کے شاہی محل پہنچا دیں بھلا یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے۔'' امام صاحب خاموشی سے اس شخص کی باتیں سن رہے تھے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ پہلے یہ آدمی اپنی بات مکمل کر لے میں پھر اس کا جواب دوں۔

''میں سمجھا تھا آپ دانشمند' مفکر ہیں امام آپ کا لقب ہے آپ تو بچوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں خود بخود کشتی بن گئی کوئی کیلیں لگانے والا نہیں خود بخود کیلیں لگ گئیں کوئی رنگ کرنے والا نہیں اور کوئی روں بھرنے والا نہیں یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا۔ کوئی چلانے والا ملاح نہیں خود بخود کشتی چلنے لگی کوئی سمجھانے والا نہیں کشتی خود ہی سمجھ گئی کہ میں نے شاہی محل جانا ہے۔ امام صاحب یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کیا؟ یہ سب قصے کہانیاں لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی ہیں جو میں پہلے بھی سن چکا ہوں حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے یہ ہی سچ ہے کہ یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے رات کافی گزر چکی ہے خلیفہ اور دربار میں بیٹھے لوگوں کا مزید وقت ضائع نہ کریں اپنی ہار تسلیم کر لیں تاکہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔'' خلیفہ سمیت سب درباری امام ابوحنیفہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

امام صاحب مسکرائے اور فرمایا۔

''اچھا یہ بات نادانی اور بے وقوفی کی ہے؟'' اس شخص نے کہا۔

''جی ہاں......'' آپ نے فرمایا۔

''ایک کشتی بغیر بنانے والے کے بن نہیں سکتی بغیر چلانے والے کے چل نہیں سکتی بغیر کیلیں ٹھوکنے والے سے کیلیں لگ نہیں سکتیں اور اتنا بڑا جہاں جس کی چھت آسمان ہے اور اس کا فرش زمین ہے جس کی فضا میں لاکھوں جانور ہیں کیا یہ خود بخود بن گیا اور کیا یہ سب کچھ خود چل رہا ہے۔ سورج اور چاند خود بخود طلوع اور غروب ہو رہے ہیں یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے ایک معمولی کشتی بغیر انسان کے بن نہیں سکتی تو اتنا بڑا جہاں خود بخود بن جائے تمہاری عقل بچوں جیسی ہے یا پھر میری میں ناداں ہوں یا تم ناداں ہو۔'' امام صاحب نے ایسی دلیل پیش کی کہ اس آدمی کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ اپنی ہار تسلیم کر کے سر جھکائے دربار سے باہر نکل گیا۔ اب وہ کیا بحث کرتا جو اس کی بنیاد تھی وہ ساری کی ساری ختم ہو گئی۔

جسے راستہ مل گیا

معجزے آج بھی ہوتے ہیں' انسان کا
درست راستے پر آجانا بھی تو معجزہ ہی ہے.....

کوثر اسلام صوابی

جیسے ہی میں گاؤں میں داخل ہوا پورے گاؤں پر سوگواریت چھائی ہوئی تھی۔ ہر شخص کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ شہر سے میں ایک مہینے کے بعد گھر آتا اس لیے مجھے علم نہیں تھا کہ گاؤں میں کیا ہوگیا ہے۔ ایک معمر شخص سے میں نے سلام کے بعد پوچھا۔

''چاچا..... کیا ہوگیا ہے..... پورا گاؤں قبرستان کی طرف جارہا ہے؟''

''مجھے پتا نہیں پتر.....''

''نہیں چاچا..... میں ابھی شہر سے آیا ہوں۔''

''پتر..... ہم یتیم ہوگئے..... بابا جی کا انتقال ہوگیا ہے۔'' یہ کہتے ہی معمر شخص کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھک گئے۔ میں نے بے یقینی کی سی کیفیت سے انہیں دیکھا انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''کچھ دیر بعد ان کا جنازہ ہے۔ سارے لوگ جنازہ گاہ کی طرف جارہے ہیں۔'' بابا جی کی موت کی خبر سن کر میں سکتے کی سی کیفیت میں آ گیا۔ بابا جی کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے کسی کو معلوم نہیں تھا پورا گاؤں ان کا عقیدت مند تھا۔ وہ بابا عبدالسلام کے مزار کے مجاور تھے۔ دور دور سے لوگ آتے اور فیض یاب ہوکر جاتے۔ میں نے خود ایسے کئی لوگ دیکھے تھے جو آخری سانسیں لے رہے تھے۔

مگر جب انہیں بابا جی کے پاس لایا گیا تو ان کے نظر کرم سے اللہ نے انہیں شفا دی اور وہ اپنے پیروں پر واپس چلے گئے۔

جنازے کے بعد جیسے ہی بابا جی سپرد خاک ہوئے جانے کہاں سے آوارہ بدلیوں کے ٹکڑے گھومتے گھامتے آئے اور آناً فاناً پورے آکاش پر پھیل گئے۔ سورج کرنوں کی فوج سمیت پسپا ہوگیا بادل یوں برس رہے تھے جیسے محبوب کی جدائی پر عاشق کے ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے اور اُس کی آنکھیں بے اختیار آنسو بہانے لگے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان بھی بابا جی کی موت پر افسردہ ہو۔

قبرستان سے تھوڑے سے فاصلے پر بابا عبدالسلام کا مزار تھا۔ مزار کے احاطے میں دائیں جانب مجاوروں کے کمرے تھے۔ میں مزار میں داخل ہوگیا اور کمروں سے ہوتا ہوا بڑے صاحب کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

بڑے صاحب مزار کے سب سے پرانے مجاور تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے ماں باپ کی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے منت مانی تھی کہ اگر ان کی اولاد ہوئی تو پہلا بیٹا وہ بابا کے مزار کے لیے وقف کریں گے۔

اور پھر بڑے صاحب پیدا ہوگئے۔ ان کا اصل نام دین محمد ہے ان کو پانچ سال کی عمر میں یہاں لایا گیا اور تب سے وہ یہاں ہیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔ تو بڑے صاحب بھی بھیگ گئے تھے۔ وہ بہت محبت سے ملے اور کہا۔

''بیٹے..... میں ذرا کپڑے تبدیل کرکے آتا ہوں تم یہیں بیٹھے رہو۔'' وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے چلے گئے اس دوران خادم چائے کے لیے کیتلی چولہے پر چڑھا چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑے صاحب واپس آئے۔ مجھ سے ہمیشہ شفقت سے پیش آتے۔ گفتگو شروع ہوئی تو موضوع بابا جی ہی تھے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھا۔

''بڑے صاحب..... مجھے بابا کے متعلق جاننے کا بڑا شوق ہے دراصل میں ان کی کہانی ڈائجسٹ میں شائع کرنا چاہتا ہوں کیا آپ میری مدد کریں گے۔'' بڑے صاحب کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر سر ہلا کر بولے۔

''ضرور..... ضرور.....'' خادم چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بڑے صاحب اپنے خیالات جمع کرنے کے بعد بولے۔

''بابا جی کا اصل نام رفیق احمد تھا۔ وہ امریکہ میں زیر تعلیم تھے جب انہیں باپ کی بیماری کا علم ہوا وہ بھاگم بھاگ وطن واپس آئے۔ اکلوتے بیٹے تھے باپ کے علاج کے لیے ہر ممکن کوشش کی مگر وہ جانبر نہ ہوسکے۔ ان کے والد کا بہت بڑا کاروبار تھا۔

اب وہ اس کے اکیلے وارث تھے چند دنوں تک وہ گم صم رہے مگر پھر رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگے۔ اُن کے والد کی پرسنل سیکریٹری شائلہ بہت ذہین لڑکی تھی۔ گھر آکر دو رفیق سے ملی اور کہا۔

''موت ایک حقیقت ہے اس راستے ہر شخص نے جانا ہے ہمارے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں اگر اپنوں کی موت کی وجہ سے ہم اس سے منہ موڑ لیں تو یہ اچھی بات تو نہیں۔''

''ہاں..... میں سمجھ رہا ہوں۔''

''تو پھر کل سے دفتر آیا کریں مصروف رہیں گے تو غم بھی ہلکا ہو جائے گا اور کام بھی چلتا رہے گا۔''

رفیق کو اس کی بات اچھی لگی۔ اگلے دن سے اس نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ شائلہ نے اس کی بہت مدد کی اور وہ شائلہ کی محنت، لگن محبت اور خلوص کا قائل ہو گیا۔

رفیق کے والد جب بیمار تھے تو اس کے چچا نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ علاج معالجے میں وہ پیش پیش رہے۔ والد کی وفات کے بعد کئی ذمہ داریاں انہوں نے سنبھال لیں جس سے رفیق کو آسانی ہو گئی۔ ایک دن اس نے چچا سے کہا۔

''چاچو..... ہم اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہیں آپ ایسا کریں یہاں منتقل ہو جائیں امی پاپا کی وفات کے بعد بیمار رہنے لگی ہیں۔ چچی ان کے ساتھ ہوں گی تو ان کا دل بہلا رہے گا۔''

چچا نے کچھ پس وپیش کے بعد اس کی بات مان لی اس کے چچا کا بیٹا نجم الحسن بہت بداخلاق اور مغرور تھا۔

رفیق کو وہ بالکل بھی پسند نہ آیا مگر چچا کی وجہ سے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

چچا کی وجہ سے رفیق کو بہت آسانی ہو گئی تھی اب اس کا زیادہ تر وقت شائلہ کے ساتھ گزرتا۔ کبھی شاپنگ ہوتی تھی تو کبھی کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کبھی لانگ ڈرائیو تو کبھی پکنک.....

جب شائلہ کی طرف سے رشتے کا اصرار بڑھا تو اس نے اپنی امی سے بات کر لی۔ اس کی ماں راضی ہو گئی۔ مگر تقدیر کے کھیل نرالے ہیں۔ تین دن کے بعد اس کی ماں پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اس کے باپ کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔

ماں کی موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اس دوران اس کے چچا نے اس سے کئی کاغذات پر دستخط لیے۔ رفیق نے یہ تک نہ پوچھا کہ یہ کیا ہے کس چیز کے کاغذات ہیں۔

وقت بڑے سے بڑے زخم کو بھر دیتا ہے۔ رفیق ایک مہینے بعد اپنے دفتر گیا۔ تو گارڈ نے اسے دروازے پر روک لیا رفیق نے کہا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''صاحب کا یہی حکم ہے۔'' گارڈ نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''کون صاحب..... یہاں کا مالک تو میں ہوں۔''

''آپ ہیں نہیں..... تھے۔''

''کیا مطلب..... تھے؟''

''مطلب تو آپ کو صاحب سمجھا دیں گے۔''

اتنے میں اس کے چچا باہر آئے تو رفیق نے کہا۔

''چچا یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' انہوں نے مختصر کہا۔

رفیق ان کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے تک گیا انہوں نے الماری سے کچھ کاغذات نکال کر کہا۔

''آپ کے والد نے مجھ سے بہت بڑی رقم لی تھی۔ جسے وہ لوٹا نہ سکے اور فوت ہو گئے۔ اپنی رقم کے عوض میں نے کاروبار اور بنگلہ اپنے نام کروالیا ہے یہ اس کے کاغذات ہیں تم چاہو تو میں تمہیں یہاں ملازمت دے سکتا ہوں نہ چاہو تو تمہاری مرضی.....'' رفیق پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اس کے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ وہ تھکا تھکا وہاں سے نکلا اور قریبی کافی ہاؤس کی طرف جانے لگا۔ جب بھی وہ تھکا ہوتا تو یہاں آتا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو نجم الحسن وہاں سے نکل رہا تھا۔ شائلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ رفیق انہیں دیکھ کر مسکرایا اور شائلہ سے پوچھا۔

کیا ہو رہا ہے جی۔''

''کون ہیں آپ..... معاف کیجیے گا میں نے پہچانا نہیں۔'' شائلہ نے حیران ہونے کی اداکاری کی جبکہ نجم الحسن کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا مطلب شائلہ..... یہ کیسا مذاق ہے۔''

رفیق نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مسٹر..... تعلق بنانے کا یہ بھونڈا طریقہ پرانا ہو چکا ہے۔ اب اگر ایک لفظ بھی کہا تو میں پولیس کو بلا لوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے نجم الحسن کی بانہوں میں بانہیں ڈالیں اور کہا۔

''چلو ڈارلنگ..... روز کوئی نہ کوئی لفنگا منہ اٹھا کر آتا ہے بے شرم کہیں کے۔'' وہ دونوں چلے گئے اور رفیق انہیں دیکھتا رہ گیا۔ رفیق انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر آیا اور چچی کے پاس گیا۔ وہ اسے ماں کا درجہ دیتا تھا۔ مگر چچی کے تو تیور ہی اور تھے۔

اس نے اسے گھر سے نکلنے کا کہا کہ اب اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ رفیق پر پے در پے صدمات برداشت نہ کر سکا۔ اور نیم دیوانگی کے عالم میں وہاں سے نکلا۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ جگہ جگہ گھومتا رہتا۔

ایسی ہی ایک طوفانی رات تھی۔ بابا عبدالسلام کے مرید بابا عبدالبصیر آئے ہوئے تھے۔ وہ سال میں ایک دو بار حاضر ہوئے۔ رفیق بارش میں بھیگا ہوا اندر آیا۔ تو بابا عبدالبصیر نے اسے اپنے پاس بلایا۔

اس کے دل پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر اللہ ہو کا نعرہ لگایا۔ رفیق یوں چونکا جیسے ہوش میں آیا ہو۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بابا عبدالبصیر نے اسے اپنے ساتھ لپٹایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''نہ رو..... میرے بیٹے..... نہ رو..... یہ دنیا تو ہے ہی دھوکے باز جھوٹی اور مطلبی۔'' رفیق نے سر اٹھایا تو بابا جی نے مزید کہا۔

''بیٹے دنیا کی محبتیں جھوٹی ہیں۔ اللہ کی محبت سچی ہے اب اللہ سے لو لگاؤ۔'' رفیق نے یہ سن کر سر ہلایا۔

اس دن کے بعد رفیق کی دنیا بدل گئی۔ وہ دن رات عبادت کرنے لگے۔ اللہ کی محبت میں اس نے خود کو فنا کر دیا پھر اس کی ڈیوٹی لگی اور وہ مخلوق خدا کی مدد کرنے لگے۔ اسے دست شفا حاصل تھا کسی سے ایک روپیہ تک نہیں لیا۔

''بیٹے..... یہ ہے بابا جی کی کہانی۔''

میں گھر آیا تو بابا جی کی عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی کہانی قلم بند کی۔ کل انشاء اللہ اسے ڈائجسٹ کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔

سچی کہانیاں کے مصنف کے قلم کا جادو، بھکر سے ارسال کردہ لازوال تجربوں کی داستان

نگر نگر پھرا بنجارہ

23 دن کے بعد ایک دوسرے بڑے آفیسر کو ذمہ داری دی گئی کہ میری زبان کھلوائی جائے ان کا رویہ مناسب تھا۔ میں نے انہیں گوش گزار کیا کہ ابھی تک مجھ سے تفصیلی بیان نہیں لیا گیا......

ملازم حسین شیرازی

کراچی سے بسلسلہ کاروبار ایران پھر یورپ سفر درپیش تھا۔ پہلی قسط میں کراچی سے گوادر کا حال ماہِ جنوری کے شمارے میں بیان کیا تھا گوادر پہنچ کر اب ایران کی تیاری تھی۔ لیکن یہ روئیداد بیان کرنے سے بیشتر چاہوں گا کہ بر سبیل تذکرہ انڈیا پاکستان چپقلش کے بارے میں مختصراً لکھوں۔ آج کل چونکہ انڈیا اپنی پرانی روش کے مطابق پاکستان کے لیے خطرہ بن چکا ہے۔ 1947ء سے اب تک تین جنگیں لڑ چکا ہے اب چوتھی جنگ مسلط کرنا چاہتا ہے تیسری جنگ 1971ء کے تناظر میں مختصراً گزرے ایام کے مصائب و آلام کا ذکر کروں یہ 1971ء کی جنگ سے منسلک واقعہ جو اپنے قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں میں اپنے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں خاکسار تحریک سے وابستہ تھا اس وقت تحریک کا بڑا نام تھا۔

بین الاقوامی طور پر اس کی شناخت تھی۔ مذکورہ تحریک کے قائد علامہ عنایت اللہ المشرقی تھے۔ جو آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ نے اپنے تعلیمی کیڈر میں اعلیٰ ترین ڈگریاں اور اعزازات حاصل کیے ریاضی میں تین سالہ کورس دو سال میں مکمل کیا تھا اور صدیوں سے قائم شدہ یونیورسٹی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ انہیں اس سلسلے میں رینگلر، اسکالر کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

اس زمانے کے مشہور ترین لیڈران ان سے بہت متاثر تھے۔ جرمنی کے ہٹلر کو ان سے قلبی عقیدت تھی۔ اس نے اپنی پارٹی نازی ازم کا نشان خاکسار تحریک کے بیلچہ نشان کی تقلید میں رکھا تھا۔ علامہ صاحب سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور تحریک کے اغراض و مقاصد اور نصب الدین سے بہت متاثر تھے۔

میں تحریک کا صوبہ سرحد میں سالار تبلیغ اور ناظم نشر و اشاعت تھا۔ ہر ماہ تحریک کے ہفتہ روزہ ترجمان الاصلاح 18.B شاہ عالم مارکیٹ لاہور بسلسلہ ماہانہ کارگزاری اور حال احوال سے روشناس کرنے جانا ہوتا تھا۔ مذکورہ آفس میں ریٹائرڈ سیشن جج سرفراز احمد، شورش کشمیری (چٹان اخبار) نوابزادہ نصر اللہ خان (پی ڈی پی) مولانا کوثر نیازی (شہاب

اخبار) اور دیگر معزز شخصیات سے خوشگوار ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس دور میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان (جواب صدارت سے سبکدوش ہو چکے تھے) سے ریحانہ گاؤں ضلع ہزارہ میں اور ایئر مارشل اصغر خان (تحریک استقلال) سے ایبٹ آباد میں انٹرویوز لیے تھے وہ جوانی کے بھرپور ایام تھے ادبی لحاظ سے زندگی کا آغاز تھا۔

کیسے گزر گئی ہے جوانی نہ پوچھیے
میری کہانی میری زبانی نہ پوچھیے

حسب سابق پروگرام کے مطابق لاہور گیا۔ سارا دن تحریک کے دفتر میں باہمی امور پر صلاح مشورے ہوتے رہے۔ تحریکی رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ شام کے وقت فارغ ہوا تو خیال آیا کہ اپنے دوست جہانگیر خان سے ملاقات کروں آپ حمایت اسلام لاء کالج کے صدر تھے۔ ان کا قیام کالج مذکور کے ہاسٹل میں تھا۔ ان سے فون پر بات ہوئی انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان سے ملوں رات ہاسٹل میں قیام کروں اور پرانی یادوں کو تازہ کریں۔

شام کے وقت میں نے صفدر سلیمی چیف ایڈیٹر ہفتہ روزہ الاصلاح کو اپنے پروگرام سے متعلق آگاہ کیا ان سے اجازت لے کر ہاسٹل پہنچا چوکیدار کی زبانی پتہ چلا کہ جہانگیر خان ضروری کام سے ملتان گئے ان کی واپسی کل صبح ہوگی۔ وہ آپ کے لیے کمرے کی چابی دے گئے ہیں اور ہدایت دے گئے ہیں کہ میں ان کے کمرے میں قیام کروں۔ اس نے کمرہ کھولا کشادہ کمرہ تھا تین بیڈز تھے کافی تعداد میں کتابیں سلیقے سے رکھی تھیں تھوڑی دیر بعد چوکیدار کھانا لے آیا۔ کھانے کے بعد میں نے تھوڑی دیر کتابوں کی ورق گردانی کی اور پھر حسب عادت جلدی سو گیا۔ رات تقریباً بارہ بجے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ کھولا تو چوکیدار ہمراہ دو نوجوان باہر کھڑے

تھے۔

وہ جہانگیر خان کے واقف کار تھے اور ان سے ملنے اور رات قیام کرنے آئے تھے مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا میں نے خوش آمدید کہا ان کے نام ہاشم اور اشرف تھے ان کا تعلق راولا کوٹ آزاد کشمیر سے تھا تھوڑی بہت گفتگو کرکے ہم سوگئے۔ صبح تقریباً چار بجے دروازے کے پیٹنے کی آوازیں آئیں کوئی زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ دو نوجوان ہڑبڑا کر اٹھ گئے ان کے چہروں سے خوف اور پریشانی عیاں تھی دروازہ کھولا تو چار مسلح جنس کے اہلکار مع اسلحہ کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے ہم تینوں کو گرفتار کرکے چونا منڈی (بدنام زمانہ عقوبت خانہ) لے گئے ہمیں کمرے میں بند کرکے دیگر افسران سے گفت وشنید کرنے لگے۔ وہاں سے ہمیں شاہی قلعہ کے زندان خانے میں بند کردیا۔ میں مسلسل احتجاج کررہا تھا کہ ہمیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے ہمارا کیا قصور ہے۔

لیکن وہ بالکل خاموش تھے بلکہ اپنی خونخوار آنکھیں ہمیں دکھا رہے تھے۔

بعد میں پتہ چلا وہ ہاشم اور اشرف کی تلاش میں تھے جنہوں نے انڈیا کا گنگا نامی جہاز پالم ایئرپورٹ دہلی سے اغواء کیا تھا اور اسے لاہور لاکر آگ لگادی کافی لوگ اس میں جھلس کے مرگئے وہ سارے انڈین تھے۔ انڈیا کے لیے یہ حادثہ ناقابل برداشت تھا وہ اس نقصان پر بہت سیخ پا تھا۔ پاکستان کی بھی سبکی ہورہی تھی۔ ہاشم اشرف کا تعلق مقبول بٹ کی تنظیم کشمیر محاذ آزادی سے تھا وہ دونوں اس تنظیم سے وابستہ تھے۔ بعد ازاں مقبول بٹ (تراٹھل، راولا کوٹ) کو گرفتار کرکے دہلی لایا گیا اور اسے دہلی کی تہاڑ جیل میں پھانسی دی گئی ان دونوں سے تفتیش شروع ہوئی دونوں نے اعتراف کیا جس کی پاداش میں انہیں شوٹ کردیا گیا۔

اب وہ میری طرف متوجہ ہوئے انہیں شک تھا کہ میرا تعلق اس تنظیم سے ہے اور ان کی اس کارروائی میں شریک ہوں۔ مجھے ان کا ماسٹر مائنڈ سمجھا گیا میں نے بہت کوشش کی انہیں یقین دلاؤں کہ میرا اس خونی واردات سے کوئی تعلق نہیں لیکن وہ بار بار سختی سے پوچھ رہے تھے کہ اس میں اور کون ملوث ہیں۔ وہ اب تھرڈ ڈگری کا استعمال کررہے تھے۔ جہاں میں قید تھا وہاں زہریلے بچھوؤں اور خطرناک سانپوں کی بہتات تھی۔ وہ چاہ رہے تھے کہ میں اس راز سے پردہ اٹھاؤں کہ اگلا مشن کیا ہے دوسرے سہولت کار کون ہیں۔ اتنی زیادہ سختی کے باوجود میں کیا بتاتا؟ میرا اس خونی واردات سے کوئی تعلق نہ تھا کیا ایام مصائب اور اذیت ناک دن تھے۔ 23 دن تک تفتیش اور تحقیق ہوتی رہی اس کی تفصیل بتانا میرے لیے ممکن نہیں۔

23 دن کے بعد ایک دوسرے بڑے آفیسر کو ذمہ داری دی گئی کہ میری زبان کھلوائی جائے ان کا رویہ مناسب تھا۔ میں نے انہیں گوش گزار کیا کہ ابھی تک مجھ سے تفصیلی بیان نہیں لیا گیا جو میرا قانونی حق ہے ان کی تحقیق کی جائے اگر اس میں کوئی جھوٹ، غلط بیانی، قصور، جرم نظر آئے تو بے شک مجھے سزا دی جائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مذکورہ رات سے ایک دن قبل میں ڈیرہ سے رات گیارہ بجے روانہ ہوا تھا لاہور کے لیے، بس ڈرائیور، کنڈیکٹر، منشی سے تسلی کرائی جائے۔ الااصلاح کے دفتر میں میری آمد، مصروفیات، معززین سے ملاقاتیں ان سب کے بارے میں معلوم حاصل کی جائیں ایم اے پولیٹیکل سائنس کے حاضری رجسٹر سے میرا ریکارڈ چیک کیا جائے۔

آخر خدا خدا کرکے انہیں یقین آگیا کہ میرا اس کارروائی سے کوئی تعلق نہیں میں بے گناہ ہوں میری

گرفتاری غلط ثابت ہوئی 25 دن کے بعد مجھے بری کردیا گیا۔ میری صحت گر چکی تھی۔ 25 پونڈ وزن کم ہوگیا۔ آٹھ سے دس دن کے لیے مری چلا گیا اپنے آپ کو سنبھالا، پھر مصیبتوں اذیتوں کے بعد اپنے گھر لوٹ گیا۔ میں نے چھپانے کی کوشش کی لیکن گھر والوں کو سب پتہ چل گیا تھا۔

1971ء کی جنگ کے دیگر اسباب میں گنگا جہاز اغواء بھی ایک سبب تھا۔ آج پھر انڈیا چوتھی جنگ کے لیے محاذ کھولے بیٹھا ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستانی عوام اور بہادر فوج ان کے خواب کو چکنا چور کرنے پر ہر دم تیار ہیں اور ماشاء اللہ سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط و مستحکم ہیں انشاء اللہ تعالیٰ.....

☆.....☆.....☆

شروع میں ذکر ہورہا تھا کہ ایران تیاری تھی۔ چونکہ ایران عراق میں جنگ چھڑی تھی (ایران کے لیے پروازیں معطل تھیں مجبوراً بائی روڈ براستہ گوادر روانہ ہونا تھا۔ ویزہ، راہداری، دیگر سفری دستاویزات مکمل تھیں۔ گوادر سے بذریعہ پک اپ دیگر 5 سواریوں کے ہمراہ چاہ بہار روانہ ہوا جس طرح گوادر پاکستان کا ساحلی شہر اور بندرگاہ ہے اسی طرح چاہ بہار ایران کی خوبصورت بندرگاہ ہے۔ میرے ساتھ جو افراد پک اپ میں سوار تھے وہ سب مکرانی تھے اپنے ساتھ گرم مصالحہ جات کالا کولا ہیئر کلر و دیگر پاکستانی مصنوعات جو ایران میں اچھے داموں فروخت ہوتی ہیں لے کر جارہے تھے۔ اسی طرح یہ ایک غیر قانونی تجارت اور اسمگلنگ ہے وہاں سے ایرانی کمبل، کراکری، کٹلری اور دیگر چیزیں درآمد کرتے ہیں مجبوراً مجھے ان کے ہمراہ سفر درپیش تھا۔

پاکستانی آخری سرحد گبد ہے اور ایرانی سرحد رمدان ہے یہ سفر خفیہ راستوں سے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ طے ہوتا ہے چونکہ چاہ بہار جانے والے اکثر بغیر ویزہ جات، راہداری ہوتے ہیں اس لیے غیر قانونی راستے اپناتے ہیں۔ انہیں ایرانی سپاہ پاسداران سے خطرہ ہوتا تھا کہ وہ چھاپہ نہ لیں مجھے کوئی خطرہ نہ تھا کہ میرے پاس سارے دستاویزات قانونی طور پر مکمل تھے اور سامان بھی صحیح تھا اس کے باوجود.....

چاہ بہار کیسے پہنچے وہاں سے ایران شہر بام (جو بعد میں شدید زلزلے سے پورا شہر تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ 80 ہزار معصوم بے گناہ لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے) بزمان، کرمان، کرمان شہر اصفہان اور پھر تہران کس طرح پہنچا۔ مراد بلوچ رسوائے مکران مشہور اور ظالم ڈاکو سے کیسے مڈبھیر ہوئی پاسداران سے کیسے سامنا ہوا، یہ واقعات پھر کسی وقت تحریر کروں گا کہ موجودہ قسط ادھوری نہ رہ جائے۔

تہران پہنچ کر اپنے دوست حسن علی سبزواری سے ملا جن کی ایران میں بہت بڑی تعمیراتی کمپنی تھی۔ انہیں تہران سے اصفہان روڈ کی توسیع کا ٹھیکہ ملا تھا۔ میں نے ان سے گزارش کی تھی اس بڑے ٹھیکے میں مجھے کوئی کام Sublet کریں جس کے لیے میں ایران میں موجود تھا۔ قانونی طور پر میں اس کا اہل نہ تھا کہ میری کمپنی ایران میں رجسٹرڈ نہ تھی۔ دوسرا میں غیر ملکی تھا۔ انہوں نے ذاتی طور پر ازراہ دوستی یہ کام تفویض کیا تھا جن واقعات کا میں ذکر کررہا ہوں ان کا بڑا حصہ کفارہ کے عنوان سے 10/2016 کے شمارے میں کئی کہانیاں میں شائع ہوچکا ہے دوبارہ بیان کررہا ہوں کہ سفرنامے کا تسلسل قائم رہے۔

کام میں دل لگا ہوا تھا..... کبھی سائٹ پر، کبھی شہر میں رہتا دو سال تک مسلسل کام کرتا رہا ایک آدھ دفعہ گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ دو سال بعد ورک مکمل ہوا۔ حسن علی سبزواری کی معرفت نولین تو مان محکمہ شہر بانی

نے ادائیگی کی۔

نوملین یعنی پاکستانی 30 لاکھ روپے اس وقت روپے کی قدر، ایک روپیہ بعوض 3 تومان جبکہ اس وقت پاکستانی روپیہ پچاس ایرانی تومان برابر ہے) پیسوں کی ادائیگی پر پاکستان آنے کی تیاری تھی۔ مہاراجہ ہوٹل تہران میں قیام تھا۔ جمعرات کی شام تہران سے کراچی سیٹ کنفرم تھی۔ گھر والوں کو بتایا کہ جمعرات 9 بجے کراچی پہنچوں گا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ میں ایرانی کمبل، کراکری، کٹلری ودیگر اشیاء لیتا آؤں مجبوراً جمعرات کی سیٹ کینسل کرائی اب ٹکٹ اتوار کے لیے کنفرم ہوئے۔ ان تین دنوں میں ایران کے تقریباً سارے مشہور اور مقدس شہروں کی سیاحت وزیارت کی۔

اتوار تین بجے ہوٹل میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا خبریں سن رہا تھا کہ خبر آئی کہ آج کے بعد ایرانی کرنسی ملک سے باہر لے جانے کی ممانعت ہے خبر سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ منیجر سے خبر کی تفصیل پوچھی اس نے بتایا کہ اگر آپ کے پاس قانونی پیسہ ہے تو لے جاسکتے ہیں اگر گورنمنٹ سے اجازت لی ہوئی ہے پیسہ اور کمپنی رجسٹرڈ ہے تو کوئی ممانعت نہیں (مجھے جو شہر بانی محکمہ نے ادائیگی کی تھی وہ حسن علی سبزواری کی معرفت ہوئی تھی جو کہ اب ایران سے باہر تھے میں قانونی طور پر حد سے زیادہ پیسہ رکھنے کا اہل نہ تھا) بہت پریشان تھا کرنسی کی صورت میں میرا سوٹ کیس بھرا تھا۔ لیکن اسے نہ لے جاسکتا تھا۔ مجبوراً پھر سیٹ کینسل کرانی پڑی اب آئندہ کیا پلان ہوگا اس بارے میں سوچ بچار کی۔

اب میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح تھوڑا تھوڑا کرکے پیسہ لے جاؤں۔ ایک ایرانی پارٹی کو دس لاکھ روپیہ دیا کہ وہ کراچی میں ادا کریں جس کے لیے عوض معقول کمیشن ادا کرنا پڑا۔ پارٹی نے ایک ہزار کے نوٹ کو درمیان سے دو ٹکڑے کیا ایک حصہ مجھے دیا دوسرا انہوں نے اپنے پاس رکھا ہر دو حصوں پر نوٹ کے نمبرز درج تھے یہ نوٹ مجھے ہوٹل میٹروپول کراچی میں کسی دوسری پارٹی کو دکھانا تھا جو مجھے ادائیگی کرتے۔ مقررہ تاریخ کو ہوٹل گیا پتہ چلا کہ بتائے گئے دفتر اور پارٹی کا وجود نہیں انہوں نے سراسر دھوکہ دیا۔ واپس ایران گیا۔

ایران شہر میں ایک ڈرائیور کو دس لاکھ دیے کہ وہ پاکستانی سرحدی شہر مند میں ادائیگی کریں۔ دوسرے دن مند گیا کہ قادر بخش ڈرائیور سے پیسوں لوں ملاقات ہوئی اس نے روتے ہوئے بتایا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے آپ کا اور دوسرے لوگوں کا کافی پیسہ لوٹ لیا بڑی مشکل سے جان چھوٹی۔ اب میں کس عدالت میں یا کس جرگہ میں اپنے لٹنے کا دعویٰ کرتا یہ لوگ بھی ہاتھ کر گئے۔

تیس لاکھ میں سے بیس لاکھ ضائع ہوگئے کمیشن کے علیحدہ میں نے ایک لاکھ ایڈوانس میں ادا کیے تھے۔ سب سے بڑی پریشانی رقم کے ضائع ہونے کے علاوہ پاکستان ایران کے پھیرے کھلتے تھے آمد ورفت میں بڑی دقت ہوتی اب میرے پاس دس لاکھ روپے رہ گئے تھے۔ سمجھ نہ آرہی تھی کہ اب کیا کروں۔

مجھے ایران کے تاریخی شہر شیراز جانا ہوا جو میرا .اور آباؤ اجداد کا وطن ہے وہاں ضلع لیلہ سے تعلق رکھنے والے کسی کے ذریعے واقف کاروں سے ملاقات ہوئی وہ شیراز میں زرگری کا کام کرتے تھے۔ انہیں صورت حال بتائی مجھے انہوں نے بتایا کہ میں سونا خریدوں اور خود ہی اسے پاکستان لے جاؤں مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق میں نے ان کی معرفت پانچ کلو سونا خریدا۔ آدھا آدھا کلو کی دس اینٹیں تھیں جس پر مرکزی بینک کی مہریں ثبت تھیں۔ اس وقت سونا 1800 روپے فی تولہ اور 180000

روپے فی کلو تھا پانچ کلو کے نو لاکھ ادا کیے میں نے سونا بڑی احتیاط سے سوٹ کیس میں کپڑوں کے اوپر نیچے رکھا اللہ جی کا نام لے کر عازمِ سفر ہوا۔ شیراز سے تہران، اور پھر چھوٹے بڑوں 15/16 شہروں سے گزرتا ہوا ایران شہر بحفاظت پہنچ گیا۔ بہت سی جگہ تلاشی ہوئی چونکہ شکل صورت ایرانیوں سے ملتی تھی کافی مشابہت تھی برو برو چلو چلو......

ایران شہر پہنچ کر ایک پک اپ والے سے بات کی کہ وہ مند شہر پہنچائے۔ ایران شہر سے روانہ ہوا تو مند شہر پاکستانی سرحدی شہر آئے گا۔ چاہ بہار سے چلیں تو گوادر اگر زاھد ان سے روانہ ہوں تو تفتان آئے گا۔ مذکورہ گاڑی میں میرے علاوہ ڈرائیور، تین فیشن ایبل افغانی خواتین تھیں۔ انہوں نے چادروں اور برقعوں سے اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ افغانی لباس میں ملبوس تھیں۔ وہ ایران سے پاکستان کافی رقم ادا کرکے روانہ تھیں آٹھ گھنٹے کے طویل اور دشوار سفر کے بعد مند سے چند سو گز پہلے تھے کہ سپاہ پاسداران جو تین ٹویوٹا گاڑیوں میں سوار تھے وہ تعداد میں دس افراد تھے ہماری پک اپ کو روکا۔ سب سواریوں کو نیچے اتارا۔ دراصل انہیں اطلاع تھی کہ تینوں پردہ دار خواتین افغانی نہیں بلکہ ایرانی ہیں۔ وہ ایران کے پہلے صدر (امام خمینی کے وقت) بنی صدر کے اہل خانہ تھیں جو اب معذول ہوچکے تھے یہ خواتین حکومت کو مطلوب تھیں جو اب بھیس بدل کر پاکستان وارد ہونا چاہتی تھیں۔

ٹرانسلیٹر (ترجمان) کے ذریعے جب ان سے پشتو میں بات کی گئی تو پتہ چلا کہ وہ پشتو سے نابلد ہیں۔ ان کی اطلاع سچ ثابت ہوئی اور ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ یہی وہ مطلوب حکومت ہیں انہیں موقع پر گرفتار کیا اور اپنی گاڑیوں میں بٹھالیا۔ میری سرسری تلاشی لی کچھ نہ برآمد ہونے پر مطمئن ہوئے ڈرائیور کو تاکید کہ کہ وہ مجھے بحفاظت منزل مقصود پہنچائے۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا کہ اسے چھت پر رکھوں پاسداران کے ہنگ (کمانڈر) جو کافی طویل القامت تھے از راہ ہمدردی مجھ سے سوٹ کیس لیا اور چھت پر رکھنے لگا کہ کنڈے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا سونے کی اینٹیں آپس میں ٹکرائیں۔ جن سے آواز پیدا ہوئی ان کے کان کھڑے ہوگئے میری طرف دیکھا پریشانی میرے چہرے سے عیاں تھی کہا۔

ہنگ...... بلیط می داری (چابی ہے)

میں...... بلے میں نے چابی حوالے کی۔ انہوں نے سوٹ کیس کو اچھی طرح کھنگالا تو سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔

ہنگ...... ایں شما داری (یہ سونا تمہارا ہے)

میں نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔

انہوں نے سونا تحویل میں لے کر ان کالی کالی پہاڑیوں کے دامن میں فائرنگ اسکواڈ کے آگے کھڑا کیا (ان کے پاس License To Kill کے اختیارات تھے) شوٹ کرنے والے مجھ سے نو قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہوگئے کالا ٹوپہ میرے چہرے پر چڑھانا چاہ رہے تھے میں نے محسوس کیا کہ ان کے کمانڈر اور دوسرے اہلکار ترحم نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے شاید سوچ رہے تھے کہ میں ڈر اور خوف میں مبتلا ہوکر ان سے رحمانہ سلوک اور معافی تلافی نہ مانگ رہا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ میں بہت پریشان تھا۔ بے بسی اور لاچارگی پر رونا آرہا تھا مطمئن اس لیے بھی تھا کہ موت برحق ہے چونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہے کہ ان کی نظروں میں سونے کی اسمگلنگ میں ملوث تھا لیکن یہ میرا حق حلال کا پیسہ تھا۔ اپروچ غلط تھی لیکن نیت میں کوئی فتور نہ تھا بے

ایمانی نہ تھی۔

ہنگ سگریٹ پی رہا تھا میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور تقاضا کیا کہ مجھے ایک سگریٹ دے۔ اس نے اسے میری آخری خواہش سمجھا اور سگریٹ سلگھا دی۔ میں اسے منہ میں دبائے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے نزدیک آن بیٹھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ترجمان جو فارسی، انگریزی، اردو، پشتو بخوبی جانتا تھا میں نے اسے باور کرایا کہ انہیں سمجھائیں مجھے یہاں سزا نہ دیں۔ نہ تو یہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ اردو سمجھتے ہیں اور نہ میں فارسی بول سکتا ہوں۔ مجھے صوبہ سیستان و بلوچستان (ایرانی صوبہ) کے گورنر کے پاس زاھدان لے چلیں انہیں میں اپنا مدعا دوں گا۔ جو میرا قانونی حق ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی انہوں نے وائرلیس کے ذریعے گورنر صاحب سے رابطہ کیا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ گورنر نے انہیں ہدایت دی کہ تینوں خواتین کو اور مجھے ان کی عدالت میں پیش کریں ٹوپہ اتارا گیا ہمیں اپنی گاڑی میں سوار کر کے دوسرے دن علی الصبح عدالت پیش کیا۔

پہلے میری پیشی ہوئی میں نے گورنر صاحب کو بتایا کہ میں تہران سے اصفہان روڈ کی توسیع میں کام کر رہا تھا۔ شہر بانی محکمہ میونسپل کمیٹی نے مجھے ادائیگی کی۔ میرا پیسہ قانونی ہے۔ مختصر مکالمے ہوئے۔

گورنر...... اگر یہ پیسہ قانونی ہے تو پیسہ نہیں بلکہ سونا پکڑا گیا ہے۔ یہ ایران میں جرم ہے۔

میں ...... می لارڈ میں سونا پاکستان نہیں بلکہ ایرانی سرحد کے قریب گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کو دینے جا رہا تھا (میں نے مصلحتاً غلط بیانی کی اللہ مجھے معاف کرے)

گورنر...... پانچ کلو سونا تو بھاری مالیت کا ہے۔

میں...... می لارڈ محکمہ شہر بانی نے مجھے نو ملین تومان کی ادائیگی کی جبکہ اس سونے کی قیمت تقریباً تین ملین بنتی ہے۔

عدالت نے تہران محکمہ سے رابطہ کیا انہیں بتایا گیا کہ مجھے حسن علی سبزواری کی کمپنی 'الحسن' کی معرفت نو ملین ادا ہوئے ہیں عدالت مطمئن ہوئی کہ یہ کوئی غیر قانونی قدم نہ تھا۔ عدالت نے سونا ضبط کیا اور مجھے باعزت بری کر دیا۔

میں بہت خوش تھا کہ کہاں کالے کالے خوفناک سنسان ویران پہاڑوں کے پہلو میں لاچارگی کی موت، 303 کی خطرناک بندوقوں سے موت کی نشانی بازی، وطن سے دور، اپنوں سے جدا، دیارِ غیر میں بے بسی کے آخری لمحات، اور کہاں یہ آزادی، خداوند کریم کا شکر ادا کیا اور ہوٹل مہمان سرائے عارف میں کمرہ کرائے پر لیا۔

رات کو نیند کہاں آ رہی تھی دو سال کی محنت، یخ بستہ سردی کے ایام جھلساتی اور گرماتی دھوپ میں دن رات محنت و مشقت اتنی بڑی رقم اور حاصل کچھ نہیں انسانی فطرت بموجب یہ سوچیں ذہن میں جوار بھاٹہ پیدا کر رہی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر ایک نکتہ ذہن میں آ گیا میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ سوچ بچار کرنے لگا چونکہ میں نے لاء کیا ہوا تھا قانون کی تھوڑی بہت سدھ بدھ تھی اس ایک نکتے نے مجھے پُراعتماد کر دیا۔

اگلی صبح میں نے تازہ دم ہو کر بہترین سوٹ زیب تن کیا اور گورنر کے روبرو حاضر ہوا گورنر نے مجھے اس حال میں دیکھا تو مسکراتے ہوئے اپنی آمد کے متعلق پوچھا۔

گورنر...... Gentleman Whats Problem?

میں...... می لارڈ مسئلہ تو نہیں ایک گزارش کرنے آیا ہوں اگر آپ نظر التفات کریں۔

گورنر...... ہاں...... ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

میں...... جناب محترم کل آپ کی معزز عدالت نے میرے مقدمے کا فیصلہ کیا مجھے باعزت بری کر دیا اور میرا سونا بحق سرکار ضبط کر لیا میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنا چاہتا ہوں۔

عدالت متفق ہوئی اور مجھے آفر دی کہ اگر میں چاہوں تو سرکار کی طرف سے سرکاری وکیل کی خدمات حاصل کر سکتا ہوں۔

میں...... میں شکر گزار ہوں میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا میں اپنا کیس خود Plead کرنا چاہتا ہوں اگر معزز عدالت مجھے اپنا مقدمہ خود لڑنے کی اجازت دے۔

گورنر...... اجازت ہے۔ اجازت ملنے پر میں مخاطب ہوا۔

میں...... می لارڈ ایک بین الاقوامی اصول ہے چور وہ ہوتا ہے جس سے مال برآمد ہو۔ جو دوسروں کی ملکیت ہو۔ عدالت نے مجھے باعزت بری کر دیا لیکن میری پراپرٹی سونا ضبط کر لیا۔ اگر میں بری کر دیا گیا ہوں تو اصولاً اور قانوناً سونا مجھے واپس ملنا چاہیے۔ اگر سونا کی ضبطی بموجب قانون ہے تو مجھے بھی سزا کا مرتکب قرار دیا جائے یہ صریحاً قرین انصاف ہے۔

گورنر صاحب چند لمحات سوچنے لگے اور میری گزارش کو قبولیت گردانتے ہوئے 25% سونا کی ضبطی کے آرڈر کیے اور بقایا چھ لاکھ پچھتر ہزار کے چیک اجراء کیے یوں میرا مقدمہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

اب میں نے پروگرام بنایا کہ اگر قسمت میں پیسہ نہیں تو مجھے واپس اپنے گھر لوٹ جانا چاہیے۔ دوسرے دن میں تہران سے ایران شہر کے لیے روانہ ہوا۔

ایران شہر سے مند کے لیے کوچ پکڑی۔ پندرہ گھنٹوں کے طویل اور دشوار سفر کے بعد پاکستانی شہر مند پہنچ گیا اب مجھے مند سے تربت براستہ تحصیل تمپ پہنچنا تھا۔ جہاں سے روزانہ کراچی کے لیے تین P.I.A کی فلائٹس جاتی تھیں۔ دو گھنٹے بعد مند سے بس روانہ ہونا تھی میں دیگر سواروں کے ساتھ بس میں بیٹھ گیا۔ ہم تقریباً چالیس افراد تھے بس روانگی سے قبل لیوی پولیس والے اندر آئے اور ہر سواری سے پانچ پانچ سو کرایہ کے علاوہ طلب کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ رشوت تھی۔ سواریاں بخوشی پیسے دینے لگے۔ مجھ سے تقاضا کیا تو میں نے اپنا مختصر بیگ ان کے آگے کر دیا کہ یہی میرا کل سامان ہے دیگر سواریاں اسمگلنگ کے سامان سے لدی تھیں۔ میں کیوں پیسے دوں۔

تو تو میں میں ہونے لگی۔ بحث مباحثہ میں تحصیلدار لیوی اندر آ گیا۔ اسے بتایا گیا کہ میں رقم دینے سے انکاری ہوں میرے سامان کی تلاشی شروع ہوئی تو اس میں سے بھٹو صاحب کی تحریر کردہ کتاب 'If I Am Assasinated' (اگر مجھے ہلاک کر دیا گیا) برآمد ہوئی۔ دوسرا دنیا کا نقشہ جہاں مختلف ممالک پر سرخ نشانات لگے تھے۔ انہیں شک پڑ گیا کہ میں کوئی دہشت گرد یا جاسوس ہوں دراصل انہی دنوں 9 اپریل 1983ء صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق مکران کا دورہ کر رہے تھے۔ سارے مکران ڈویژن میں انٹیلی جنس اور دیگر ادارے متحرک تھے۔ ار ہر قدم پر ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ ان دنوں الذوالفقار تنظیم کا بڑا چرچہ تھا۔ جس کی قیادت بھٹو صاحب کے صاحبزادے مرتضی بھٹو کر رہے تھے۔ ضیاء الحق ان سے بہت خائف تھے سارے مکران کی پولیس فورس تربت میں جمع تھی۔

تحصیلدار لیوی نے A.C تمپ سے رابطہ کیا۔ A.C نے ڈپٹی کمشنر تربت کو صورت حال سے آگاہ

کیا انہیں خدشہ لاحق ہوا کہ میں دہشت گرد ہوں اور کسی کارروائی یا دہشت گردی کی واردات کرنے مکران داخل ہوا ہوں۔ D.C نے انہیں بتایا کہ مجھے ان کے روبرو پیش کیا جائے۔ لیوی پولیس نے وصول شدہ پیسے سواریوں کو واپس کردیے اور ان سب کو لاک اپ میں بند کردیا۔ تحصیلدار دو موبائل گاڑیوں جن میں دس پولیس والے مجھے نشانے پر رکھے سوار تھے چار گھنٹے بعد تمپ پہنچے۔ تحصیلدار نے مجھے A.C کے حوالے کیا۔ A.C صاحب تین گاڑیوں میں ہمراہ سکیورٹی گارڈ تربت لائے۔ راستے بہت پیچیدہ اور خطرناک تھے میں پچھلے 36 گھنٹے سے بغیر کسی جرم و خطا در بہ در ہو رہا تھا۔ بھوکا پیاسا ان کے رحم و کرم پر تھا۔

سارے ادارے اپنی گڈ بک میں نام لکھوانے اور پروگریس شو کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے کہ کیسے خطرناک دہشت گرد کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔

ترقیاں، انعامات، اعزازات حاصل کرنے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ہم تقریباً شام سات بجے تربت پہنچے D.C صاحب کے بنگلے کے وسیع لان میں 15/20 کرسیاں بچھی تھیں جن پر سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل، کمشنر تربت، ڈپٹی کمشنر تربت، ڈپٹی کمشنر گوادر اور دیگر سینئر آفیسرز براجمان تھے اور خطرناک دہشت گرد کو شکنجے میں کسنے پر تیار بیٹھے تھے۔

36 گھنٹے کا بھوکا پیاسا، خطرناک اور پیچیدہ راستوں پر چلتا ہوا ان کے روبرو حاضر ہوا۔ گفت و شنید شروع ہوئی میجر جنرل (ان کے سینے پر ریاض لکھا تھا)۔

تمہارا نام کیا ہے؟ مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

میں...... سر میرا نام حسین شیرازی ہے۔

میجر جنرل...... تمہارا مشن کیا ہے کیوں وارد مکران ہوئے ہو؟

میں...... سر میرا کوئی مشن نہیں ہے۔ میں تو ایران سے اپنے گھر کراچی جا رہا تھا کہ لیوی والوں نے پانچ سو روپے نہ دینے پر دھر لیا۔ اگر پیسے دے دیتا تو سب اچھا ہوتا یہ صورت حال ہے۔

میجر جنرل بات کاٹتے ہوئے۔ اپنی اسٹک میز پر ماری۔

No Story سچ بتاؤ ورنہ یاد رکھو تمہیں عبرت کا نشان بنادیں گے۔ اس دوران ڈائریکٹر ایف آئی اے جنرل صاحب سے مخاطب ہوئے۔ سر اسے میرے حوالے کردیں میں کوئٹہ لے جا کر خود اس کی خبر لوں گا اس کا انگ انگ بول اٹھے گا۔ میں نے صورت حال دیکھی تو حقیقتاً گھبرا گیا۔ اگر مجھے ان کے حوالے کردیا جاتا تو پوچھتے بعد میں پہلے ننگ دھڑنگ برف کے بلاکوں پر لٹا کر تھرڈ ڈگری کا استعمال کرتے۔ میں نے سوچا اب بولنے کا وقت ہے میری خاموشی اور ڈر میرے لیے عذاب بن جاتے۔ خوف اور گھبراہٹ میں رہا تو جسم ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔

میں نے اپنی ول پاور اور اعتماد کو بحال کیا ڈر خوف کو دفع دور کیا میری زبان خشک تھی۔ پھر بھی پُراعتماد لہجے میں مخاطب ہوا۔ میں نے ایک قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

سر مجھے افسوس ہے کہ بغیر جرم و خطا کے مجھے مجرم ثابت کیا جا رہا ہے مجھے موقع نہیں دے رہے کہ میں صورت حال سے آگاہ کروں۔ میرے سامان سے میرا پاسپورٹ، ویزہ جات، راہداری، سفری دستاویزات ایران میں گزرے ماہ و سال و ایام کی تفصیل...... کس نے چیک کیے؟

چار دن پہلے میری گورنر بلوچستان دستیان کے روبرو پیشی ہوئی عدالت سے پوچھا جا سکتا ہے کراچی میں میرے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں میرے شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے میرے بارے میں، میری فیملی کے بارے میں استفسار کیا جا سکتا ہے (میرے شہر کا سن کر D.C تربت چونکے تھے دراصل ان کا تعلق بھی ڈیرہ سے تھا)

کیا میرا یہ جرم ہے کہ بھٹو صاحب کی کتاب مجھ سے پکڑی گئی کیا کسی کتاب کا پڑھنا جرم ہے کیا آپ معززین نے مطالعہ نہیں کیا۔

دنیا کے نقشے پر لگے سرخ نشانات اس لیے ہیں کہ میں زاھد ان سے جرمنی بائی روڈ گیا تھا جن جن ممالک سے گزرا برائے یادداشت اور ریکارڈ نشانات زیر قلم کیے کیا یہ کوئی غیر قانونی فعل ہے۔ میں نہایت جرأت سے بولے جا رہا تھا۔ میری باڈی لینگویج سے ظاہر ہو رہا تھا کہ سچ کے علاوہ اور کچھ نہیں بول رہا۔

میرے خاموش ہونے پر D.C صاحب نے حاضر صاحبان سے اجازت لی کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے وہ خود ساری تحقیقات اور معلومات کریں گے۔ اس بات پر ان کا اتفاق ہوگیا۔ میٹنگ برخاست ہوگئی تھی۔ D.C صاحب مجھے اندر اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے مجھ سے پوچھا۔

میں اپنے بارے میں تفصیلاً بتاؤں میں نے شروع سے آخر تک اپنی روئیداد سنائی۔ وہ چونکہ ڈیرہ سے متعلق تھے میری فیملی کے بارے میں بخوبی آگاہی رکھتے تھے آخر انہوں نے کہا۔

کیا میں تم پر اعتبار کروں اور اپنی گارنٹی اور ضمانت پر تمہیں جانے دوں میرا اعتماد مجروح تو نہ ہوگا۔

میں نے جواباً کہا سر اس وقت میری پوزیشن ایسی نہیں میں بلند و بانگ دعویٰ کروں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کے اعتماد اور یقین کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ رات کا کھانا انہی کے ہاں کھایا صبح انہوں نے اپنے ڈرائیور کو ہدایت دی کہ مجھے ایئرپورٹ چھوڑ آئیں تربت سے کراچی روانہ ہوا اس وقت تین فلائٹس چلتی تھیں۔ میں پہلی فلائٹس سے صبح سات بجے روانہ ہوا اور دو سال کے گزرے تلخ و صبر آزما دنوں کے بعد نو بجے دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

کئی سال بعد D.C صاحب کو ڈیرہ میں (جو اب ریٹائرڈ ہوگئے تھے) یقین دلا رہا تھا کہ ہماری اس بات کا ثبوت ہے کہ میں مجرم نہ تھا اور آپ کے اعتماد کو مجروح نہیں کیا۔

آخر میں سوچتا تھا کہ یہ ایام مصائب کیوں درپیش ہوئے دراصل شروع کے دنوں میں جب میرا تہران میں ہوٹل میں قیام رہا۔ ایران عراق کی جنگ جاری تھی کسی بھی نوجوان کو دیکھتے عراق سے جنگ کے لیے سرحدی علاقے ابادان بھیج دیتے سارا دن ہوٹل میں رہ رہ کر بے تحاشا سگریٹ پینے لگا جس کی وجہ سے صحت خراب ہونے لگی میں نے قسم اٹھائی کہ آئندہ سگریٹ کو ہاتھ نہ لگاؤں گا افسوس کہ میں نے چند دنوں بعد پھر سے سگریٹ پینا شروع کی اور قسم توڑ دی جس کا خمیازہ تھا جو بھگتنا پڑا۔

میں نے کراچی پہنچ کر خلوص نیت سے توبہ کی۔ کفارہ کے طور پر دس مسکینوں کو دس روز کھانا کھلایا۔ تین روزے رکھے رب العزت سے توبہ کا خواستگار ہوا۔ فضول بے مقصد قسم اٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ پھر ایسا ہوا کہ ایران جانے سے پہلے میں نے اسٹاک ایکس چینج سے بنک کے پچاس ہزار شیئرز بعوض بارہ روپے فی شیئر خریدے تھے۔ واپسی پر اب ان کی قیمت ایک سو بیس روپے فی شیئر ہوگئی تھی اور یوں میرا جو نقصان ایران میں ہوا تھا پاک پروردگار نے اس طرح میری مدد فرمائی نقصان کی تلافی ہوئی اس کے فضل و کرم سے......

تم تجارت کیوں نہیں کرتے

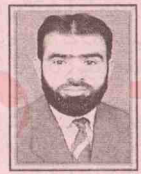

آپ نے کینوؤں کا کریٹ لے کر دیا اور میں بیچنے لگا۔ واقعی تجارت میں برکت ہے۔ منافع ہے۔ عزت ہے۔ وہ ایک کریٹ کا سلسلہ مجھے یہاں تک لے آیا۔ پہلے پہل ایک کریٹ کا.....

مجید احمد جائی

آپ نے یہ جملہ تو اکثر سنا ہوگا۔ ایسے بیٹھا ہے جیسے اس کی ماں مرگئی ہو۔ وہ بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ اُس کی واقعی ماں مرگئی تھی۔ جب سے میرا اس سے یارانہ تھا اُسے پہلے ایسے گم صم اور مایوس نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ اُس کی آواز بلند رہتی تھی۔

وہ تندور پہ کھڑا گاہک بھگتا رہا ہوتا۔ اُس کی آواز دور دور تک گونج رہی ہوتی۔ اُس کا گلا سُریلا اور آواز بہت تیز تھی۔ اُس کا نام نور خان تھا لیکن سبھی اُسے نورا کا تندوری کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک بھائی اور ماں تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب یہاں سیوریج کا نظام متعارف نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کے گھروں سے چھوٹی چھوٹی نالیاں برآمد ہوتیں اور ایک بڑے نالے کی شکل اختیار کر لیتی اور اس علاقے سے دور کھیتوں میں چلی جاتیں تھیں۔

نور خان کا تندور اسی بڑے نالے کے قریب تھا درمیان میں صرف ایک پکی سڑک گزرتی تھی۔ سڑک کے ایک طرف یہ نالا بہتا تھا اور سڑک کے دوسری طرف اُس کا تندور تھا۔ میرا گھر تندور والی سائیڈ سے آدھے کلو میٹر دوری پر واقع تھا۔ نور خان نے یہاں تندور بنایا تھا لیکن یہ زمین اس کی نہیں تھی بلکہ سرکاری ویران زمین پر اس نے قبضہ کیا تھا۔

نور خان کا کام روٹیاں لگوانے آنے والے لوگوں سے آٹے کے بنے بنائے پیڑے وصول کرنا اور اندر ساتھ بنی چھوٹی پیڑی میں بھیج دینا تھا جہاں اس کی ماں روٹیاں لگاتی تھی۔ پیڑے لے جانے اور روٹیاں لے آنے کا کام اُس کا بھائی انجام دیتا تھا۔

میں نے جب جب بھی کو نور خان دیکھا وہ گاہکوں سے اُلجھتا رہتا۔ جس کے پیڑے بڑے ہوتے اس کی روٹیاں نہیں لگواتا تھا یا پھر اس کے پیڑوں کے دو حصے کر دیتا، یوں گاہک اور اس کے درمیان تنازع کھڑا ہو جاتا۔ نور خان اپنی بدکلامی سے مشہور تھا اور دوسرا ایک آنکھ سے کانا بھی تھا۔ یہی وجہ تھی نور خان سے نورا کانا مشہور ہو گیا تھا۔

نور خان سے میرے پہلی ملاقات میرے

گھر کے ساتھ بنے چائے کے ہوٹل پر ہوئی تھی اللہ جانے اُسے کیسے معلوم ہوا کہ میں پڑھنا لکھنا جانتا ہوں۔ یہ گرمیوں کے دن تھے۔ سورج کی تمازت ہر بشر کو پنکھے کے پاس یا کسی درخت کے سائے میں بیٹھنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ یہ بھی انہی دنوں میں سے ایک دن تھا جب نور خان میرے پاس آیا۔ نور خان پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اپنے چھوٹے پیڑے اور تندور کے لئے اس جگہ کا مالک بننے کے خواب آنکھوں میں لیے ہوا تھا۔ اس لیے جہاں سے بھی اُمید کی کرن پھوٹتی یہ درخواستیں دے دیتا۔ درخواستیں لکھنے کا کام مجھ سے لیتا تھا۔

نور خان نے مجھ سے جانے کتنی درخواستیں لکھوائیں لیکن اس کی سنوائی نہ ہوئی۔ یہی وہ عمل تھا نور خان میرے عزت کرتا تھا اور مجھے احمد باؤ بلانے لگا۔ اُس نے احمد کے ساتھ باؤ کا اضافہ کر لیا تھا۔ میں نے کبھی محسوس نہ کیا اور اُس کی خوشی میں خوش تھا۔ میرے درخواست لکھنے کا فائدہ یہ ملا کہ میں جب بھی اس سے روٹیاں لگوانے جاتا تو لائن نہ لگنا پڑتا۔ وہ بڑی مہارت سے میرے پیڑے لے کر اندر روٹیاں لگنے کے لیے بھیج دیتا۔ مجھے وہاں بنے تھڑے پر بیٹھا دیتا اور گاہکوں کے ساتھ ساتھ میرے ساتھ گپ شپ کرنے لگ جاتا۔ پورے علاقے میں ایک میں ہی اس کا دوست تھا اور میری بہت عزت کرتا تھا۔ لوگ حیرت سے مجھے کبھی تکتے اور نور خان کو بھی دیکھتے۔ لوگ اس سے متنفر تھے لیکن مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں اُسے سمجھا تا رہتا

کہ نور خان لوگوں کے ساتھ نہ اُلجھا کرو اس طرح اکیلے رہ جاؤ گے۔

احمد بابو! میں ان سے کب اُلجھتا ہوں یہی لوگ میرے ساتھ اُلجھتے ہیں۔ وہ جواب دیتا۔

مہ وسال گزرتے رہے۔ جاڑے کے دنوں میں اس کی ماں مرگئی۔ جس کے جنازے میں علاقے کے صرف چند لوگ شریک ہوئے۔ میں بھی ان میں شریک تھا۔ جنازے سے لے کر میت کی تدفین تک ساتھ رہا۔ تدفین کے بعد جھونپڑے نما گھر واپس آئے تو نور خان تندور والے ٹھڑے پر چپ چاپ بیٹھا تھا اور اُس کی آنکھوں سے سمندر جاری تھا۔ لیکن برسات برس رہی تھی اور کسی کا کندھا بھی اس کے لیے نہیں تھا۔ میں اُس کے قریب جا بیٹھا اور تین چار سو روپے اس کی جیب میں زبردستی ڈال دیئے۔ جس کا وہ انکار کرتا رہا۔ میں نے اُسے تسلیاں دیں، بھروسہ دیا اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اپنے گھر لوٹ آیا۔

نور خان کی ماں کو مرے ایک مہینہ ہو گیا تھا اور پچھلے ایک ماہ سے ہی تندور بند پڑا تھا۔ اس دوران زندگی نے مجھے کچھ ایسا اُلجھایا کہ نور خان کی خبر لینا ہی بھول گیا۔ میری مصروفیات زیادہ ہو گئیں۔ جوانی کے دن تھے اور جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ مجھے ایک مہ پری نے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ پہلی اُس نے کی تھی۔ وہ مجھے چاہتی تھی۔ کئی دنوں سے مجھے نوٹ کر رہی تھی۔ میرے معمولات پر اُس کی نظر تھی۔

چاہت کے جذبے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وہاں وہاں سر اُٹھاتے ہیں جہاں مقدر کے ستارے ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ اُس کی چاہت نے مجھے محبت کا اسیر کر دیا۔ محبت تو محبت ہوتی ہے۔ کہیں بھی ہو جاتی ہے۔ یہ پابندیاں تھوڑی دیکھتی ہے۔ یہ دین دھرم نہیں دیکھتی۔ یہ دلوں کی ہم راہی ہوتی ہے۔ دل سے ہوتی ہے اور دلوں میں رہتی ہے۔

وہ میری ہمسائی تھی لیکن ذات پات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور میڈیسن کا کام کرتا تھا ساتھ لکھنا پڑھنا بھی تھا۔ وہ جاگیر دارنی تھی۔ اس کے باپ کا وسیع کاروبار تھا۔ محبت کے پروانے امیری غریبی تھوڑی دیکھتے ہیں۔ محبت کے پھول جہاں کھلنے ہوتے ہیں کھل پڑتے ہیں۔ یہ دلوں کے معاملے ہوتے ہیں۔ آنکھوں سے تراشے جاتے ہیں۔ یہاں دلوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور عقل کے سکندر مات کھا جاتے ہیں۔ میں محبت کے گلشن کا مکین ہو گیا اور نور خان کو بھول گیا۔ وقت بھی ارتقائی منازل طے کر رہا تھا۔

ایک دن چھٹی تھی تو دیر سے اٹھنے کے بعد ہوا خوری کے لیے گھر سے باہر نکلا اور بے اختیار قدم سڑک کے کنارے نور خان کے تندور کی طرف اُٹھ گئے۔ ایک کشش تھی جو مجھے اس طرف لے جا رہی تھی۔ جس خوشی اور مسرت سے میں چلا تھا، آگے جا کر اس سے کہیں زیادہ حسرت و یاس کے صحراؤں نے مجھے جکڑ لیا۔ نور خان تندوری تھا نہ وہ جھونپڑا۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ میں اپنی دُنیا میں اتنا کھویا کے بغل میں رہتے ہوئے نور خان کی خبر نہ رہی۔ واہ رے زندگی۔ تو بھی کیسے کیسے امتحان لیتی ہے۔

کچھ دن قبل تجاوزات والوں نے اُس کا تندور اور جھونپڑا ختم کر دیا اور وہ اپنے بھائی کو لے کر جانے کہاں چلا گیا۔ زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے جتن تو کرنے پڑتے ہیں۔ میں جو ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔ دماغ کی اسکرین پر ہزاروں وسوسوں کا بوجھ ڈال کر واپس لوٹ آیا۔ ایک طرف محبوب کا چہرہ تھا تو دوسری طرف نور خان دوست۔ دل

و دماغ پر دونوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ اس دوران محبوب کے خطوط نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ مجھے حالات سے نبرد آزما ہونے کے رنگ ڈھنگ سکھائے۔ یہ وہ زمانہ تھا موبائل کی وبا نہیں پھیلی تھی خطوط کا زمانہ تھا اور عاشق اور معشوق کے عہد و پیمان کا کامیاب طریقہ یہی تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان صرف پانچ فٹ کی دیوار حائل تھی لیکن اس دیوار کے علاوہ سماج کی ہزاروں دیواریں حائل تھیں۔ اتنے قریب رہتے ہوئے بھی ہم خطوط کا سہارا لیتے تھے۔ ہم گھر اور چار دیواری کے تقدس کو جانتے تھے۔ خطوط سے باتیں ہوتی اور کبھی کبھار نظروں سے دیدار ہوتا۔ بس ایک دوسرے کو حال دل سناتے اور محبت کو پروان چڑھاتے تھے۔ میری ہونا چاہتی تھی اور میں بھی اس کا ہونا چاہتا تھا۔ پڑھی لکھی وہ بھی تھی اور میں بھی تھا لیکن زمانہ جہالت کا نہ تھا لوگوں کے ذہن جہالت زدہ تھے اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے محبت جیسے پاک جذبے کو دکھوں، آہوں کے سپرد کرتے ہیں۔

جہاں انسان ہوتے ہیں وہاں شیطان بھی ہوتے ہیں۔ انسانیت کے درمیان شیطانیت بھی تھی انسانوں کے روپ میں شیطانوں نے ہماری محبت کو امر نہ ہونے دیا اور میری محبوب نا چاہتے ہوئے بھی محبت قربان کر گئی۔ خود قربان ہو کر ماں باپ کی عزت، جھوٹی انا اور برادری کی رسموں رواجوں کی لاج رکھ گئی۔ میری محبوب دل میرے پاس چھوڑ کر خالی خولی وجود لے کر کسی اور کے آنگن میں چلی گئی۔

ہم حق پر تھے سوائے احتجاج کے کچھ بھی نہ کر سکے۔ محبت کے لیے قربان ہو گئے ویسے بھی محبت کی چاشنی پانے میں نہیں کھو دینے میں زیادہ ہے۔ جہاں محبت مل جاتی ہے اس کی داستان ختم ہو جاتی ہے۔ محبت اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ محبت کی ناکامی کے بعد میں نے وہ مکان چھوڑ دیا اور دوسرے شہر میں اپنا مکان پلاٹ خرید کر بنایا اور زندگی کو نئے سرے سے بسر کرنے لگا۔ پھر ایک محبوبہ ہوا۔

ایک روز میں کام سے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ مین بازار میں سے گزرتے ہوئے میری سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔ اللہ کے نام پہ دے دو بابا۔ مولا کے نام پہ دے دو۔ ایک نابینا شخص اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ میں آواز کے تعاقب میں تھا کہ آواز پھر ابھری۔ روٹی کا سوال ہے بابا۔۔۔ بھوکا ہوں۔

خدا بھلا کرے۔۔۔ معاف کرو بابا۔۔۔ جیسے جملے بھی میری سماعتوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں یہ آواز لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ نور خان تھا اس کے چہرے کے خدوخال بدل چکے تھے۔ میں اس کے قریب جا چکا تو آہستہ سے کہا۔

نور خان۔۔۔

دوسرے لمحے وہ نابینا شخص میرے سینے سے لگ گیا۔۔۔ احمد بابو۔۔۔ احمد بابو۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ابھی باقی تھے جو ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔

نور خان۔۔۔ تم اور یہاں۔۔۔؟ اور اس حالت میں؟ آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا اور آپ کی بینائی کو کیا ہوا؟

احمد بابو۔۔۔ جس طرح تم نے مجھے پہچانا اسی طرح میں نے بھی پہچان لیا۔ پتا ہے جب میں تندور پہ ہوتا تھا۔ صرف ایک آپ ہی تھے جو مجھے نور خان کہہ کر پکارتے تھے ورنہ لوگ تو نام بگاڑ کر گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے۔

احمد بابو۔۔۔ بتاؤ نا آپ دو سال بعد ملے ہو۔ ان دو سالوں نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اپنے نہیں رہے۔ لوگوں نے تندور سے فٹ پاتھ کا بھکاری بنا دیا ہے۔ ماں۔۔۔ فوت ہوئی تو میری

کائنات ہی چھن گئی ۔ آپ بھی منظر سے غائب ہو گئے ۔ کئی بار وہاں بھی گیا جہاں آپ مجھے درخواست لکھ کر دیا کرتے تھے لیکن ناکامی نے مجھے گلے سے لگایا ۔ کمیٹی والے آئے انہوں نے میرا جھونپڑا گرا دیا ۔ میرا تندور ختم ہو گیا ۔ میرے کمانے کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ میں بھائی کو لے کر یہاں چلا آیا ۔ ابھی ہم ماں کا غم بھی نہیں بھولے تھے کہ موت نے بھائی کو بھی آن لیا اور میں بھری دُنیا میں تنہا ہو گیا ۔ ان غموں نے میری آنکھوں کا نور چھین لیا ۔ میں نابینا ہو گیا ۔ یہاں تو آنکھوں والوں کا ساتھ کوئی نہیں دیتا ۔ میرا ساتھ کون دیتا ۔ میری تو آنکھیں ہی نہیں تھیں ۔ گردش حالات نے مجھے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا ۔ میں بھکاری بن گیا ۔ فٹ پاتھوں ، بازاروں میں بھیک مانگنے لگا ۔ اب لوگ خیرات بھی نہیں دیتے ۔ مشکل سے روٹی ملتی ہے ۔ کیسے بے حس لوگ ہیں جس اللہ نے ان کو دھن دولت دیا ہے اللہ کے نام پر مانگنے پر بھی نہیں دیتے ۔ جس نے پیدا کیا ہے روٹی تو وہی دیتا ہے نا ۔۔۔ لیکن یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے ۔

نورخان کے ساتھ چھوٹا سا لڑکا بھی تھا جو اس کا ہاتھ پکڑے رکھتا تھا ۔ اس نے بتایا یہ لڑکا ہمسائیوں کا ہے ، دن بھر میرے ساتھ رہتا ہے اور شام کو اپنا حصہ لے جاتا ہے ۔ اس چوک پہ جو بڑے مینار والی مسجد ہے ناں ۔ اس سے ملحقہ ایک جھونپڑے میں رہتا ہوں ۔ یہ جھونپڑا امام مسجد کے حجرے کے ساتھ ہے ۔ کبھی کبھار امام مسجد بھی ترس کھا کر کھانا دے دیتا ہے ۔ زندگی بسر ہو رہی ہے ۔ زیادہ کٹ گئی ہے تھوڑی رہ گئی ہے ، گزر ہی جائے گی ۔

نورخان ! اللہ کے نام پہ بھیک مانگتے ہو ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیوں نہیں کرتے ۔ تم تجارت کیوں نہیں کرتے ۔

تجارت ؟

نورخان نے سوالیہ انداز میں پوچھا ۔

ہاں ۔ نورخان آپ اس چوک پہ بیٹھ کر کینو بیچا کریں گے نا ۔۔۔ اچانک میرے ذہن میں ترکیب آئی ۔

احمد باؤ ۔۔۔ میں تو نابینا ہوں ۔ کیسے لے آؤں گا اور پھر کیسے بیچوں گا ۔ جانے لوگ کیا سلوک کریں گے ۔

نورخان ۔۔۔ لوگوں کو چھوڑو ۔۔۔ تجارت میں فضیلت ہے ۔ تجارت میں منافع بھی ہے ۔ تجارت کرنا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے ۔ اللہ تعالیٰ برکت دے گا ۔ رزق تو وہی دیتا ہے ۔ میں آپ کو ایک کریٹ کینو لے کر دے جاتا ہوں اور پھر وہ آڑھتی آپ تک روز ایک کریٹ پہنچا دے گا ، جو کرایہ لے گا آپ اُسے دیتے رہنا ۔

جی ٹھیک ہے ۔۔۔ احمد باؤ

نورخان ۔۔۔ میری بات مان گیا اور میں نے اُسے کینوؤں کا ایک کریٹ لا کر دے دیا اور آڑھتی کو کہہ دیا کہ روز ایک کریٹ یہاں تک پہنچوا دے ۔ چوک کے تھوڑے فاصلے پر ہی منڈی تھی ۔ یہاں فروٹ اور سبزیاں فروخت ہوتی تھیں ۔ اُس نے حامی بھر لی ۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو میں گھر کو لوٹ آیا ۔۔۔ اور یہ واقعہ بھول گیا ۔ زندگی کی مصروفیات نے مجھے قید کر لیا اور میں اپنی دُنیا میں کھو گیا ۔ محبوب تو سماج کی رسموں رواجوں پر قربان ہو گیا تھا اور میں بھی اپنی محبت کو بھلانے کی خاطر خود کو زیادہ مصروف رکھنے لگا ۔ یوں ایسا مصروف ہوا کہ خود کی خبر بھی نہ رہی ۔ دوسرے کے حال حالات سے کیسے باخبر رہتا ۔

زندگی کے مہ و سال گزرتے رہے اور میں نے محبوب کے ساتھ کیے گئے وعدے کو نبھاتے ہوئے تین سال بعد شادی کر لی ۔ محبوب کا وہ شہر ، وہ گلیاں ... ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر دوسرے شہر جا ... بیوی نے کسی حد تک مجھے سمیٹ لیا تھا ۔ میں جو ... کرچی کرچی ہو چلا تھا ۔ مجھے پھر سے آئینے کی طرح ... لیا ۔ میرے دُکھوں کا مداوا ہونے لگا ۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹی اور بیٹے سے بھی ... دیا ۔ میں اپنے گلشن کے ان پھولوں میں ... کھلکھلانے لگا ۔ اس زندگی میں دس بارہ سال کا ... بیت گیا ۔ جوانی سے بڑھاپے کا رنگ چڑھنے ... کالے سیاہ بالوں کی جگہ چاندی اتر آئی ۔ میں ... اپنا مکان بھی بنا لیا اور ایک گاڑی بھی خرید لی ۔

سردیوں کے دن تھے ۔ خوب سردی پڑ رہی تھی ... میں اپنے آفس سے گھر کی طرف نکلا تو گھر جاتے ... ہوئے سوچا بچوں کے لیے خشک میوے لیتا جاؤں ... اسی سوچ کے تناظر میں گاڑی کا رخ خشک میوہ جات کے بازار کی طرف موڑ لیا ۔ ایک جگہ گاڑی پارک کر کے بازار کے اندر چلا گیا اور اپنی پسند کے ... خریدنے لگا ۔ ایک جگہ سے چلغوزے لے رہا ... اور ساتھ والی دُکان پر ایک موٹا دبلا اڈھیر عمر شخص ... مجھے تکے جا رہا تھا ۔ اُس کا لباس پٹھانوں جیسا ... سر پر بڑی سی پگڑی ۔ بارعب شخص تھا ۔ لیکن ... کیوں تکے جا رہا تھا ؟ میں اسے نظر انداز کر کے ... خریداری میں مصروف رہا ۔ کبھی کبھی نظریں ... تو وہ شخص برابر مجھے تکے جا رہا تھا ۔ مجھے اُلجھن ... ہونے لگی اور جلدی سے خریداری سے فارغ ہو کر ... لگا تو وہ شخص میرے سامنے آ گیا ۔

احمد باؤ ۔۔۔ اُس نے حیرانگی اور مسرت کے ... جلے تاثرات کے ساتھ مخاطب کیا ۔ میں بھی ... حیران کھڑا تکے جا رہا تھا ۔

احمد باؤ ۔۔۔۔۔ میں نورخان ۔۔۔

نورخان ۔۔۔ تم ۔۔۔ تم تو نابینا تھے اور ... پھ ۔۔۔ پھر ۔۔۔

میری حیرت میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ اضافہ ہوا تھا ۔

ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ احمد باؤ ۔۔۔ میں نابینا تھا ۔۔۔ نابینا ۔۔۔ اللہ نے بینائی دُور کر کے بصیرت دے دی ہے ۔۔۔ کریم ہے نا

آؤ ۔۔۔ سینے سے لگ جاؤ ۔۔۔ آؤ میرے محسن ۔۔۔ ایک مدت سے جس تڑپ میں تڑپ رہا تھا ، جو کسک تھی ۔۔۔ حسرت تھی اُسے ختم بھی کر دو ۔۔۔ کتنا تجھے تلاش کیا ؟ تم یوں اچانک روپوش کیسے ہو جاتے ہو ؟

احمد باؤ ، گھر چل کر حال سناتے ہیں ۔ سواری ہے تمہارے پاس ؟

جی ۔

کہاں ہے ؟

پارکنگ میں ۔ چابی دو

میں نے نورخان کو چابی دے دی ۔ اس سے پہلے ہم کتنی دیر ایک دوسرے کے سینے سے لگے رہے تھے ۔ آنسوؤں کا سمندر اب بھی ٹھاٹھیں مارتا تھا ۔ اس کی لہریں رُخساروں کو اب بھی چومتی تھیں ۔ نورخان نے چابی لے کر اپنے ساتھ کھڑے باڈی گارڈ کو دے دی اور حکم ملتے ہی وہ گاڑی کی طرف لپکے ۔۔۔ تم پہنچو ۔۔۔ ہم بھی آ رہے ہیں ۔۔۔ نورخان نے جاتے گارڈ کو حکم دیا ۔

احمد باؤ ۔۔۔ آؤ ۔۔۔ نورخان نے کہا تو ایک چمکتی لشکارے مارتی پنجارو سامنے آ کھڑی ہوئی ۔ اس سے پہلے ان کے گارڈز نے میرے ہاتھوں سے وہ شاپر لے لیے جس میں میوے جات لے چکا تھا ۔ نورخان نے اپنے گارڈز کو میری گاڑی میں بھیج دیا تھا ۔ اب پنجارو میں صرف دو بندے تھے ۔ نورخان پنجارو خود چلا رہا تھا ۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا ۔

میرے دل کے اندر سوالات کی جنگ جاری تھی۔ میں بے تاب تھا کہ نور خان نے یہاں تک کا سفر کیسے کرلیا۔ جاننے کی جلدی تھی۔ اس دوران نور خان کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ جاری رہی۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد گاڑی ایک اعلیٰ شان بنگلے نما عمارت کے سامنے جا رُکی۔ پنجارو کے رُکتے ہی فوراً بڑا سا گیٹ کھل گیا اور دونوں سائیڈوں سے پھولوں کی پتّوں کی برسات شروع ہو گئی۔ گارڈز بھاگ کر دونوں طرف دروازوں کے پاس آئے اور دروازے کھول دیئے۔ نور خان نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھولوں کی پتوں کی برسات رُکنے کا نام نہیں رہی تھی۔

اتنا شاندار استقبال اور میری ذات ......

پھولوں کے ڈھیر میرے قدم چوم رہے تھے اور میری آنکھوں کی سرزمین میں آنسو اپنی نگری سے باہر آنے کو بے تاب تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے ماحول معطر ہو گیا تھا۔ اتنی خوشی مجھے پہلی بار مل رہی تھی۔ نجانے گارڈز نے ہمارے پہنچنے تک یہ سارا انتظام کیسے کرلیا تھا۔

جب تک نور خان مجھے لے کر بالائی منزل تک نہ پہنچا۔ پھولوں کی خوشبو پھیلاتی پتیوں سے میرا برابر استقبال ہوتا رہا۔ بھنگڑے ڈالے جانے لگے۔ ہر سوں خوشیاں ہی خوشیاں محورقصاں تھیں۔ ہال نما کمرے میں پہنچے تو انواع اقسام کے کھانے چن دیئے گئے تھے۔ وہاں صرف نور خان اور میں ہی تھا۔۔۔ یہ اتنا انتظام کن کے لیے ہے۔؟ میں ابھی بھی محو حیرت تھا۔ نور خان نابینا سے یہاں تک کیسے ترقی کر گیا۔

نور خان نے پھر یوں داستان سنائی۔ احمد باؤ۔۔ وہ لمحے، وہ پل میری تقدیر بدل گئے جب آپ نے کینوؤں کا کریٹ لے کر دیا اور میں ... لگا۔ واقعی تجارت میں برکت ہے۔ منافع ... عزت ہے۔ وہ ایک کریٹ کا سلسلہ مجھے یہاں تک لے آیا۔ پہلے پہل ایک کریٹ کا سلسلہ ... دن چلا۔ پھر دوپہر سے پہلے کریٹ ختم ہو جانے ... میں نے دو کریٹ منگوانے شروع کر د... آڑھتی دو کریٹ بھیج دیتا اور میں اُسے کرایہ اور ... دے دیتا۔ سلسلہ چل پڑا اور یہ تجارت ایسی چل... میں ایک کریٹ سے سفر کرتا ایک گاڑی تک پہنچ... میں نے دو لڑکے کام پر رکھ لیے۔ منڈی جا... لگا۔ خود جا کر مال خریدنے لگا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت نے جوش لیا اور مجھ ... برسات ہونے لگی۔ میں نے اپنی دکان خرید لی۔ کا... مسلسل بڑھتا جاتا تھا۔ دُکان پہ اور لڑکے رکھ لے... اور دو لڑکے میرے ساتھ رہتے اور ہم منڈی ... مال خریدتے۔ اسی طرح ایک سیزن میں، میں ... کینوؤں کا باغ خرید لیا۔ جس سے منافع ہماری سو... سے کہیں بڑھ کر ملا۔ ایک طرف منافع بڑھتا جا رہا... اور دوسری طرف میں نے اللہ تعالیٰ سے کاروبار کر... اُدھر اللہ دیتا جاتا اُدھر میں اُسے لوٹنا کی کوشش... کرنے لگا۔ اپنے علاقے میں غریبوں کی مدد کر... لگا۔ محلے، علاقے میں جو بھکاری ملتا اُسے تجارت... لگا دیتا۔ ایک علاقے میں رقبہ خریدا اور وہاں غریبوں کو تندور لگا کر دیئے۔ اس علاقے کا نام تندور آ... رکھ دیا۔ اس علاقے سے روٹیاں لے کر دسترخوان لگوائے اور غریبوں کو کھانا کھلانے لگا۔

جہاں تک آنکھوں کی بصیرت کا سوال تھا۔ ایک دوست کے مشورے سے شہر کے بڑے ہسپتال میں ٹیسٹ کروائے انہوں نے انگلینڈ جانے کا مشورہ د... میں انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں آنکھوں کا آپریشن ہوا اور میں اندھا۔۔۔ پھر سے آنکھوں والا ہو گیا۔ میں ...

کو دیکھنے لگا۔ میری آنکھوں کا نور واپس آ گیا۔

میرا کاروبار وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ میں پشاور چلا گیا۔ وہاں سے خشک میوہ جات کا کاروبار کرنے لگا۔ قدرت خدا کی جس بھی چیز کو ہاتھ لگاتا وہ سونا ہو جاتی۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے۔ ہر سال رمضان المبارک میں مدینے چلا جاتا ہوں۔ رمضان کا مہینے وہاں گزارتا ہوں۔ اعتکاف بیٹھتا ہوں۔ آج بھی میری رات آٹھ بجے فلائٹ ہے۔

احمد باؤ تم سناؤ شادی ہو گئی اس مہ جبیں سے۔

نہیں نور خان...... وہ مہ جبیں میری قسمت کی لکیروں میں نہیں تھی۔ زمانے نے مجھ سے میرا محبوب چھین لیا۔۔ شادی ہو گئی ہے لیکن وہاں نہیں جہاں دل ملے تھے۔ اب دو بچے ہیں۔ زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔

نور خان اور میں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ کھانا کھایا۔ اس دوران نور خان کہنے لگا۔ احمد باؤ۔۔۔ دو دن پہلے مل گئے ہوتے تو آج ہم دونوں دوست اکٹھے مدینے کو جاتے۔ تیرا ساتھ پا کر میری خوشی میں اضافہ ہو جاتا۔ میں تو ہر سال کئی ساتھیوں کو حج پہ بھیجتا ہوں۔ میں تجھے بھی ضرور حج کرواؤں گا۔ باتوں کے دوران اس نے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈالے جو بھی رقم تھی اس نے میری جیب میں ڈال دی۔ میں منع کرتا رہا لیکن وہ بضد تھا۔

احمد باؤ۔۔ ایک بات تمہاری مان کر، میں ہاتھ پھیلانے سے تجارت کی طرف آ گیا۔ ایک بات تم بھی میری مان لو۔ میری بھابھی اور بچوں کے لیے تحفے کے طور پر رکھ لو۔۔۔ میں خاموش ہو گیا۔ وقت نے ایک بار پھر مجھے بے بس کر دیا تھا۔ ہم ہال سے نکل کر باتیں کرتے گاڑی تک آئے۔ میری گاڑی خشک میوہ جات اور تحائف سے بھری ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی بمشکل جگہ خالی تھی۔ نور خان نے کہا۔۔ تمہاری گاڑی میں جگہ نہیں ہے۔ ٹرک ہوتا تو بھر دیتا۔ بچوں کے لیے انکل کی طرف سے کچھ میوے اور تحفے ہیں۔ میں بہت خوش تھا۔ نور خان میرے استقبال سے لے کر رخصت تک ہر معاملے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔

وہ میری زندگی کی سہانی شام تھی۔ حسین یادوں کی شام۔ بچھڑے دو ساتھیوں کی پھر سے ملنے کی شام۔ پھر یہ وقت بھی گزر گیا۔ میں گھر آ گیا اور نور خان سعودیہ چلا گیا۔ اب موبائل بھی آ گئے تھے۔ نور خان نے اپنا نمبر دیتے ہوئے میرا نمبر لے لیا۔ مدینے جا کر بھی وہ مجھے نہیں بھولا تھا۔ روزانہ شام کو بات کرتے۔

27 رمضان المبارک جمعہ کے دن صبح سویرے مجھ سے نور خان کی آخری بار بات ہوئی۔ نور خان کا وقت آ گیا تھا۔ اُس کے سچے دوست نے اُسے اپنے پاس بلوا لیا۔ نور خان اُسی دن مسجد نبوی میں وفات پا گیا۔ نماز جمعہ کے بعد اُس کا مسجد نبوی کے امام نے جنازہ پڑھایا اور نور خان جنت البقیع میں مدفون ہو گیا۔

نور خان چلا گیا ہے۔ مجھے بھی چلے جانا ہے لیکن بھکاری سے تجارت کی تحریک زندہ رہنی چاہیے۔ آپ نے اس تحریک کو جاری و ساری رکھنا ہے۔ کہیں بھی بھکاری نظر آئے، کوشش کیجئے گا اس کا ذریعہ تجارت بن جائے گا۔ یوں ہاتھ پھیلانے کی روش بھی ختم ہو جائے گی اور امن و سکون سے رزق حلال کمانے والا معاشرہ وجود میں آ جائے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ بھی زندہ رہے گی۔

□□....❁....□□

نادیدہ ہاتھ

دنیا نیک لوگوں سے خالی نہیں ہے بس
انہیں پہچاننے والی نظر چاہیے.....

عالی مان آفاقی

نم آلود نیم تاریکیوں میں ہر سمت ایک سکوت مرگ طاری تھا۔ زمین گویا برف کی تھی، جس پر بکھرا کچرا نمی اترنے سے گیلا ہو رہا تھا۔ درختوں کی دو رویہ قطار کے درمیان بہتی ندی خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ گند سے لتھڑے پلاسٹک بیگز نے اس کے پانی کو ویران کر دیا تھا، یہ پانی نجانے کب سے اپنی تیز روی کو مفقود پا کر کشاں کشاں چلتے ہوئے بھی خاموش ساکت سا تھا۔ ندی کے چلنے کی آواز بیکراں سناٹوں کو بہت عرصہ ہوا توڑ نہیں سکی تھی۔

روایت تھی کہ یہ یگوں پہلے ستی ہو جانے والی ایک کماری کی یادگار ہے، جس کی زیارت کو دنیا بھر سے پہلے سیاح آتے تھے اور اونچی نیچی کٹی پھٹی سرمئی و سیاہ چٹان پر پختہ ویران و سنسان شش دریوں کی ایک قطار تھی جہاں ہر سال سیاحوں کا میلہ لگتا تھا۔ دنیا بھر سے مالدار لوگ آتے اور زمین پر چل کر روزی کرنے والوں کو خوابوں کی جادو نگریاں دے جاتے، جہاں سوچیں یوں بے مہار ہوتی تھیں کہ پل بھر میں کوئی تصوراتی بنگلے تعمیر کر لیتا تو کسی کے رہن سہن میں اور پہناوے کے وقار میں شہنشاہوں کا سا فخر آ جاتا۔

پھر اچانک کہیں سے بات نکلی کہ کب کی مری جلی ناریاں یہاں راتوں کو چل کر پائل کی جھنک سے اپنے جلے ہوئے پیر دکھاتی ہیں، جن میں سے اکثر الٹے ہوتے ہیں۔ ان کے جسموں سے آگ کے بھانبڑ نکلتے ہیں اور آواز کا ڈراؤنا پن سناٹوں کی سنسانی توڑتا رہتا ہے۔ اب یہاں سیاح نہیں آتے۔ کھانے کے خالی پیکٹ اور ٹن پیک اب اس ندی میں کوئی نہیں پھینکتا۔ مگر پانی بدستور آلائش

زدہ ہے، جیسے پچھل پیری ناریوں کی راج نگری کا یاس بھرا روپ ہمیشہ کے لیے قائم رہنا چاہتا ہو۔

بلند و بالا درختوں سے جھانکتے پختہ شش دریوں کے شیڈز پر لگے کائی آلود مچان اس یادگار کو منزل در منزل اجڑے بسیرے کی طرح دکھا رہے تھے۔ سر بلند کائی آلود چوبی مینار کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ سایہ جو کافی دیر اور دور سے لہراتا یہاں تک آیا تھا، چٹکتی چاندنی میں ظاہر ہو گیا تھا۔ یہ دو درختوں کے درمیان کا وقفہ تھا جس نے سائے کی سفید ریش کو فلک سے نتھرتی چاندنی سے ہم آہنگ کیا تھا۔ سایہ لمحہ بھر رکا، جیسے اس خرابے کی غمناک سسکار کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''مینار خموشاں'' کی طرح سنسان اپنے سر پر تنے ایک شکستہ کیبن کو سر اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور پھر چل پڑا۔

چلتے سائے کو اپنی نظروں کے تعاقب میں لیے شش دری کے آخری شیڈ تلے کھڑا وہ دھواں دھواں سی فضا کا گویا نگران تھا، وہ اس دور سے یہاں رہ رہا تھا جب سیاح ادھر میلہ لگاتے تھے۔ چہل پہل ہوتی تھی تو دیواروں، منڈیروں اور شش دریوں کے شیڈز پر دیے جلتے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی پیدائش کے زمانے میں دور دور تک انسان یہاں قدم دھرتے نظر پڑتے تھے۔ دیے جلتے تھے، مگر کوئی بھی ان کی لوؤں کو شوق سے نہیں دیکھتا تھا۔ ان دیوں پر چڑیلیں رقص کرتی تھیں اور جادو کے غیر مرئی ہنڈولے تیرتے تھے۔ جو آن کی آن میں اپنے دیکھنے والے کے شریر سے لپٹتے اور روح کھینچ لیتے تھے۔ یہاں کا ہر دن خوشیوں بھرا اور ہر رات ڈراؤنی تھی۔ دیوالی کی ایک رات جب یہاں کے مہا پنڈت کی موت ہوئی تو بہت سے ان دیکھے حصار بین کرتی آوازوں سے ٹوٹے تھے۔ اور یادگار کے پتھریلے اور پختہ پن میں کٹاؤ پڑ گئے تھے۔ آکاش سے بدروحیں اترنے کی وہ پہلی رات تھی جب منڈیروں پر رکھے تمام دیوں

کے بجھنے سے پہلے ہی یہاں سے انسان تقریباً ناپید ہو گیا تھا۔ آخری دیے کی لو بجھی تھی اور لہراتے دھویں کی لکیر سے اس نے جنم لیا۔ اس کے آس پاس دور ونزدیک اس کے جیسی مخلوق تھی، شعور مکمل جاگنے پر اس کے علم میں آیا کہ پرلی طرف مندروں کی قطار ہے جہاں بھجن کے ڈراؤنے سے شبد جس مخلوق کے منہ سے نکلتے ہیں وہ انسان ہیں۔ انہی کی طرح کھاتے پیتے اور جماع کرتے ہیں۔ وہ اپنے حلول کو فضا میں لہرا کر کئی بار ان کے درمیان وقت گزار چکا تھا۔ وہ مکر و فریب سے مزین اندھیروں میں ڈوبے انسان تھے۔ کسی کا چہرہ روشن نہ تھا۔ بلکہ وہ انسان تو اسے اپنے ہم جنسوں سے بھی بھیانک دکھائی دیتے تھے۔ جبکہ وہ سنتا آیا تھا کہ انسان بڑی خوبصورت مخلوق ہے۔

آج اس خرابے کی چہار گرد ویرانی میں جس انسان نے رات کے اس سمے قدم رکھا، اس کا سایہ بھی خوبصورت تھا۔ وجود تو دمک جانے کی حد تک پرنور تھا۔

بھیروں ناچتی ویران فضا میں اچانک ہلکی سی سنسناہٹ ابھری۔ اور رات کے نیم اندھیرے میں دو چمکتے تیر نظر آئے، جو کہ اپنی کمان سے نکل چکے تھے۔ سایہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ حیرت کی بات تھی کہ گولی کی رفتار سے آتے تیر اچانک فضا میں ٹھہر گئے، یوں جیسے کسی غیبی طاقت نے سفر کے درمیان میں ہی ان کو دبوچ لیا ہو۔ کہر میں ڈوبی وادی ایک بار پھر سنسناہٹ سے گونجی اور فضا میں معلق تیر واپس مڑ کر غائب ہو گئے۔ دو مکروہ چیخیں گونجیں اور خاموشی چھا گئی۔

☆......☆......☆

اگرچہ یہ قافلے گزرنے کا دور نہیں تھا۔ مگر وہ دونوں میاں بیوی ایک قافلے سے ہی بچھڑے تھے۔ رنگون سے مقامی مسلمان شہریوں کا انخلا ۶ بڑی تیزی سے جاری تھا۔ جاپان نے رنگون پر حملہ کر دیا تھا اور وہاں کی فوجی طاقت کا دفاع جاپانی یلغار کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ جاپانیوں کی یلغار اور برمی لوگوں سے مول لی گئی جان لیوا دشمنی سے گھبرا کر رنگون کے غیر برمی شہری اپنی دکانیں، گھر اور جائیدادیں چھوڑ کر جنگل کی طرف پیدل چل پڑے تھے۔ ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ دلوں میں موہوم سا ایک خیال تھا کہ جنگل سے نکل کر وہ چٹا کانگ جا نکلیں گے جہاں کی انگریز برٹش فوج جنگ سے گھبرا کر بھاگ نکلی تھی۔ جہاں فوج ہی نہیں باقی رہی تھی تو ان بے یار و مددگار لوگوں کو کون پوچھتا۔ یہی سوچ کر خود بخود ہی ان کے چھوٹے بڑے قافلے بنتے چلے گئے، کہ شاید چٹا کانگ میں انہیں پناہ مل جائے۔ سفر کے شروع میں ان کی دس سالہ بیٹی بھی ان کے ساتھ تھی، خراماں بہ منزل قافلے پر اچانک ہاتھیوں کے غول نے حملہ کر دیا۔ جس کو جدھر پناہ ملی دبک گیا۔ ہاتھی میلوں پھیلے جنگل میں دندنا رہے تھے۔ ان کی مست چال سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہیں۔ ہیں۔ ایک لمحے کو لگا جیسے یہ کسی آہنی قوت کے معمول ہیں۔

اور یہ جنگل کسی جادوگر کا ڈراؤنا معمل......

ہاتھیوں نے صرف ان کے قافلے کو خوفزدہ کیا اور ایک جانب دندناتے گئے۔ ان کا رخ واپسی کی طرف تھا۔ آخری ہاتھی نے اپنے کان ہلائے، چنگھاڑ بلند کی اور ان دونوں میاں بیوی کی طرف بڑھا۔ ان کی دس سالہ بٹی ایک مچان تلے بیٹھی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہاتھی نے سونڈ نیچے کی اور دس سالہ لڑکی کو لپیٹ لیا۔ جنگل لڑکی کی زوردار چیخ اور اس کی ماں کی آہ و بکا سے گونج اٹھا۔ واپسی کے سفر پر دندناتے ہاتھی کے پیچھے اس کا باپ بے اختیار ہو کر بھاگا اور ماں بھی پاگل پن میں اپنی بچی کو آوازیں دیتی بھاگنے لگی۔ ہاتھی جنگل میں روپوش ہو گیا۔ قافلہ بہت پیچھے رہ گیا۔ شاید آگے چل پڑا ہو۔ اور وہ دونوں سنسان جنگل میں تنہا بھٹکتے رہ گئے۔ بھوک سے دونوں کا برا حال تھا۔ جسم و جاں میں رچی نقاہٹ ان کو نڈھال کیے دے رہی تھی۔ شام ہو گئی اور ان کا سفر بھول بھلیوں کا پیچیدہ چکر ہی ثابت ہوا۔ وہ اپنی بچی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے واپس وہیں آ کھڑے تھے جہاں ہاتھیوں کے غول نے حملہ کیا تھا۔ قافلے کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بیٹی کی جدائی کو خدا کی مرضی جان کر وہ ستانے بیٹھ گئے۔ یہ ایک ٹیڑھی میڑھی چٹان تھی جس کا رنگ رات کے اندھیرے میں سیاہ ہی نظر آ رہا تھا۔ یہاں سے ہولناک جنگل چاندنی کی چھاؤں میں سویا نظر آتا تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ سر جھکائے درختوں کے پتے اپنی جنبش کی سرسراہٹ سے تناؤ بھرے ماحول کو آواز کا لباس پہنانے کی کوشش کر رہے تھے مگر ہر طرف پھیلے سناٹے اور ہلکے اندھیرے نے پہلے ہی ہر چیز کی برہنگی چھپا دی تھی۔ ابھی وہ چٹان پر ستانے کے لیے بیٹھ ہی رہے تھے کہ ایک سنسناتی آواز سے سناٹے کی تان میں بھرپور ارتعاش ہوا اور سامنے کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں خوف حیرت سے پھیل گئیں۔ دو روشن تیر، جن کی نوک پر آتش گیر مادہ لگا ہوا تھا، سنسناتے ہوئے اپنے حدف تک پہنچنے سے پہلے یکدم بیچ سفر میں ہی ٹھہر گئے، یوں جیسے کسی غیبی قوت نے ان کا راستہ روک دیا ہو۔ رکے ہوئے تیروں کے بالمقابل ایک سفید ریش بزرگ مدھم سا نظر آ رہا تھا۔ تیروں کے سرے پر جلتے دو چھوٹے چھوٹے الاؤ سفید ریش کے پرنور دمکتے چہرے کو مزید واضح کرنے لگے۔ اس کے چہرے پر حیرت رقم تھی۔ یہ لمحہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ اچانک تیر واپس مڑے اور اسی تیزی سے آگے بڑھے۔ دو بھیانک چیخیں اپنی مکروہ آواز سے تنی فضا کو دہلا گئیں۔

☆......☆......☆

یادگار کی منڈیر پر رکھا چاند پھٹے ہوئے ایک بادل کی ٹکڑی میں ایک لحظہ محجوب ہوا تھا اور چاند کے عقب میں جھانکتی دو آنکھیں بھی جیسے سو گئیں۔ بادل کے ساتھ ساتھ چلتا وہ لہرایا اور نیچے کا رخ کیا۔ چاند کے جسم سے بادل کی چادر سرکتی جا رہی تھی۔ لہراتا سایہ زمین کی طرف آ رہا تھا۔ چاند کی نرم کرنوں تلے چلتا بادل کا سایہ اس کا ہمسفر تھا۔ اپنے اس ہمسفر کی آڑ لے کر وہ زمین پر اترا اور بے

تابانہ انداز میں یادگار کی شش دری کے ساتھ لاٹھی پر سہارا لیے ایک بزرگ سفید ریش کی طرف چلا تھا۔ یہ انسان مندروں کی قطار میں بستے کاہنوں اور پنڈتوں کے برعکس بے حد خوب صورت تھا۔ اس کی نورانی صورت خود بخود ہی احترام کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس کے منہ سے نکلتے کلام کی وجد آفریں حلاوت بیابان کی ساکت بندھی فضا کو گنگنانے پر مجبور کرنے لگی تھی۔ یہ الفاظ اس کے لیے غیر معروف تھے، مگر لگتا تھا ان سے اس کی آشنائی جیسے بہت ہی پرانی ہے۔ وہ دم بخود رہ گیا اور بے خود سا چلا۔ ستاتے سفید ریش کی طرف وہ قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس کی سماعت میں موت کی سی سنسناہٹ گونجی۔ بڑھتے بھڑکتے شعلے پہنے دو تیر تیزی سے بزرگ کی طرف لپکے۔ اپنے آپ میں قدرت کی تفویض کردہ صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ اچکا اور انتہائی تیزی سے سفید ریش کی طرف بڑھتے آتشی تیروں کو درمیان میں ہی اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سفید ریش کی حیرانی کو اپنے ہونٹوں مسکراہٹ سجا کر ملاحظہ کیا اور دونوں تیر واپس اسی جانب ہی جھونک دیے جہاں سے آئے تھے۔ کمان کے زور کے بغیر تیر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے چلے اور اپنے چلانے والے شکاریوں کو ہی شکار کر گئے۔ دو انسانوں کے منہ سے یقینی موت سے پہلے کی چیخ نکلی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

☆......☆......☆

دنیا کی مادی ترقی اور روایتی حالت دیکھ کر مولانا عمر فاروق کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گناہوں کی دلدل میں بری طرح دھنس چکی ہے۔ اسلامی اقتدار کا چہرہ بری طرح مسخ کر کے بدعات کا روغن لگا کر اسے مذہب سے منسوب کرتے ہوئے احکام الٰہی سے جوڑا جا رہا تھا۔ جو چند لوگ ان کو عبادت گزار نظر آتے تھے، ان کی بھی اکثریت بدعات و رسومات پر کاربند تھی۔ اور ثواب سمجھ کر نئے اعمال کیے جا رہی تھی۔ چند لوگ تھے جو دین حق کی احق انداز میں تبلیغ کرتے اور اعمال کی ترتیب پیش کرتے تھے۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں ہمیشہ طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے اور معتوب ٹھہرتے۔ مولانا عمر فاروق بھی انہی چند لوگوں میں شامل تھے۔ ان کا دل اس دنیا سے اچاٹ تھا۔ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی انہوں نے دنیاوی ترقی کو ترجیح نہ دی تھی۔ دنیا والوں سے الگ تھلگ رہتے۔ اللہ کی طرف سے عطا کردہ اپنی دولت کو دین اسلام کی ترویج کے مختلف مصارف میں خرچ کرتے اور ملکوں ملکوں گھوم کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرتے تھے۔ شادابیوں کی ہر رت کو قریب سے دیکھنے کی لگن اور بعد ازاں واحد لاشریک کی مدح و ثنا ان کی طبیعت میں گویا رچ گئی تھی۔ ان کے قلب و نظر اور زبان ہمیشہ قرآن کی آیات سے تر رہتے تھے۔ اس وقت دوران سیاحت انہیں معلوم پڑا کہ شمالی جنگلات میں ہندوانہ عقائد کے پروردہ لوگ گروہوں کی شکل میں رہتے ہیں، ان کا طرز زندگی اپنا علیحدہ کوئی نام نہیں رکھتا۔ تہذیب کا وہاں بے حد فقدان ہے اور وہ

لوگ خدائے لم یزل کے وجود سے ہی ابھی تک ناواقف ہیں۔

ان کی نظر میں یہ بھی اللہ کی قدرت کا ایک رنگ تھا کہ اس نے ایک پوش خطے کو ابھی تک ضیائے ہدایت سے دور اور محروم رکھا تھا۔ ان کی تقدیر ان کے ساتھ تھی۔ انہی پر ہی منحصر تھا کہ وہ زندگی کو مقصد کے ساتھ گزاریں یا پھر بعد از موت اپنے گلے کا طوق بنا دیں۔

یہ سوچ کر انہوں نے وہاں کا قصد کیا تھا کہ شاید اللہ نے انہیں ہی ان کا راہبر بنانے کے لیے منتخب کر لیا ہو۔ وہ اس وقت اکیلے نہیں تھے۔ ان کے دو شاگرد احسن اور عبدالہادی بھی ان کے ساتھ اس سفر میں شریک تھے، جو کہ اس ویرانے کے اطراف چوکس اور تفہیمانہ انداز میں گھنگال رہے تھے۔ حضرت جی (مولانا عمر فاروق) کی معلومات کے مطابق ان دونوں کو چاروں جانب انسانی آبادی اور رہائشوں کے تناسب کا اندازہ لگا کر اس جنگل کی پوربی جانب ایک کماری کی شش دریوں والی یادگار پر پڑاؤ کرنا تھا، جہاں حضرت جی پہلے سے ہی موجود ہوتے۔

حضرت جی اپنی ازلی فطرت سے مجبور تھے اور آیات قرآنی خود بخود ان کی زبان سے جاری ہو رہی تھیں۔ نیم تاریک ماحول سے آنکھیں اب مکمل طور پر آشنا ہو چکی تھیں۔ ہر طرف عجیب قسم کی کی ایک آسیب زدگی بسی ہوئی تھی۔ پراسرار ماحول کی نم زمین کے سیل خوردہ در و دیوار تھے، جن سے کوئی بھی انسان فی الفور بھاگ جانا چاہے۔ چہار گرد پھیلی بوئے مرگ مری فضا پر بھکے دار بین کر رہی تھی۔ چاندنی کی بیشتر زردی کر جا بجا بکھرے سر جھکائے درختوں نے اپنے پراسرار سایوں سے ڈھک دیا تھا۔ اذیتوں سے ستی فضا اچانک تیز سنسناہٹ سے لرزی تھی۔ حضرت جی ٹھٹکے۔ ان کے حیران ہونے کی دیر میں ہی سنسناہٹ دوبارہ ہوئی اور دونوں تیر انہیں اپنا شکار بنانے سے پہلے ہی واپس مڑے اور واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس سفر کی منزل تھی دو بھیانک چیخیں۔ ویرانہ کانپ اٹھا۔ وہ ناقابل یقین اس منظر پر اپنے باوقار انداز میں حیرت ہی ٹپکاتے رہے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر تھا اور اور آنکھیں حیرت زدہ انداز میں ابھی بھی سامنے کے لامحدود اندھیرے میں مرکوز تھیں۔ ان کی طرف چلائے گئے تیروں کا واپس مڑنا ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

اپنے دائیں جانب سے قدموں کی آواز پر وہ چونکے۔ دو سے زیادہ قدم معلوم ہو رہے تھے۔ دو وجود ان کے قدموں میں آ گرے۔ ان کا وجود سکتے سے آزاد ہوا اور وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹے۔ یہ ایک مٹی آلود ریش والا مرد تھا اور ایک خستہ حال بکھرے بالوں والی عورت تھی، حزن کے توڑ دینے والے گزرے لمحات ان کے چہروں پر رقم داستان غم سنا رہے تھے، آنکھوں کی جوت دم توڑ چکی تھی اور ویران سی ایک بیابانی تھی جو ان کی نظروں کے خلا کو گہرا کیے دے رہی تھی۔ یوں جیسے ان کی نگاہوں کا ارتکاز کچھ بھی نہ ہو۔ مگر وہ دیکھ حضرت جی کی طرف رہے تھے۔ حضرت جی

نے ان کے اس طرح گھورنے سے کچھ بے چینی محسوس کی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر ان سے کچھ استفسار کرتے، دونوں میاں بیوی نے ان کے قدموں پہ سر رکھ دیا۔ حضرت جی تیزی سے پیچھے ہوئے تھے، دونوں کی اس حرکت پر ان کا چہرہ برہم ہوا تھا۔

”پورا دن گزر گیا ہے محترم بزرگ! پورا دن۔ اب تو کوئی امید بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ہمیں لگتا ہے خدا نے آپ کو ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ ناممکن کو ممکن کر سکتے ہیں۔ آپ ہی ہماری بچی کو واپس دلا سکتے ہیں۔“

میاں بیوی سیدھے ہو بیٹھے تھے، ادھیڑ عمر مفلوک الحال یہ مرد اب ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟۔“

حضرت جی نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا تھا۔ گفتگو کے دوران وہ کم سے کم لفظ استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی ان کے انداز گفتگو سے متانت اور سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی۔

سنجیدہ سے ایک جذبے جیسی کپکپاہٹ مفلوک الحال شخص کے سراپے میں ظاہر ہوئی۔ یقین اور بے یقینی کی عجیب آہنگی کیفیت میں دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عقیدت میں ان کی آنکھیں جھکتی گئیں۔ روحانی سے ایک اطمینان کے گھیراؤ میں بہتے مفلوک الحال نے حضرت جی کو اپنی بپتا سنا ڈالی۔۔۔۔

دھواں دھواں اس فضا کے نگران کی سماعت بھی مفلوک الحال کی داستان غم پر مرکوز رہی۔ ہاتھی کے بچی کو اٹھا کر بھاگ جانے کے ذکر پر اس کا شرارہ تن وتوش شعلہ ہوا تھا۔ احساس کی وادی میں کالی گھٹا امڈ پڑی جو کہ پلک جھپکتے ہی ہاتھیوں کی فوج اور ان کو معمول بنا کر بھیجنے والے خبیس چہرہ لوگوں کو اپنے اتھاہ غضب میں لپیٹ لینا چاہتی تھی۔ آن کی آن میں وہ خباثت سے پر باطن رکھنے والے شیطانوں پر ٹوٹ پڑنے والی موت کا تصور کرنے لگا۔

موت...... جو رزیلوں کا مقدر بن چکی تھی اب......

اس موت کے پس منظر میں خود کو ہی دیکھتے ہوئے وہ لہرایا۔۔۔ حلول میں تیزی آئی اور پلک کی جھپک کے برابر وقفے میں وہ گولی ہو گیا۔ اس رخ کا تعین کر کے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ تصور میں میدانی جنگل تھا جہاں کی کائی سے اٹی زمین کنول کے میلے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔۔۔۔ بڑے بڑے ان پھولوں کے نیچے کیا ہے؟

اس کا تصور کر کے جن ہوتے ہوئے بھی وہ لرز کر رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ اڑتے ہوئے اس نے نیچے نگاہ کی۔ سطح زمین کے نظارے تیزی سے پیچھے کی جانب گامزن تھے۔۔۔۔

نیلی جو سڑک بہت کم وقفے میں گزری وہ سمندر تھا۔۔۔ سبز رنگ کی مدھم ہوتی لکیریں درخت، اور عجب ایک سنسناہٹ سے جو چلاتے خاک کے ڈوبتے جا رہے تھے، وہ ٹیلے تھے۔ اس کی پرواز اب نیچی ہونے لگی۔

چاروں طرف سیاہ کالے سمندر کے درمیانی ٹیلے پر وہ اترا۔۔۔ اوپر نیچے ہوتی موجوں سے ہچکولے کھاتے کناروں کے بتدریج ابھرتے نظاروں میں وہ دلدلی سی ایک زمین تھی۔۔۔۔ کنول کے بڑے بڑے پھول جا بجا بکھرے آلودہ تالابوں کو اپنے وجود سے ڈھک رہے تھے۔۔۔۔ پھولوں کے ہلنے سے یوں محسوس ہوتا جیسے ان کی ڈنڈیاں خوف سے مچل رہی ہوں۔۔۔۔ پھولوں کے نیچے کا یہاں خونی جونکوں کا مسکن تھا۔ ہزاروں لاکھوں جونکیں کنول کی چھت تلے آرام کر رہی تھیں۔۔۔ بہتی موجوں کا جوش سمندر میں تلاطم پیدا کرتا تو تالابوں میں بسی جونکوں کا ہزار پا کلبلا اٹھتا اور کنول کے پھول اپنی ڈنڈیوں سے مچل جاتے۔۔۔۔ قدرے خشک ایک جگہ پر زندگی کی ہلچل محسوس کر کے وہ اس طرف بڑھا۔ یہ آوازوں کے آثار تھے، جن کے مخرج تھے کالے دل، کالے دلوں کے حامل نور ہدایت سے خالی سینے۔۔۔ خشونت زدہ چہرے اور من کے سیاہ سراپے وہ دور سے ہی دیکھنے لگا۔۔۔ یہ کماری کی یادگار کی پچھلی سمت رہنے والے پنڈت تھے۔ ان سب کے منہ سے ان کے مخصوص ڈراؤنے شبد نکل رہے تھے۔۔۔ آواز کا زیر و بم مدھم ہوا۔ اونچی آواز بدبداہٹ میں بدلی اور چھوٹے سے اس مجمع میں ہلچل ہوئی۔ ہلچل کے بعد کی کارروائی وہ جانتا تھا۔ یہ قرنوں کی کہانی تھی، جو تبدیلی زمانہ کے ساتھ ساتھ جاری وساری تھی۔

یہ خطرناک سیلانی جزیرہ انسانی خون کی ناتوانی اور بے گناہوں کی آہ و بکا کا پنج صدی گواہ تھا۔ گذشتہ پانچ صدیوں سے ہر ایک سال بعد زمین کی تہہ میں بیٹھے نادیدہ دیوتاؤں کے قدموں میں ایک نوجوان یا بھلے نابالغ لڑکی کی بھینٹ دی جاتی تھی۔ ہاتھیوں کو معمول بنا کر جنگل میں لڑکی کی تلاش میں دوڑایا جاتا تھا۔ پھر نجانے کس طرح میلوں فاصلہ طے کر کے لڑکی کو یہاں لایا جاتا اور زندہ ہی اسے پانی میں پھینک دیا جاتا۔ جب کنول کے پھول اس کے بدن کو ڈھک دیتے تو ہزاروں جونکیں اس سے چمٹ جاتیں۔ نیچے ہی نیچے کھنچے جاتے وجود کو تڑپنے کا موقع تو بہت ملتا مگر چیخنے کا ہر جتن ناکام جاتا تھا۔ اپنے شعور جاگتے ہی وہ اس رسم سے آگاہ تھا۔ بہت دفعہ ہاتھیوں کا پیچھا کرتے ہوئے وہ یادگار سے پرے مندروں کی قطار تک اور اپنی قوت پرواز کے ذریعے یہاں تک آ کر بھینٹ کا نظارہ بھی کر چکا تھا لیکن کبھی ان کے کام میں مخل نہیں ہوا۔ کڑھتا البتہ ضرور رہتا تھا۔ انسان کا تعارف جن الفاظ میں اس سے کرایا گیا تھا وہ اشرف المخلوقات کی اس سرشت پر منطبق نہیں آتے تھے۔۔۔ آج بھی وہ یہاں عین بھینٹ کے وقت آ موجود ہوا تھا۔ مگر اس بار وہ اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا۔ دو غمزدہ انسانوں کے دکھ کا مداوا اسے اس سیلن پر کھینچ لایا تھا۔ اور سب سے الگ دکھائی دیتی ایک نورانی صورت کی دعاؤں کا بھرم رکھنے کے لیے، کہ جب حضرت کے قدموں میں گرنے والے دو میاں بیوی نے امید بھری نظروں

سے ان کی طرف دیکھا تھا تو حضرت جی کا وجیہہ چہروں اس کی نگاہوں میں رہا تھا۔۔۔ ان کے چہرے پر اعتماد کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی کرامت یا روحانی رابطے سے ان کی امید پر پورا اتر سکتے تھے۔ وہ ان کے نورانی چہرے کی طرف دیوانہ وار دیکھے گیا تھا۔ اور عجیب سی ایک سرخوشی اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے اپنے عقیدت مند سراپے کو مہکتا محسوس کرنے لگا تھا۔

''کیوں نا اس بار میں ہی حضرت جی کے کام آ جاؤں۔ شاید تلمذ کا کچھ حق ادا ہو جائے۔''

وہ روحانی طور پر دل ہی دل میں حضرت جی کو اپنا راہنما و پیشوا استاد مان چکا تھا۔ دل میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی حسرت فزوں تر ہوئی تھی اور وہ حضرت جی کا بھرم رکھنے کو اس طرف چلا آیا تھا۔ دل میں حضرت جی کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش بھی تھی۔ پاس آنے پر سب پنڈت بالکل واضح ہو گئے۔ ان کے لیے وہ نادیدہ رہا۔ دس سالہ بچی کو قدرے خشک جگہ پر بنے گرمائی گھر سے برآمد کیا گیا۔ دو پنڈت مل کر اسے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنے انجام سے واقف نہیں تھی۔ بس روئے جا رہی تھی۔ اس طرح ان لوگوں کا اسے اٹھا کر سیلانی کی طرف لانا اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بس اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رو رہی تھی۔۔۔ نادیدہ نگراں نے اپنے حلول کو لہرایا۔ لمحوں کی دیر میں وہ لڑکی کے جسم میں داخل ہو چکا تھا۔ زمردیں گیاہ پر لڑکی کو اٹھا کر لاتے ہوئے پنڈتوں کے پیر پھسلے اور وہ لہراتی معدوم چیخوں کے ساتھ نیچے گرے۔ لڑکی نے دونوں کو ایک ایک بازو سے سپکڑا اور وہ حیرت انگیز طور پر فضا میں گھوم کر سیدھا کنول کے پھولوں والی دلدلی زمین پر جا پڑے۔۔۔ شدت خوف سے ان کی آوازیں حلقوں میں ہی دب کر رہ گئیں۔ اپنے انجام کا تصور کر کے ان کی قوت ارادی پر سینکڑوں من برف گری تھی، جس کی برودت نے ان پر عجب ایک خود فراموشی طاری کر دی۔ شدت خوف سے وہ خود کو بھول گئے۔ بے ہوشی کا اتھاہ غار ان کو نگلنے کو بے تاب ہوا تو کنول کے پھول اپنی ڈنڈیوں سے مچل گئے۔ ہزاروں جونکوں نے چمٹ کر ان کے جسم غرقاب کر لیے تھے۔۔۔ باقی ماندہ پنڈت بھاگنے ہی لگے تھے کہ راہ فرار ہر طرف دکھائی دیتے ایک حصار میں مسدود پائی۔۔۔ لڑکی نے ویڈیو گیم کے ہمینے کی طرح حرکت کی اور اس کی ٹکر ایک پنڈت کے پیٹ میں پڑی۔۔۔ اچھلتا پنڈت ناپاک چیخیں خارج کرتا دلدلی موت کے جبڑوں میں بھنچ گیا۔ باری باری سب لوگوں کو جونکوں کی ضیافت کا سامان بنا کر لڑکی کے جسم میں رہتے ہی وہ واپس ہوا۔ اور ایک بار پھر ٹیلوں کے خاکے، ہم رنگ درختوں کی مدھم لکیریں اور سمندر کی نیلی سڑک ملاحظہ کرتا وہ وسطی ہند کے اسی جنگل میں پہنچ گیا۔ منڈیر پر رکا چاند بدلی کے پیچھے محجوب ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کا جسم آزاد کیا اور یادگار کی منڈیر پر جا

بیٹھا۔ سایہ دار خاکی ویرانہ لڑکی کی خوفزدہ چیخوں سے کانپ اٹھا۔ ویرانہ انتہائی خوف بھری فضا کا حامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بدن آزاد ہونے کی وجہ سے لڑکی کی طویل چیخیں بتدریج پر اضمحلال کراہوں میں بدل رہی تھیں۔۔۔ درختوں کے درمیان چھٹکتی چاندنی میں زمینی بچھونے پر بیٹھے مولانا عمر فاروق نے خدا کے حضور ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ پاس ہی بیٹھے دونوں میاں بیوی نے چیخوں کی آواز سنی تو آواز کی سمت دوڑ پڑے۔ حضرت جی مسکراتے ہوئے دعا ختم کی اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ ان کے دونوں شاگرد پہنچنے ہی والے تھے۔۔۔ کچھ دن پڑاؤ کے لیے انہوں نے قدرے آبادی والی جگہ کا انتظام کرنا تھا۔ تاکہ گمراہی میں ڈوبی خلق خدا کو راہ راست دکھائی جائے۔ منڈیر پر بیٹھا دھواں دھواں فضا کا نگران ان کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

حضرت جی کا اس جگہ پر قیام بے سود ہی رہا۔ یہ چرواہوں کا مسکن تھا۔ بیچ بیچ جنگل میں اینٹوں کے بھٹے اور مختلف انڈسٹریز تھیں۔ دونوں میاں بیوی اپنی بچی کو پا کر بے حد خوش تھے۔ عقیدت سے وہ ان کے قدموں میں بچھے جا رہے تھے۔ وہ اس وعدے پر ان سے رخصت ہوئے تھے کہ راستے بھر جو بھی ملا اسے حضرت جی کے پڑاؤ کی راہ دکھائیں گے۔ پریشان حال لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف راغب کریں گے۔ اور حضرت جی کے پیغام توحید کا حوالہ دے کر لوگوں کو ادھر بھیجیں گے۔ لیکن دو دن گزر جانے کے باوجود کوئی بھی شخص ادھر نہ آیا۔ حضرت جی نے اپنے شاگردوں کے ساتھ چل پھر کر بھی لوگوں کے ساتھ گفتگو کی۔ مگر یہاں بستے چرواہوں نے ان کی کسی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ پاس بیٹھنا تو دور ہ کی بات کسی نے مناسب جگہ پر حضرت جی کو ایک چھولداری تک ڈال کر نہ دی۔۔۔ حضرت جی کو کچھ رنج نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مہر لگے دل ہیں، جو دھڑکنا نہیں جانتے۔ وہ تو بس خالق کائنات کی قدرت کے نظاروں سے محظوظ ہونے اور اس کی تحمید و تقدیس کے لیے دنیا پھرتے تھے۔۔۔ تبلیغ کا کام بھی ضمنی طور پر مگر فرض سمجھ کر کرتے رہتے تھے۔ زاد سفر ختم ہونے کو تھا۔ واپسی کا ارادہ لے کر حضرت جی کے شاگردوں نے مختصر سامان باندھ لیے تھے۔ صبح ہوتے ہی انہیں یہاں سے کوچ کرنا تھا۔

☆......☆......☆

ظلمتوں کے لشکر صبح کے اجالے نے اپنی آغوش میں کھینچ لیے تھے۔ لمحات کی تیزی دن رات کے تسلسل کا ایک اور خانہ پھلانگ گئی تھی۔ حضرت جی کا یہاں قیام مختصر ترین رہا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں آدھے کامیاب رہے تھے۔ فطرت کی گود میں سوئے کچھ یاس بھرے رنگوں نے ان کے گرد حالہ کیا تھا مگر ان کے گرد چھوٹا سا جہاں آباد کیے لوگ ان کی طرف کھنچ نہ سکے تھے۔ ازل سے گمراہی میں رہتے یہ انسان اب بھی مہر بہ قلب ہی تھے۔

ان کی تبلیغ بے اثر رہی تھی۔ مگر عزم کے قلزم میں ملال کی ایک بھی موج نہیں تھی۔ وہ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے واپس ہو رہے تھے۔ عبدالہادی اور احسن کے ساتھ ایک اور شاگرد کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ سامان باندھنے کے دوران وہ اچانک ظاہر ہوا تھا۔ لمبے قد کے ساتھ مضبوط تن و توش کا شخص تھا۔ چہرے پر آگ سی تپش کی سرخی تھی اور اس کا لباس اس کے بدن سے بہت کم لگتا تھا۔ ہوا ہو نہ ہو پھڑ پھڑاتا رہتا تھا۔ عبدالہادی اور احسن حیرت و خوف میں ہی رہتے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے خود ہی مولانا عمر فاروق کو سچ بتا دیا تھا کہ وہ ایک جن ہے، جو ان کے منہ سے کلام معطر کی تلاوت سے فضا کو یگانہ آفاق ہوتے محسوس کر چکا ہے۔ حضرت جی کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔۔۔ عبدالہادی اور احسن کے لیے اس کا یوں ظاہر ہونا اور اپنا آپ کو جن کہنا ایک حادثے سے کم نہ تھا مگر اس کا نیک مقصد جان کر وہ مطمئن ہوئے تھے، وہ حضرت جی کے ساتھ رہ کر کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔ ان کو ایک قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس مخلوق کی رونمائی نے حضرت جی کے ادب کی وجہ سے در آئی خموشی اور عجب سے ایک ناکامی جیسے ملال کی کھٹاس کو کاٹ دیا تھا۔ اس کا نام رضوان تجویز کیا گیا۔

دوران سفر رضوان کو شوق چرایا کہ وہ اپنا آپ مکمل طور پر واضح کر دے۔

''حضرت جی!''

وہ باادب گویا ہوا۔

''جی''

''میں نے آپ سے علم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''بہت اچھا فیصلہ ہے۔ ماشاء اللہ۔ مجھے توقع تھی کہ تمہارا میرے ساتھ چل پڑنا نیک مقصد رکھتا ہے۔''

''مگر اس سے پہلے میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

''دکھاؤ دکھاؤ۔''

حضرت جی بھی مشتاق ہوئے تھے۔

''آپ کو دیکھتے ہی جو پہلی سوچ مجھے آئی اسے صدق دل سے میں نے اپنا مقصد جان لیا تھا۔ وہ مقصد تا عمر آپ کی خدمت گزاری میں اپنی زندگی فنا کر دینے کا ہے۔''

''بہت اچھے بھئی! ادب ہی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے۔''

حضرت جی نے دعا دی۔

''آپ کے منہ سے نکلی ہر بات کی مکمل ہونے سے پہلے ہی تعمیل کر سکتا ہوں۔

''وہ کیسے بھلا؟'' حضرت جی حیران ہوئے۔

''حکم دے کر دیکھ لیجیے۔''

''اچھا۔۔۔ یہ بات ہے؟ تو چلو یہ درخت اکھاڑ دو۔''

حضرت جی بھی خوش گوار موڈ میں تھے۔ احسن اور عبدالہادی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اکثر سنجیدہ رہتے تھے۔۔ سفر کے دوران ان کی یہ خوش گپیاں بھلی لگ رہی تھیں، مگر یقین مشکل سے آ رہا تھا کہ یہ بھی

حضرت جی کا روپ ہے۔

''ابھی لیں''

رضوان نے کہا اور اپنا ہاتھ لمبا کیا۔ ہاتھ لمبا ہوتا گیا۔ جوں جوں ہاتھ آگے بڑھتا گیا توں توں خوف و حیرت سے عبدالہادی اور احسن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اتنا لمبا ہاتھ وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ حیرت کی زیادتی سے بے ہوش ہو جاتے، رضوان نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔۔ اس کے پنجے نے درخت کے مکمل تنے کا احاطہ کیا تھا۔ درخت ایک جھٹکے سے جڑوں سے اکھڑ کر نیچے آ رہا۔

حضرت جی بھی بس حیرت ٹپکاتے رہے تھے۔

''جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو دیکھتے ہی آپ کی مدد کرنے کا مجھے موقع مل گیا۔ آپ کی طرف چلائے گئے تیروں کو فضا میں ہی تھام لینے والا کوئی اور نہیں میں ہی تھا۔ آپ کے قدموں میں گرے دو فریادیوں کی دادرسی میں نے ہی کی۔ دیوتاؤں کے قدموں میں بھینٹ کے لیے منتخب ہو چکی ان کی بیٹی کو پنڈتوں کے چنگل سے چھڑا کر میں ہی واپس لے آیا تھا۔ آپ پر تیر بھی انہی پنڈتوں نے چلائے تھے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔''

''یہ سب کام تم نے کس کی ایما پر کیے؟''

حضرت جی کے لہجے میں برہمی تھی۔

''اپنی ایما پر۔۔۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہی نہیں۔''

''مگر تمہاری باتوں سے خودی کی بو آتی ہے۔ محض خودی کی۔'' حضرت جی نے غور سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے جلد ہی کوچ کر لیا۔ ورنہ ان دونوں میاں بیوی کی باتوں سے متاثر ہو کر کچھ لوگ ہمیں خدا سمجھ بیٹھتے۔ تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے پیچھے قدرت کا ہاتھ کارفرما ہے۔ خدا چاہے تو ہمارا چلنا یہاں ہی رک سکتا ہے۔ تمہاری ہست قوت پرواز کو قدرت کا ہاتھ نیست کر سکتا ہے۔

''مم۔۔۔ مگر۔۔''

''جانتا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نہ کہ کسی کی ایما پر یہ کام نہ ہونے کے باوجود بھی اللہ کے حکم سے ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے حکم کے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔''

حضرت جی مخل ہوئے۔

''جی۔''

وہ ہلکے سے بولا۔

''لیکن اس کے باوجود بھی تمہیں سزا دینا ضروری ہے۔''

''کک۔۔۔ کیسی سزا؟''

اس کا دل دہل گیا۔ وہ جانتا تھا جسمانی سزا نے اس پر بالکل اثر نہیں کرنا۔ وہ کسی ایسی سزا کے متعلق سوچنے لگا تھا جس میں حضرت جی کی رفاقت سے محروم ہو جانے کا خدشہ کلبلا رہا تھا۔

''تم ابھی ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔''

دوٹوک لہجے میں دیا گیا یہ حکم اس کی روح تک کو ویران کر گیا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کے گرد

اندیشوں کی اڑتی دھول میں حادثوں کی راکھ دیکھ رہا تھا۔

حادثے۔۔۔ جو اس کے دل و دماغ میں ہونے تھے۔

حادثے۔۔۔ جن کی رونمائی سے اس کے اندر کچھ بچنا ہی نہیں تھا۔ سوائے فراق کے خزاں بار موسم اور وصل کے شدید انتظار کے۔

''جی۔۔۔ ٹھیک ہے۔'' وہ مرے مرے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ عبدالہادی اور احسن کو اسے اس طرح یہاں چھوڑ جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن حضرت جی کے حکم سے سرتابی کی تاب خود اس میں ہی نہیں تھی۔ سو وہ دونوں بھی خاموش ہی رہے تھے۔

''گھبراؤ نہیں۔ یہ سزا نہیں، تمہارا پہلا سبق ہے۔ اسے یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا۔ اس کے بعد تمہیں میرے پاس چلے آنے کی اجازت ہوگی۔''

حضرت جی نرم سا مسکرائے تھے۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

''تمہارا پہلا سبق۔''

انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''آئینہ حیات میں ضرور جھانک..... مگر اس طرح نہیں کہ اپنے آپ کے سوا کچھ دکھائی ہی نہ دے۔

فطرت کے ساز کو سننے کی کوشش کر۔۔۔ مگر اس طرح نہیں کہ اپنے سوا کچھ سنائی ہی نہ دے۔

قفص حیات میں اپنی سوچ کو یوں محدود تو نہ کر۔۔ کہ اپنی ''خودی'' کے علاوہ تجھے کچھ ملے ہی نہیں۔

اگر زندگی کا ہر تجربہ، ہر مشاہدہ اور زندگی کا ہر راز تیرا اپنا راز رہے گا تو یاد رکھ کہ اس تلاش مسلسل میں اپنے ہی وجود کے سوا تیرے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

حضرت جی خاموش ہوئے۔ اس نے تفہیمی انداز میں بار بار سر ہلایا تھا۔

''تمہاری تخلیق آگ سے ہے۔ آگ ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہے۔ اوج و علا اور بلند ہونا ہی جانتی ہے۔ تمہارے اندر عاجزی کا بہت فقدان ہے۔ بمقابلہ انسان کے، کہ اس کی تخلیق مٹی سے ہے۔ اور مٹی نیچے بیٹھنا جانتی ہے۔

یہ سبق یاد کرلو۔ اگر اپنے عمل کے ذریعے تم اپنی عاجزی کو مارنے پر قادر ہو گئے تو پھر اگلے سبق کے لیے مجھ تک آنا۔''

کہہ کر انہوں نے ہادی اور احسن کو اشارہ کیا اور واپسی کی راہ لی۔

وہ تنہا کھڑا رہ گیا۔ مگر مسکرا رہا تھا۔

''سبق تو حضرت جی مجھے یاد ہو گیا ہے۔ اب اس پر عمل کروں گا۔ یہاں میں زندگی کی حفاظت کروں گا اور موت کی ارزانی کا مقابلہ۔۔

۔مگر اس میں میری خودی سے زیادہ آپ کے حکم کا دخل ہوگا۔''

سوچتے ہوئے خود بخود یادگار کی پچھلی طرف کفر کی کالک میں اوجھل پنڈتوں کے کریہہ چہرے اس کے تصور کے فریم میں آ گئے تھے۔

□□.....❁.....□□

طارق ملک

محبت کے حسین جذبات کا شاعر

ایم اے خالق بھٹی

اللہ آباد ریاست بہاول پور کے فرمانرواں کا ابتدائی دار الحکومت رہا ہے۔ یہ مردم خیز دھرتی ہے اور بہت سے عالم دین، شاعر، ادیب، دانشور، بہادر اور جری شخصیات کو پیدا کیا انہی شخصیات میں ایک نام طارق ملک کا بھی ہے۔ طارق ملک کا اصل نام محمد طارق ہے اور وہ 15 جون 1975ء کو اللہ آباد میں حاجی عبدالقادر کے گھر پیدا ہوئے، بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ شعر و سخن سے شروع سے دلچسپی تھی اس لیے لیاقت پور کے معروف شاعر ضیاء الدین نعیم کی شاگردی اختیار کی۔ صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور مختلف قومی اخبارات میں علاقائی مسائل کے حوالے سے ان کے کالم چھپتے رہتے ہیں۔

طارق ملک بہت عمدہ شاعری کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں ہمیں غمِ دوراں کا غمِ جاناں کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ ان کی غزل میں ہمیں روایتی رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے وہ محبت کو حسین جذبہ قرار دیتے ہیں مگر اس کے انجام وحشت و قیامت سے کم نہیں سمجھتے، محبوب اگر خفا ہو جائے تو زندگی اذیت ناک ہو جاتی ہے ان جذبات کا اظہار ان کی غزل میں اس طرح ملتا ہے۔

چار سو ہجر کی وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں
ہم سمجھتے تھے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
جب سے اک شخص خفا ہے مجھ سے
ان کا آنا بھی قیامت کی طرح ہے طارق
ان کا جانا بھی قیامت کے سوا کچھ بھی نہیں

طارق ملک کے نزدیک محبت میں ہجر و وصال لازمی ہے اور بچھڑتے وقت آنکھوں میں نمی ہوتی ہے اور محبوب کی مسکراہٹ عاشقوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھتی ہے اور ان کا دل محبوب کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوب جانے کو کرتا ہے۔

نمی آنکھوں میں جو اتری ہوئی ہے
بچھڑ جانے کی رُت ٹھہری ہوئی ہے
نجانے کیوں ازل سے یہ محبت
وصال و ہجر میں اُلجھی ہوئی ہے
سرِ محفل وہ جب بھی مسکرائے

زمانے کو غلط فہمی ہوئی ہے
کسی کی جھیل سی آنکھوں میں طارق
میری دنیائے دل ڈوبی ہوئی ہے

مختصر بحر میں طارق ملک خوب صورت غزل کہتے ہیں' وہ دل کو ایک گاؤں سے تشبیہہ دیتے ہیں اور محبوب کی آمد سے خزاں کے موسم میں بھی پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ محبوب کے گیسوؤں کی خوشبو کو ہواؤں میں محسوس کرتے ہیں اور محبوب کی اذیتوں کو بھی برداشت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

وہ جو آئے ہیں دل کے گاؤں میں
پھول کھلنے لگے خزاؤں میں
آج گیسو نہیں سنوارے کیا؟
اس نے طارق اذیتیں بخشیں
ہم نے مانگا تجھے دعاؤں میں

شاعر معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے بیگانہ نہیں رہ سکتا' طارق ملک معدوم ہوتی ہوئی ثقافتی اقدار کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ ان کی حفاظت کرنے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں' وہ دستار' کردار' گفتار اور قول و قرار کی مٹتی ہوئی اقدار کو بچانے کے لیے سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔

ہم نے دستار کی حفاظت کی
اپنے کردار کی حفاظت کی
دل دکھایا نہیں کسی کا بھی
اپنی گفتار کی حفاظت کی
اس قبیلے کا فرد ہوں جس نے
قول و اقرار کی حفاظت کی
رکھ کے طارق یہ جاں ہتھیلی پر
اپنی اقدار کی حفاظت کی

دنیا کی حقیقت کو ہر ایک نے اپنے نقطہ نظر سے بیان کیا' طارق ملک دنیا کو نظر کا دھوکا یعنی سراب کی حیثیت دیتے ہیں اور اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اک مکمل سراب ہے دنیا
خواب ہے صرف خواب ہے دنیا
پھول خوشیوں کے کم ہی کھلتے ہیں
رنج و غم ہے عذاب ہے دنیا

طارق ملک غزل میں کلاسیکل روایت کے پیروکار ہیں اور کلاسیکی شاعر محبت کے لطیف جذبات اور اس کے نتیجے میں محبوب کی طرف سے ملنے والی درد و غم کی سوغات کو بھی نعمت سمجھتے ہیں' طارق ملک اس واردات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کیسے ہوتی تھی ان سے محبت نہ پوچھیے
اتری تھی کیسے دل میں وہ صورت نہ پوچھیے
اک ہم نہیں ہیں ان کا زمانہ شکار ہے
تیر نگاہ یار کی قیمت نہ پوچھیے
لہرا کے اس نے ہاتھ کو جب الوداع کہا
طارق جو گزری دل پہ قیامت نہ پوچھیے

محبوب کی طرف سے ملنے والے دکھ درد عاشق کے لیے سوغات ہوتے ہیں اور وہ ان کو سہہ کر بھی محبوب کو دعائیں دیتے ہیں۔

ان نگاہوں کی خیر ہو مولا!
ہم کو زخموں سے آشنائی دی
ان کے قدموں کی دھول میں طارق
کہکشاں سی ہمیں دکھائی دی

الغرض طارق ملک کی شاعری محبت کے موضوع کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے' وہ ایک مکمل شاعر ہے اور قافیہ ردیف بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتا ہے اور ضلع رحیم یار خان کے شعراء میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ.....

□□.....❁.....□□

عشق نمبر

کون ہے ایسا جس نے عشق نہ کیا ہو؟

راتوں کو جاگ کر محبوب سے ملنے کی آرزو نہ کی ہو.....

بے وفائی پر جان بھی دینے والے کم نہیں

اپنے اردگرد نظر ڈالیے اور صفحہ قرطاس پر بکھیر دیجیے' عشق کی وہ داستان جس کو لکھنے والا قلم بھی سیاہی نہیں لہو بکھیرتا ہے.....

ہر لفظ چیختا' بلکتا محسوس ہوتا ہے

لکھنے والے ہاتھ کپکپاتے ہیں اور آنکھیں خون بہاتی ہیں

ایسی عشق کی داستان قلم کریں جس کو پڑھ کر مجنوں بھی لیلہ لیلہ کرتا ماضی کے اوراق سے نکل آئے

رانجھا بھی گم صم رہ جائے..... مہیوال کی آنکھوں سے محبوبہ کے دریا برد ہونے کا منظر محو ہو جائے' بھنبھور کی وادیاں سسی پنوں کو پھر سے یاد کریں اور جام تماچی نوری کی تلاش میں سرگرداں نظر آئے۔

تصانیف بھیجنے کی آخری تاریخ 10 مئی ہے

سکون کی کھڑکی

''میں کیوں آیا اس دنیا میں؟'' خود سے یہ سوال کر رہا تھا فجر کی اذان کی آواز نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مجھے فلاح کی جانب بلایا جا رہا ہے پھر بھی میں اپنی ہی بھلائی نظر انداز کیوں کر رہا ہوں؟ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھی اور پھر......

سیدہ عروج فاطمہ

دل کی گلیوں میں ویرانی کا راج تھا۔ ہر روز میں سونے سے قبل چھت کو غور سے دیکھتا تھا۔ اینٹیں ہنس کر پوچھتی تھیں فرصت مل گئی ہماری طرف دیکھنے کی؟ پنکھا یہ کہہ کر مذاق اڑاتا تھا اس کے پاس تو آج کل فرصت ہی فرصت ہے اس لیئے تو تمہیں دیکھتا ہے۔

''کب تک خود کو تکلیف دیتے رہو گے؟ اپنا خیال نہیں رکھتے ہو اس طرح تو تم بیمار ہو جاؤ گے ۔ میری وجہ سے تمہاری جان جا سکتی ہے۔'' ایک دن تنہائی نے روتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں تمہاری سنگت میں جلد مر جاؤں گا۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا مجھے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ تنہائی میرے سرہانے بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور اسی دوران مجھے نیند آ گئی۔

''مجھ سے اچھا تو سورج ہے لوگوں کو رات کے اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے ۔'' صبح کا پہلا خیال ہی بہت تکلیف دہ تھا۔

میں خاموش رہنے لگا تھا اور ڈیڈ میری وجہ سے فکر مند رہنے لگے تھے مجھے نئی گاڑی لے کر دی لیکن مجھے خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے۔

''تمہاری ماں زندہ ہوتی تو شاید تم پر کبھی ایسا وقت نہ آتا۔ میں اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے تمہیں کبھی زیادہ وقت ہی نہیں دے پایا۔'' ڈیڈ میرے کمرے میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ۔ وہ بول رہے تھے اور میں خاموشی سے سن رہا تھا ۔

''کچھ کہو گے نہیں؟''

''کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے کیا کہوں بولنے سے پہلے بہت سوچنا پڑتا ہے۔''

''بیٹا تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر......'' وہ بات مکمل نہیں کر پائے تھے۔

''میں ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہوں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو بتا دوں گا۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے میں نے آنکھیں موند لی تھیں دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی کئی آنسوؤں نے میری شرٹ کو بھگو ڈالا تھا۔

میں نے اپنا سیل فون ہاتھ میں تھاما اور اپنے بہترین دوست کا نمبر ملایا۔

''السلام علیکم......فرحان کیسے ہو؟''

''وعلیکم السلام......میں ٹھیک ہوں تم سناؤ خیریت سے ہو؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے میرے دوست۔''

میں یہ کہنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ کہیں وہ پریشان نہ ہو جائے اور ویسے بھی وہ تو میری آواز سے ہی میرے مزاج کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا خود سے کبھی کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

''بول کیوں نہیں رہے؟''

''فرحان مجھے تمہاری ضرورت ہے گھر آ سکتے ہو؟'' مجھے پورا یقین تھا وہ ضرور آئے گا۔

''نہیں آصف آج تو میں نہیں آ سکتا ہوں پھر کبھی آ جاؤں گا۔ ابھی کھانا کھا رہا ہوں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' بظاہر تو بس کال ہی کٹی تھی لیکن مجھے ایسا لگا کہ فرحان نے میری زندگی کے شجر سے امید کی شاخ بے دردی سے کاٹ دی ہے۔ فرحان تم اگر میرے بہترین دوست ہوتے تو مجھے زندگی کے اس کٹھن مرحلے میں تنہا نہ چھوڑتے۔ میرے آدھے سر اور آنکھ میں شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ درد کی دوا ختم ہو چکی تھی رات کے پچھلے پہر میں نے اپنے ڈیڈ کے میڈیسن باکس سے سکون کے حصول کے لیئے نیند کی گولی نکال کر کھا لی تھی۔

ایک رات گہری نیند آ گئی لیکن اگلی رات پھر سے منفی سوچوں نے مجھے جاگنے پر مجبور کر دیا تھا ۔

''میں کیوں آیا اس دنیا میں؟'' خود سے یہ سوال کر رہا تھا فجر کی اذان کی آواز نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مجھے فلاح کی جانب بلایا جا رہا ہے پھر بھی میں اپنی ہی بھلائی نظر انداز کیوں کر رہا ہوں؟ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھی اور پھر جو سکون حاصل ہوا وہ تو اُس دن بھی حاصل نہیں ہوا تھا جب نیند کی گولی کھائی تھی۔

خدا کا ذکر انسان کو ہر فکر سے آزاد کر دیتا ہے ۔ یوں میرے دل میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے کی بدولت سکون کی کھڑکی کھل گئی جس نے مایوسی کے داخل ہونے کا راستہ بند کر دیا تھا۔

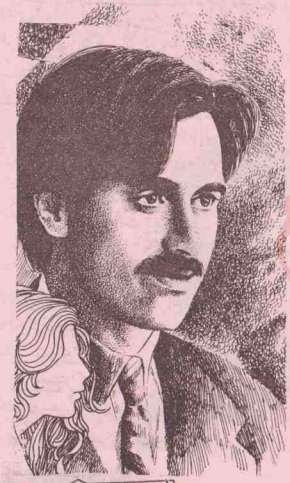

دادو سے ارسال کردہ غیر معمولی سفر کی داستان

روحانی سفر کی داستان

بھٹکے ہوئے شخص کا قصہ جو پاک راستہ چھوڑ کر شیطان کا ساتھی بنا مگر پھر اللہ کو اس پر رحم آ گیا.....

مور شاہد حسین

شام کے سائے آہستہ آہستہ چاروں طرف اپنے پر پھیلاتے جارہے تھے اندھیرا دھیرے دھیرے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا ہر گزرتے لمحے تاریکی چھائی جارہی تھی اور ہر طرف سناٹے کا راج چھایا جانے لگا۔ فدا بے چین تھا اسے رات ہونے کا شدت سے انتظار تھا وہ انتظار کی سولی پر لٹکا ہوا تھا آخر وہ لمحہ آ ہی گیا۔ فدا آہستگی سے بستر سے اٹھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں گمائیں ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی ہر سمت وہشت ناک سناٹے کا راج تھا چاروں طرف اندھیرا رقص کررہا تھا۔ حسب معمول اس نے تمام گھر والوں پر پھونک مار کر انہیں گہری نیند سلا دیا اور پھر بغیر کسی خوف وخطر کے شہر خموشاں کی راہ لی۔

ہر طرف گہری تاریکی بکھری ہوئی تھی چند گز کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر چیز تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فدا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پھونک پھونک کر باوا آدم کے زمانے کے شہر خموشاں کی طرف چلا جارہا تھا جو کہ گاؤں سے پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔ وہ اپنی مخصوص رفتار سے چلا جارہا تھا کہ یکا یک سناٹے میں قدموں کی آہٹ سی ابھری اور اس کے قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اس کا جی گھبرانے لگا۔

مارے دہشت کے خوف اس کے پورے وجود میں سرایت کرگیا دوسرے ہی لمحے قدموں کی آواز سناٹے میں ڈوب کر معدوم ہوگئی مگر اسے مسلسل یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ وجود بے پاؤں چلا آرہا ہو اس کے دل نے بہت چاہا کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں مگر عامل نے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے سخت منع کیا تھا۔

فدا چلتے چلتے تھک سا گیا اس کے پاؤں من من بھر کے ہورہے تھے ٹانگوں میں شدید درد سا ہونے لگا وہ خود کو زبردستی بڑی بے جگری سے دھکیلتا آگے اور آگے چلا جارہا تھا۔ مگر منزل طویل سے طویل ہوتی جارہی تھی۔ تاریک راستہ اسے شیطان کی آنت کی مانند لمبا لگ رہا تھا۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے پاؤں شل ہوگئے تھکن سے اس کا برا حال تھا درد انگ انگ سے اٹھ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے برسوں سے مسلسل چلتا رہا ہو مگر منزل قریب ہونے کی بجائے میلوں دور ہوتی جارہی ہے۔

عجیب بے بسی کا عالم تھا وہ کسی بھٹکتی ہوئی بدروح کی طرح شہر خموشاں پہنچا ہر طرف پھیلے اندھیرے میں پُراسرار خاموشی اور گہری تاریکی کا سناٹا تھا قبرستان ایسی دہشت پھیلا رہا تھا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ قبرستان کی اس دل دہلانے والی تاریکی خوفناک ماحول میں اس کے اوسان خطے ہونے کو تھے کہ اس نے اپنی پوری ہمت کو یکجا کیا اور دھیرے دھیرے اس قبر کی طرف بڑھنے لگا جو چند قدم کے فاصلے پر اس کی منزل تھی۔

ہر بڑھتے قدم پر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی قبریں پھٹیں گی اور مردے نکل کر اس پر حملہ کردیں گے۔ چند قدم کا فاصلہ اسے میلوں دور محسوس ہورہا تھا۔ بالآخر وہ اپنی منزل پر پہنچا اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنا کام شروع کردیا۔ جس مقصد کے لیے وہ تنہا اکیلا دہشت پھیلاتی جگر کو ہلاتی تاریکی میں شہر خموشاں آیا تھا۔

پیر شہاب دین ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ان کی کرامات کے قصے پورے علاقے میں مشہور تھے۔ دن بھر ان کے آستانے پر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جو کہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر تھا لوگ اپنی حاجات لے کر آتے اور ان کی دعا سے فیض یاب ہوجاتے۔ بیماری، پریشانی، جن بھوت غرض ان کے پاس ہر مسئلے کا حل تھا وہ تمام مسائل کا کلام پاک کی آیتوں سے فی سبیل اللہ علاج کرتے تھے۔

پیر شہاب دین کے آستانے کے قریب ہمارا بھینسوں کا باڑہ تھا۔ پیر سائیں کی خدمت میں لوگوں کو حاضر ہوتے دیکھ کر میرے بھی دل ودماغ اور رگ رگ میں پیر سائیں سے تعویذ لیکھنے کا عمل سرایت کرنے لگا۔ میری خواہش مجھے کسی پل چین

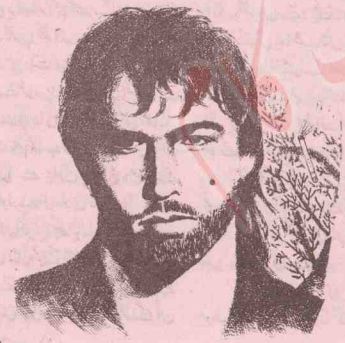

سے سونے نہیں دے رہی تھی ہر گزرتے دن شوق بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر یوں ہی ایک روز میں پیر شہاب دین کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''کہو فدا کیسے آنا ہوا؟'' پیر سائیں کے اچانک پوچھنے پر میں چونکا۔

''پیر سائیں دراصل بات یہ ہے کہ.....'' لوگوں کے سامنے پیر سائیں سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پیر سائیں میری کیفیت کو سمجھ گئے۔ چند منٹ انتظار کرنے کو کہا۔ میں وہاں بیٹھا بڑی دلچسپی سے اُن کو دیکھ رہا تھا۔ پیر سائیں کسی کو تعویذ دے رہے تھے تو کسی کو پانی پر دم کر کے فارغ کر دیتے کوئی دھاگہ پڑھوانے آیا تھا تو کسی نے چینی پر دم کروایا اور فارغ ہوتے ہی چلے گئے ایک ایک کے تمام لوگ جا چکے تھے۔

''فدا کوئی پریشانی ہے کیا؟'' پیر سائیں نے بہت مہربان لہجے میں کہا۔

''پیر سائیں میں آپ سے تعویذ سیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر پیر شہاب دین چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے پھر تبسم بکھیرتے ہوئے میری طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور چند ہدایتیں کیں کہ ہر وقت صاف و پاک رہنا پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھنا وغیرہ۔ انہوں نے مجھے تعویذ سکھانے کی حامی بھر لی تو میں کھل اٹھا۔

میں روزانہ پیر شہاب دین سے قرآن پاک کی مختلف آیتوں سے بیماری پریشانی وغیرہ کے وظیفے سیکھنے لگا تھوڑے ہی دنوں میں جھاڑ پھونک اور پھر جائز مسئلوں کا حل سیکھ لیا۔

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے یوں کئی سال گزر گئے اور پیر سائیں اس فانی دنیا سے پردہ کر گئے ان کے گزرنے کے بعد میرے عمل کی دھوم مچ گئی گاؤں کے پریشان لوگ میرے پاس آنے لگے میں جس بیماری کے لیے پانی دم کر کے دیتا وہ جلد صحت یاب ہو جاتے گھریلو ناچاقی کے لیے تعویذ دیتا ہوں پُرسکون زندگی گزرتی جہاں میاں بیوی ناخوش ہوتے یا ساس بہو جھگڑتی میرے عمل سے ان میں کافی تبدیلی آ جاتی۔

جو بچے رات کو روتے یا ڈر جاتے جھاڑ پھونک کے بعد وہ پُرسکون نیند سوتے یہ سب میں نے قرآن کی آیتوں سے ہی کیا تھا جو میں نے پیر شہاب دین سے سیکھا تھا۔

شب و روز اسی طرح گزرتے رہے کہ ایک روز میرے دماغ میں ایک شیطانی خیال آیا دوسرے گاؤں سے کچھ فاصلے پر کنوئیں کے کنارے ایک عامل کی جھونپڑی تھی جو کالے عملیات کا بہت ماہر تھا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا اس کی جھونپڑی سے ناگوار بدبو آ رہی تھی جگہ جگہ انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔

''تمہارا کیا مسئلہ ہے؟'' عامل نے سرخ انگارہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''عامل صاحب میں آپ سے کالا علم سیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔ عامل سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے لگا اس کی عجیب نظریں تھیں جو میرا طواف کر رہی تھیں۔ اس وقت وہ مجھے مکروہ اور شیطان لگ رہا تھا۔

''کالا علم سیکھنے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''آپ جو حکم کریں میں کرنے کو تیار ہوں۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''آدھی رات کو کسی پرانے قبرستان سے مردے کو نکال سکتے ہو۔'' عامل نے کہا تو میں سر

اپنی آنکھیں موند لیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے یا پھر چاروں طرف پھونک مار کر خود کو حصار میں لے لیا اور زیرِ لب وظیفہ کے مخصوص کلمات پڑھنا شروع کر دیے تو خوف کی ایک تیز سی لہر میرے وجود میں اِدھر سے اُدھر دوڑتی چلی گئی۔ بمشکل میں نے اپنا وظیفہ مکمل کر لیا اور پھر یوں ہی ڈر و خوف اور بے چینی میں دوسری پھر تیسری رات بھی گزر گئی۔

چوتھی رات میں نے چاروں طرف پھونک مار کر اپنے اردگرد حصار قائم کر کے اس رات کا ورد پڑھنا شروع کیا۔ چند لمحوں بعد میرا دل گھبرانے لگا دل کر رہا تھا کہ وظیفہ یہیں پر ختم کروں ہر گزرتے لمحے وظیفہ ختم کرنے کی خواہش بڑھنے لگی مگر وظیفہ ترک نہ کیا یوں چوتھی رات کا بھی وظیفہ مکمل کر لیا۔ پانچویں رات جیسے ہی عمل شروع کیا۔

عجیب و غریب خوفناک اسرار میں ڈوبی بے انتہا تیز آوازیں میری سماعت سے ٹکرائی تو ایک تیز سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ شاید یہ حصار سے باہر لانے کی ایک کوشش تھی مگر میں ڈٹا رہا آہستہ آہستہ ورد جاری رکھا اور بالآخر پانچویں پھر چھٹی رات کا عمل پورا ہو گیا۔

ساتویں رات میرے اس عمل کی آخری رات تھی اس رات دلخراش چیخوں کا حملہ ہوا چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں لوگ ایک ساتھ چیخ رہے ہیں۔ ان چیخوں میں بے انتہا درد اور کرب تھا کہ میں پوری جان سے لرز گیا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا خوف کی وجہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی اور میں تھر تھر کانپنے پر مجبور ہو گیا۔

اگلے دن عامل کی اجازت سے نہایا سات

دنوں بعد نہایا تھا اس لیے خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا اور پھر پُرسکون ہو کر آنے والی رات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگلی پانچ راتیں کسی پرانی اور وسیع نہر کے کنارے کھلی جگہ پر بیٹھ کر عمل کرنا تھا۔

حسب معمول آدھی رات کو اٹھا سب پر پھونک مار کر نہر کی طرف چل دیا مطلوبہ جگہ پہنچ کر مخصوص انداز میں آلتی پالتی مار کر چاروں طرف پھونک مار کر حصار قائم کر لیا اور پھر لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنا ورد پڑھنا شروع کر دیا یہ عمل کی آٹھویں رات تھی اس رات کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی مگر ڈر و خوف بری طرح چھایا رہا تھا اور اس رات بہت ڈراؤنا بھیانک خواب بھی دیکھا اور اسی رات سے بھیانک خوابوں کا سلسلہ جڑ گیا۔

نویں اور دسویں رات انجانی اور عجیب سی تیز بدبو مجھے مسلسل محسوس ہوتی رہی ایسی ناگوار بدبو کے بھبکے تھے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سونگھے تھے۔ ناک کی نتھنوں سے ٹکرائے عجیب اذیت تھی چند لمحوں بعد کتوں کے بھونکنے کا اتنا شور اٹھا جیسے بہت سارے کتنے بھونک رہے ہوں یا آپس میں لڑ رہے ہوں اسرار میں ڈوبی دہشت پھیلاتی آوازوں نے میرے جگر کو دہلا کر رکھ دیا گیارہویں رات عمل شروع کرتے ہی جیسے کوئی گہری نیند سوئی ہوئی ان دیکھی مخلوق اچھل کر بیدار ہوئی اور پھر نہ رکنے والی بلند سے بلند چیخوں کا سلسلہ شروع ہوا پھر ذرا دیر بعد گہری خاموشی چھا گئی جیسے چیخوں کی آوازیں دم توڑ گئیں۔

سکوت ایسا کہ قبرستان کا گمان گزرتا اور چاروں طرف اندھیرا اس قدر چھا گیا کہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا مگر کوشش کے باوجود بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی بینائی جاتی محسوس ہوئی میری حالت ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

اگلی رات گزشتہ راتوں سے بھی اذیت ناک گزری۔ عجیب وغریب خوف ناک آوازیں کبھی مدھم تو کبھی بے انتہا تیز ہونے لگیں ان آوازوں سے پورے ماحول میں شور برپا ہوا پھر زور کی ہوا چلی جیسے کوئی طوفان ہو ہوا کے تیز جھونکوں سے ہولناک شور پیدا ہو رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جیسے دل سینہ چیر کر باہر نکل پڑے گا۔

دوسرے لمحے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سن کر میں اچھل پڑا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے ہوں' گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز میرے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا رگوں میں دوڑتا خون رک جائے گا اور میں منجمد ہو جاؤں گا بالآخر بارہویں رات کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

اگلے دن عامل نے تین روز قبرستان میں کچھ دنوں کی تازہ قبر کے سرہانے بیٹھ کر عمل کرنے کو کہا تو میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا اور خیال ہی خیال میں قبرستان کا خوفناک ماحول کی نظروں کے سامنے تھا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا مارے خوف کے دل دھڑکا اور میں نے کپکپا کر عامل کو دیکھا عامل نے تسلی دیتے ہوئے ہمت سے کام لینے کو کہا تو میں راضی ہو گیا۔

عامل کی جھونپڑی سے نکل کر سیدھا شہر خموشاں گیا اور کچھ دنوں کی تازہ قبر کی تلاش شروع کر دی جو تھوڑی ہی دیر میں نظر آ گئی یہ قبر گاؤں کے ایک نوجوان کی تھی جو ایک ہفتہ پہلے بجلی کا جھٹکا لگنے سے مرا تھا میں نے شہر خموشاں کا چاروں طرف سے جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر گھر کی راہ لی۔

وہ ایک بہت پرانا باوا آدم کے زمانے کا قبرستان تھا۔ رات کے وقت وہاں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کمزور دل لوگ تو اس قبرستان کے نام سے بھی گھبراتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں رات کو چڑیلیں رقص کرتی تھیں۔ بدروحوں کا بسیرا ہے اور جن بھوتوں کی اپنی ریاست ہے مگر میں نے تمام خیالوں کو اپنے دل و دماغ سے جھٹک دیا جانے میں کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔

شہر خموشاں پہنچ کر اپنی مطلوبہ قبر کے سرہانے بیٹھا اپنے اردگرد دائرہ کھینچ لیا ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر مطمئن ہو کر تیرہویں رات کا ورد پڑھنا شروع کیا۔ ابتدائی چند لمحات خیریت سے گزرے کہ اچانک اپنے قریب بہت زیادہ تپش محسوس ہوئی آگ کے بلند شعلوں نے جیسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مگر وہ جم کر بیٹھا ورد پڑھتا رہا پھر دیکھتے ہی دیکھتے آندھی جیسی ہوا چلنا شروع ہو گئی یہ ایک طوفان تھا کمزور کرنے کے لیے مگر یقین تھا کہ جب تک حصار میں ہوں جان کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

بس ورد پڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اچانک زلزلہ آیا زمین تھرتھر کانپنے لگی لیکن میرے حوصلے کمزور ہونے تھے نہ ہوئے۔

حسب معمول اگلی رات بھی میں نے اپنے اردگرد حصار کی لکیر بنائی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اچانک کئی ڈراؤنی شکلیں' خوفناک آوازیں نکالتی میری طرف لپکیں اور جھپٹتی محسوس ہوئیں تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اگلے لمحے کئی مخصوص صورتیں قہر آلود نظروں سے گھورتیں محسوس ہوئیں نہ جانے کہاں سے یکا یک سانپ بچھو اژدھے اپنا بڑا سا پھن پھیلائے خوفناک منہ کھولے پھنکار رہے تھے۔

شاید وہ مجھے کاٹ کر کھانا چاہتے تھے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی حصار کے اندر نہیں آ پا رہے تھے۔ حصار سے ٹکراتے ہی آگ کی لپیٹ میں آ جاتے اور راکھ بن کر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ منحوس مخلوق آگ میں بھی زندہ سلامت ناچ رہی تھی مگر میں بھی سب کو شکست دیتا مسلسل پڑھائی کرتا رہا بالآخر چودھویں رات کا عمل بھی پورا کر لیا اور پھر گھر کی طرف سرپٹ دوڑا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ رات چاروں طرف اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا میں اپنے گھر میں داخل ہوا جیسے ہی صحن میں پہنچا تو میں جہاں تھا وہیں رہ گیا پورے صحن میں عجیب وغریب شکل کے لوگ کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے چند نے خوفناک شکلیں اختیار کر لیں انہیں دیکھ کر میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ منحوس چہرے آگے بڑھے اور مجھے زمین سے تین چار فٹ اوپر اٹھایا پھر زور سے زمین پر پٹک دیا۔

یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ موت کو قریب سے دیکھ کر میرے دل کی رفتار بہت تیز ہو گئی مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ چاہنے کے باوجود بھی میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل پا رہی تھی اور نہ ہی میرے جسم میں جان تھی بس آنکھیں تھیں جو سارا منظر دیکھ رہی تھیں وہ مجھے فٹبال کی طرح ایک دوسرے کی طرف اچھال رہے تھے۔

انہوں نے مار مار کر نڈھال کر دیا اور مجھے اٹھا کر آگ کے الاؤ میں پھینک دیا مجھے یکدم آگ

لگ گئی اور دلخراش چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ میں ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہو گیا اور اٹھ بیٹھا میرا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا اور حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے پہلے پہل تو مجھے یقین نہیں ہوا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے اپنا شک مٹانے کے لیے میں نے اپنے وجود کو حرکت دی تو سرشاری کی ایک لہر نے مجھے روحانی خوشی سے سرشار کر دیا۔ میں زندہ تھا وہ صرف ایک خواب تھا بہت ہی ڈراؤنا بھیانک خواب.....

پندرہویں رات بھی میں مقررہ وقت پر قبرستان پہنچا۔ اس سے قبرستان وحشت ناک منظر پیش کر رہا تھا گہرا سناٹا لمبے لمبے درخت قبرستان کی وحشت میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال آئے مگر میں نے سب کو جھٹک دیا اور خود حصار میں محفوظ کر کے ورد پڑھتا چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد میرے قریب تیز دھماکہ ہوا مجھے یوں لگا وہ دھماکہ میرے وجود کے اندر ہوا اور میرا پورا وجود کرچیوں میں بٹ کر اڑتا ہوا فضا میں بکھر گیا ہو اگلا منظر خون جما دینے کے لیے کافی تھا لمحے بھر میں قبریں پھٹ گئیں اور مردے کود پڑے میرے دل دھک سے رہ گیا میں نے اتنا بھیانک منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دل کی دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئیں میری روح تک لرز رہی تھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے طرح طرح کی مصیبتوں سے گزرنا پڑ رہا تھا اس رات بے شمار ایسے منظر دیکھنے پڑے جو میں پہلے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھے تھے

میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میری ہونٹ ہل رہے تھے مگر الفاظ ادا نہیں ہو پا رہے تھے ایک لمحے کو دل چاہا اٹھ کر بھاگ جاؤں مگر تیزی سے ذہن میں خیال آیا حصار توڑ کر بھاگ جانے سے بھیانک موت یقینی ہے۔ میں نے ہمت کر کے ورد جاری رکھا اور پھر اختتامی کلمات پڑھ کر حصار سے باہر آ گیا تمام منظر کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکے تھے بس وہاں چاروں طرف شہر خموشاں میں پھیلے اندھیرے میں پُراسرار خاموشی اور گہری تاریکی کا سناٹا تھا۔

اگلی رات کسی جنگل بیابان جہاں آدم نہ آدم ذات ہو مجھے ایسے کسی ویرانے میں کالے بکرے کی کھال پر بیٹھ کر ورد کرنا تھا۔ گاؤں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک جنگل واقع تھا میں نے اس جنگل کا انتخاب کیا اور سورج غروب ہوتے ہی مطلوبہ چیزیں اٹھا کر اس طرف چل دیا ایک بہت پرانے اور گھنے درخت کے نیچے بکرے کی کھال پر حصار کر کے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا کہ اچانک میرے ارد گرد منحوس قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے دل کو کاٹنے والے قہقہے اور چنگھاڑ سنائی دینے لگی اور پھر جگر کو کاٹنے والا شور برپا ہوا۔

سولہویں رات کا مختصر ورد تھا سو جلدی مکمل ہو گیا۔

سترہویں رات اس مردے کو قبر سے نکالنا تھا جس پر مسلسل 16 روز چلہ کیا تھا وہ مردہ عامل کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ میں شیطان کا پیروکار بن چکا تھا سو ہامی بھر لی اور مقررہ وقت پر اپنا کام شروع کر دیا ابھی قبر کی مٹی ہٹائی ہی تھی کہ ایک بھرپور دل دہلانے والی چیخ سنائی دی اور پھر نجانے کہاں سے دو منہ والے بہت سارے سانپ نکل آئے وہ نفرت اور غصے سے خوفناک منہ کھولے پھنکار رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچا کھا جائیں گے مگر حصار کی لکیر انہیں اندر آنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ ایسی کتنی ہی مخوس شکلیں آئی گئیں ہر لمحہ کوئی نیا

تماشا شروع ہو جاتا خوف کی نئی لہر پوری شدت کے ساتھ میرے تن بدن میں گردش کرنے لگتی مگر میں حوصلہ اور ہمت کو سمیٹا کرتے ہوئے مردے کو قبر سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا پھر مردے کو کاندھے پر اٹھائے عامل کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ مسلسل میرے پیچھے کتے خوفناک آوازوں میں بھونک رہے تھے وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے چاہتے ہوئے بھی میرے قریب نہیں آ پا رہے تھے مردہ عامل کی خدمت میں پیش کیا تو وہ بے انتہا خوش ہوا۔

حسب معمول اگلے دن عامل کی جھونپڑی چلا گیا عامل نے ایک کوٹھڑی مجھے تھماتے ہوئے اس پر منفی عمل کرنے کا حکم دیا اس کوٹھڑی میں کیا تھا مجھے نہیں معلوم مگر عمل شروع کیے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سڑے گوشت کی بدبو آنے لگی میں بے نیاز ہو کر ورد پڑھتا رہا چند لمحوں بعد ہڈیوں کے جلنے کی بو محسوس ہونے لگی یہ اظہار ہوئیں رات کا مختصر وظیفہ تھا اور بغیر کسی انہونی بات کے خیر و عافیت سے عمل پورا ہوا اور کوٹھڑی مطلوبہ جگہ یعنی نہر میں بہا دی تھی۔

اگلی دونوں راتوں کا ایک ہی ورد تھا جو کسی پورا ہے پر کرنا تھا۔ ان راتوں کا عمل کرنے کے لیے میں نے گاؤں سے کچھ فاصلے پر قبرستان جانے والی سڑک کا انتخاب کیا۔ اس رات نجانے کیوں میرا دل گھبرا رہا تھا مگر ورد جاری رکھا کہ اچانک بھوتوں کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے چاروں طرف نفرت کی دھند چھا گئی پھر انہوں نے شکلیں بدل بدل کر میرے ارد گرد شرمناک شیطانی حرکات شروع کر دیں۔

اگلی رات بھی اسی چوراہے پر ورد پڑھنا تھا۔ عمل شروع کرتے ہی بہت جیتے جاگتے انسانوں کو فضا میں زمین سے پانچ چھ فٹ اٹھا لگا ہوا دیکھا اور ساتھ ہی کسی کے چلنے کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرائی آہٹ میرے قریب سے قریب تر ہو جاتی تھی تب ہی مجھے ایک سایہ نظر آیا۔

اور وہ میری طرف بڑھنے لگا اس کی صورت دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ بھیانک چہرہ، لمبے زمین کو چھوتے بال، خون اگلتی آنکھیں، لمبے ناخنوں سے ٹپکتا خون وہ کوئی چڑیل معلوم ہو رہی تھی اچانک اس نے الٹا لٹکے ہوئے جیتے جاگتے انسانوں پر حملہ کر دیا۔

ان کے منہ سے نجانے کتنی چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ اگلا منظر خون جمع دینے کے لیے کافی تھا۔ چاروں طرف خون بکھرا پڑا تھا وہ سب کے سب خون میں لت پت درد سے کراہ رہے تھے اور بھیانک چڑیل کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی تھی۔

اگلے دن جب میں عامل کی خدمت میں حاضر ہوا عامل بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے رازداری سے بولا۔

''آج تمہیں ایک مشکل کام کرنا ہے۔''

''آپ حکم کریں میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔'' میں نے سرشاری سے کہا۔

''تم ہر طرح سے کامیاب ہو گئے ہو آگے بھی یہی امید رکھتا ہوں۔'' عامل نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو میں ایک لمحے کے لیے گھبرا گیا۔

''مجھے تین سے پانچ سال کے زندہ بچے کا جگر چاہیے۔'' عامل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ میری روح تک لرز اٹھی۔

''میں..... میں..... میں یہ نہیں کر سکتا۔'' الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''بکری کی طرح میں..... میں کیوں کر رہے ہو تمہیں ایسا کرنا ہوگا۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔

''میں کسی معصوم بچے کی جان نہیں لے سکتا۔''

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اگر تم نے ایسا نہیں کیا میری شیطانی قوتیں تمہارا جینا حرام کردیں گی۔ اور تم خون تھوکتے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤ گے۔“ عامل نے لمبی تقریر شروع کردی۔

میں تھر تھر کانپ رہا تھا مجھے اپنی زندگی کی فکر تھی میں بھیانک موت نہیں مرنا چاہتا تھا میں اپنی زندگی بچانے کے لیے اس کے آگے گڑگڑا کر رو رہا تھا مگر عامل نے ڈرا دھمکا کر اپنی جھونپڑی سے نکال دیا۔

میں بوجھل دل لیے بے منزل راستے پر چل دیا۔ ہزاروں خیال میرے ذہن میں محوِ گردش تھے۔ میرے ضمیر اور شیطان کی جنگ جاری تھی۔ آخر مجھ پر شیطان حاوی ہوگیا۔

میں نے اپنا ضمیر مار دیا۔ اور بے قصور معصوم بچہ عامل کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہوگیا۔ بچہ کہاں سے لاؤں یہ اہم مسئلہ تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں شیطانی خیال آیا۔

شام نے رات کو گلے لگالیا۔ جب سب سو گئے میں اٹھا میں نے خود کو ایسے حصار میں لے لیا کہ میں کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا دیوار پھلانگ کر چاچا روشن علی کے ساڑھے تین سال کے بیٹے کی طرف بڑھا وہ اس وقت گہری نیند سو رہا تھا میں نے اس کے منہ پر سختی سے ٹیپ چپکادی۔

پھر اسے اپنی چادر کے اندر چھپالیا وہ مسلسل حرکت کر رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میری عقل ساتھ چھوڑ گئی میں انسان سے شیطان بن گیا۔ میں ایسا گھناؤنا کام کرنے جا رہا تھا جس کے آگے انسانیت شرما رہی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا لڑکھڑاتے قدموں سے معصوم بچہ اٹھا کر سفا کی کی حدود کو پار کرتا عامل کی جھونپڑی میں آکر دم لیا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور دماغ میں ایک ہی جملہ بار بار دھماکے کی طرح پھٹ رہا تھا۔ تم اشرف المخلوقات ہو شیطان کے راہی مت بنو۔ ورنہ جہنم کی آگ یقینی ہے۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔

میرے سوئے ہوئے ضمیر کو شیطان اور گہری نیند سلانے کی کوشش کر رہا تھا میری آنکھوں کے سامنے ننھا وجود آنے والے وقت سے بے خبر میٹھی نیند سو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کے گلے پر چھری پھرنے والی تھی۔

عامل نے تیز دھار چھری مجھے تھماتے ہوئے معصوم بچے کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ میں نے اچھل کر اس کی طرف دیکھا اس سے وہ مکمل شیطان لگ رہا تھا اس کے چہرے سے فرعونیت ٹپک رہی تھی۔ میرے ہاتھ چھری پر مضبوط ہوگئے اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میں نے چھری بلند کی اور پھر ایک ہی وار سے میں نے عامل کا سر تن سے الگ کردیا۔

مجھے اس وقت کچھ ہوش نہیں تھا میں نے بے دردی سے اس کے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کردیا اور پھر میں خون آلود چھرا لے کر پیر شہاب دین کے صاحبزادے پیر شمس الدین کی خدمت میں حاضر ہوا ان کے قدموں میں گر کر میں نے اپنا جرم قبول کیا۔ میں مسلسل روئے جا رہا تھا۔

پیر شمس الدین نے مجھے حوصلہ دیا میں خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنے کیے گناہوں کی معافی مانگنے لگا رو رو کر میرا برا حال تھا۔ پیر شمس الدین نے مجھے نہلایا اور پھر مجھے اپنی مریدی میں لے لیا آج میں ان کے ساتھ ان کی مریدی میں ان کی خدمت کرکے روحانی سکون محسوس کرتا ہوں۔ آخر میں التماس ہے کہ میری بخشش کے لیے دعا کریں۔

□□......❁......□□

شیخوپورہ سے بھیجی گئی انوکھی جنگ کی روداد

حضرتِ انسان

دونوں کے درمیان جنگ جاری تھی مگر یہ تو
طے تھا جیت کسی ایک کا ہی نصیب بنی تھی......

حمائل فاطمہ

”حائمہ!! حائمہ، حائمہ......“

پکار اس قدر بلند تھی کہ بے اختیار میں ہڑبڑا کر ہاں ہاں کرتی نیند سے بیدار ہوئی۔

”ہاں!!“

یک دم اٹھنے کے باعث میرا نظام تنفس بے ترتیب سا چل رہا تھا۔

”کو......کون؟“

”بڑی جلدی اٹھ گی؟“

آواز میں اس قدر تیزی تھی کہ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

میں پوچھنا چاہتی تھی، کون ہو تم، لیکن خوف کے مارے آواز گلے میں ہی دم توڑ گئی تھی۔

شدید سردی کے باوجود میرا جسم پسینے سے شرابور ہوتا جا رہا تھا۔

”کون......کون ہو تم!!“

ٹوٹ ٹوٹ کر مشکل سے الفاظ ادا ہوئے۔

اپنی ہی آواز مجھے گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

دوسری جانب سے ایک جاندار قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

”تم مجھے نہیں جانتی کون ہوں میں؟“

آواز میں اس قدر رکھ رکھاؤ تھا کہ خوف سے میرے دل کی دھڑکن منجمند ہونے لگی۔

”نہیں جانتی میں کون ہو تم!!“

میری آواز کمرے میں گونج کر مدہم ہوگئی، لیکن دوسری جانب خاموشی چھائی رہی، میرے اندر خوف سے طوفان کی مانند شور برپا ہونے لگا۔

مسلسل آنکھیں پھاڑے اطراف میں دیکھتی میں ہلکان ہو رہی تھی، رات کے سکوت میں ڈوبی تاریکی مکمل طور پر ہولناک منظر کی تربتر منقش بنا کمرہ میری آنکھوں کو کچھ بھی دیکھانے سے قاصر تھا۔

”کیا کمرے میں کوئی گھس آیا ہے؟“

اس سوچ کے آتے ہی میرا وجود اندر تک لرز گیا۔

ان گنت سوال لاوا بن کر میرے دماغ کی رگوں میں چکر کاٹنے لگے۔

سردی کی شدت میں اچانک بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ بدن چیرتی ہواؤں کی کاٹ تیز دھار نشتر کو مات

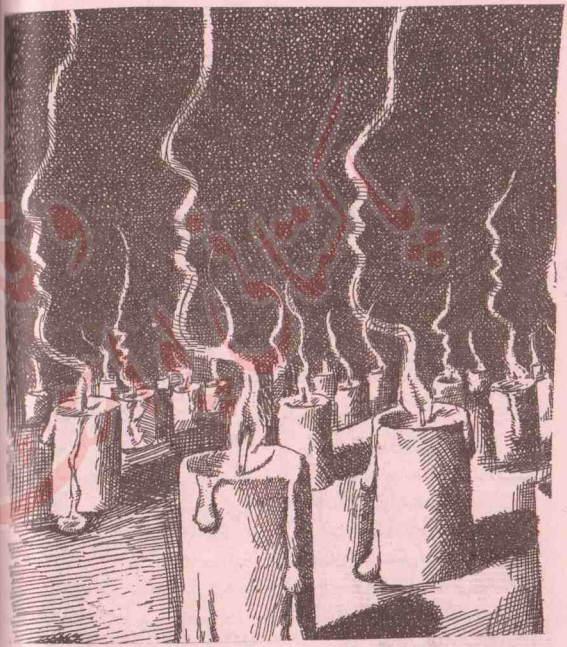

دینے لگیں تھی۔

یخ بستہ ہوا کا جھونکا میرے کمرے کی آدھی کھلی کھڑکی کے پردوں کو دھکیلتا ہوا میرے زرد وجود سے آٹکرایا تو مجھے لگا میری رگوں میں دوڑتا سیال مادہ اس کے احساس سے جہاں تھا وہیں تھم سا گیا ہو۔

یکدم بادلوں کی زور دار گرج اور آسمانی بجلی کی چمک نے مل کر پراسرار انداز میں خوف ناک حد تک فضا قائم کر لی تھی۔

بے بسی سے میرا وجود کانپ رہا تھا مارے خوف سے میری آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے۔

دوسری جانب اب بھی خاموشی کا راج تھا، جیسے میری بے بسی کا لطف اٹھایا جا رہا ہو' کمرے کی ہر چیز میری بے بسی کی کیفیت پہ قہقہے لگا رہی ہو۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت ٹھہر گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ میری سانسیں بھی تھم رہی تھیں۔

بے بسی، خوف، مایوسی، یا پھر وحشت جو بھی تھا، اس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

اچانک آسمانی بجلی رات کی تاریکی کو چیرتی اندر چھلکتے اندھیرے کو کم کرنے میں کامیاب ہوئی، روشنی کی کرنوں سے میرے وجود پہ جیسے بھونچال سا برپا ہو گیا..... کمرے میں کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ قہقہہ ایک بار پھر فضا میں بلند ہوا۔

''کون ہو تم؟ سامنے کیوں نہیں آ رہے۔''

کانوں میں گونجتی اپنی ہی آواز مجھے اجنبی لگی۔

''میں وہ ہوں جسے تم سننا نہیں چاہتی۔''

خاموشی کا سکوت ٹوٹا تو کمرے میں ابھری آواز ابر کی گرج چمک کے ساتھ مل کر عجیب وحشت ماحول پر طاری کر رہی تھی۔

''میں کیا نہیں سننا چاہتی؟''

''وہ جو حقیقت ہے۔''

ایک لمحہ کی تاخیر کیے بنا دوسری جانب سے جواب آیا۔

''اپنے ضمیر کی آواز.....''

''کونسی حقیقت، کونسا ضمیر؟''

میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔

''تم منافق انسان ہو۔''

دوسری جانب سے بے دردی سے کہا گیا۔

''نہیں! نہیں میں منافق نہیں ہوں۔''

میرا دل کر رہا تھا میں یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں' کمرے میں گونجتی آواز سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔

''ہو تم منافق۔''

''اب خاموش کیوں ہو، جواب دو.....''

بتاؤ کیوں نہیں سنتی اپنے ضمیر کی آواز.....''

میری سانسیں تیز رفتار میں بہنے لگیں' مانو میری اپنی آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

کمرے میں ایک بار پھر سے خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگ رہا جیسے قبر کی خاموشی عود آئی ہو۔

دوسری جانب شاید خاموشی سے کوئی میرے جواب کا منتظر تھا۔

میں نے ڈرتے ہوئے اپنے دفاع کرنے کے لیے آواز بلند کی۔

''میں کسی کے ساتھ منافق نہیں ہوں۔''

''اچھا تو اپنے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا تم اپنے ساتھ بھی منافق نہیں ہو؟''

دوسری جانب سے انتہائی کاٹ دار لہجے میں پوچھا گیا۔

''اب جواب دو......!''

''اگر تم منافق نہیں ہو تو پھر کیوں دوسروں کی خوشی میں خوش نہیں ہوتی دل سے؟ کیوں دوسرے کی تعریف تمہیں گراں گزرتی ہے، کیوں راتوں کو روتی ہو؟ کیوں حسد کی آگ میں جلتی ہو؟ کیوں دنیا والوں کو معاف نہیں کرتی؟''

''کیوں لوگوں کی باتوں کو دل پر لیے جی رہی ہو؟''

''کیوں دنیا کے سامنے فریب کا لباس زیب تن کر رکھا ہے؟''

''کیا تمہیں اپنے پروردگار پر یقین نہیں ہے؟ کیا تم آخرت پر یقین نہیں رکھتی؟ کیوں دنیا کی فکر میں مبتلا ہو؟ کیوں اپنے آپ کو دوہری مصیبت میں مبتلا رکھتی ہو؟ کیوں اپنے ساتھ مخلص نہیں ہو جاتی؟''

آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی جیسے ابھی آواز کا طوفان عود آئے گا اور اپنے ساتھ میری ہستی کو بھی مٹا کر لے جائے گا۔

میری انا نے ایک بار پھر جوش مارا اور میں چیخ اٹھی۔

''نہیں ہوں میں منافق لوگوں کے ساتھ.....''

''سنا تم نے نہیں ہوں میں منافق۔''

میرے دل کی دھڑکنیں معمول سے ہٹ کر چل رہی تھیں' ایسے جیسے میں اس آواز سے زیادہ خود کو یقین دلا کر مطمئن ہونے کی کوشش کر رہی کہ منافق نہیں ہوں۔

''ااااااچھا! سچ میں تم اپنے ساتھ منافق نہیں ہو۔''

دوسری جانب اچھا خاصا میرے جواب کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

ایک بار پھر یخ بستہ ہوا کا جھونکا میرے وجود سے ٹکرایا گویا رگوں میں لہو جم سا گیا۔

''اب بولتی کیوں نہیں......''

مخالف کی ابھرنے والی آواز نے اس بار میرے اندر توڑ پھوڑ شروع کر دی...... میرا وجود پگھل کر اشکوں کی صورت آنکھوں میں جمع ہونے لگا' دماغ کے پردوں پر گزرے لمحے فلم کی مانند نمودار ہونے لگے۔

کمرے کے چاروں اطراف مجھے اپنا ہی عکس دکھائی دینے لگا...... لمحہ بہ لمحہ عکس میری آنکھوں میں پھیلتا جا رہا تھا...... وہ سب واضح دکھائی دینے لگا جو میری اپنی انا اور دنیا کے فکر میں جل گیا تھا۔

مجھے اپنا آپ اس آگ میں جھلستا ہوا صاف دیکھ رہا تھا...... میں درد سے بلک بلک کر رو رہی تھی، کیونکہ میں آج پھر زخم خوردہ تھی۔ میں اپنے رب سے لوگوں کی زیادتیوں کی شکایت کر رہی تھی' اپنے دل پر لگے زخم اسے دکھا رہی تھی' میں نے بے بسی سے کمرے کے اطراف میں ایک نگاہ ڈالی لیکن وہاں چار سو خاموشی تھی' اب تو وہ آواز بھی خاموش تھی' جو مجھے اس عذاب میں مبتلا کر کے کہیں دب کر بیٹھ گئی تھی۔

ہمت کر کے اٹھی اور کمرے کی بتی جلا دی پورا کمرہ روشنی سے نہلا گیا۔

''یہاں تو کوئی نہیں...... پھر وہ آواز؟

''کیا وہ میرا ضمیر تھا؟''

اطراف میں خاموشی پا کر اپنے اندر جھانکا جہاں ضمیر اور میرے بیچ سخت کشمکش جاری تھی۔ میں جو جو شکوہ کرتی ضمیر اس کا جواب دے دیتا۔ یہ ایک طویل بحث تھی جو طول پکڑتی جا رہی تھی۔ آخر کار میں نے تھک کر ضمیر کو مخاطب کر ڈالا۔

''تم مجھے سمجھا رہے ہو تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں نے لوگوں کے ساتھ کبھی برا نہیں کیا پھر ا[...] میرے ساتھ برا کیوں کرتے ہیں؟ کیوں میرے دل کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں تم جان بوجھ کر کچھ برا نہیں کرتی لیکن تم لوگوں کی ہر برائی پر انہیں برا بھلا کہتی ہو۔ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو کہ وہ تم سے محبت نہیں کر پاتے۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی برائی تو ان کی طرف سے ہوئی ہے اب میں انہیں برا بھی نہ کہوں۔ میں کوئی فرشتہ تو نہیں جو کچھ بھی محسوس نہ کرے میں انسان ہوں اور یہی میری کمزوری ہے۔''

''ہاں مت کہو برا، صبر کرو۔ صبر میں بہت اجر ہے۔ تم فرشتہ نہیں تم تو اشرف المخلوقات ہو۔ تم وہ بھی کر سکتی ہو جو فرشتے نہیں کر سکتے۔ تمہیں انسان کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں اللہ نے اسی لیے تو فرشتوں کو انسان کو سجدے کا حکم دیا تھا۔''

''چلو مان لیا! میں اشرف المخلوقات ہوں۔ لیکن میں صبر ہی تو کرتی ہوں کیا کبھی ان کو پلٹ کر جواب دیا یا کبھی ان سے قطع تعلق کیا۔ اللہ نے رشتوں کو جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے تبھی میں نے ان کے ہر ظلم پر چپ سادھی ہے کہ کہیں رشتے نہ ٹوٹ جائیں۔ لیکن اب بس! اب میں بھی ان کے ساتھ ویسے ہی پیش آؤں گی جیسے وہ مجھ سے پیش آتے ہیں۔''

''نہیں تم یہاں غلط ہو اور تم صبر نہیں کرتی۔''

میں (طیش میں آ کر) ''یہ صبر نہیں تو اور کیا ہے؟ کبھی ان سے بدلہ نہیں لیا، ان کے ظلم پر چپ رہی ان کو پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ لیکن اب میں برا بدلہ لوں گی تا کہ انہیں اندازہ ہو کہ میں کوئی معمولی چیز نہیں۔'' ہونہہ!

''صبر ہمیشہ پہلی چوٹ پر ہوتا ہے۔ ایسے نہیں کہ دل میں پہلے برا بھلا کہو گالیاں دو اور پھر چپ کر جاؤ اور کہو کہ اچھا چلو میں نے صبر کر لیا۔ صبر تو تب تھا جب

تمہیں تکلیف پہنچے تو تم دل میں بھی انہیں برا نہ کہو اور اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔''

''اچھا! میں تو بہت بری ہوں نہ تو پھر تم ہی بتا دو کہ صبر کیا ہے۔''

(میرے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے) ''دیکھو! یہ جو تمہاری زندگی میں مشکلات ہیں یہ اللہ ہی کی طرف سے تمہاری آزمائش ہیں، اور ان کو کشادہ دلی سے قبول کرنا اور ترکِ شکایت ہی صبر ہے۔''

''لیکن میرا دل لوگوں کے رویے پر بہت روتا ہے، جبکہ میں ان کے ساتھ مخلص ہونے کی کوشش کرتی ہوں اور وہ مجھے درد دیتے ہیں ایسے میں میں کیا کروں؟''

''سب سے پہلے صبر کرنا سیکھو۔ یاد کرو کفار مکہ نے نبی اکرم ﷺ پر کیسے کیسے مظالم نہیں ڈھائے۔ لیکن رحمتِ دو جہاں ﷺ نے کبھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ہمیشہ ان کے زیادتیوں کے آگے خاموش رہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس وقت طاقت ور نہ تھے ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے سب کو معاف کر دیا ان کو بھی جنہوں نے مظالم ڈھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ حالانکہ تب وہ تعداد میں سب سے زیادہ اور طاقت ور تھے۔ لیکن انہوں نے بدلہ نہیں لیا کیونکہ ان کی یہ معافی اللہ تعالیٰ کے لیے تھی اور ان کی وہ دشمنی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے تھی۔''

''لیکن اللہ نے تو بدلہ لینے کا کہا ہے کہ جیسا وہ ظلم کریں اتنا ہی بدلہ آپ بھی لے سکتے ہو تو پھر میں کیوں نہیں لے سکتی بدلہ؟''

''اللہ نے تو یہ بھی کہا ہے کہ جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کی خطاؤں کو معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں اور ویسے بھی تمہیں بدلہ لے کر کچھ حاصل نہیں ہو گا صرف تمہارا نفس خوش ہو گا۔''

''تو میرا نفس ہی خوش ہو جائے کچھ تو سکون ملے گا مجھے۔''

''ایمان والے نفس کو خوش نہیں کرتے۔ کسی بزرگ نے کہا تھا کہ جنت صرف دو قدم ہے۔ ایک قدم تم اپنے نفس پر رکھ دو، تو دوسرا قدم جنت میں ہو گا۔''

(خاموش...... شاید میں پست ہو رہی تھی)

''تم دنیا والوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دو اور اچھا ہی سوچو تا کہ وہ تمہاری مثبت سوچ کے اثر سے بدل جائیں۔ تمہاری یہ منفی سوچیں انہیں تمہارا ہونے نہیں دیتی۔ دل میں کہیں نہ کہیں کھوٹ ہوتا ہے تبھی ہمارے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟ میں جب اچھا سوچنے لگتی ہوں تو وہ پھر برائی کرتے ہیں' اللہ ان کو ہدایت کیوں نہیں دے دیتا۔''

''ان کو ہدایت دینا اللہ کا کام ہے اور کسی کو ہدایت دینی ہے اور کس کو نہیں یہ رب العالمین خوب جانتا ہے، تم صرف لوگوں کے لیے دعا کر سکتی ہو۔

''مگر تم ہر بار شکوہ کرتے وہ کیوں بھول جاتی ہو جو اللہ رب العزت نے تمہیں عطا کیا۔''

''کیا مطلب؟''

''ابھی نماز عشاء میں تم نے سورۃ الضحیٰ کی تلاوت کی تھی اس کا ترجمہ یاد ہے نا؟''

ضمیر کی بات سن کر میری انا کا بت کہیں دور ہوا میں معلق ہو گیا تھا' میری انا بری طرح پست ہوئی تھی۔ اب صرف میں رہ گئی تھی یعنی انسان اور میرا بہترین ساتھی میرا ''ضمیر''۔

انسان: ''ہاں''

''قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جب وہ چھا جائے۔ نہیں چھوڑا آپ کو اے محمد ﷺ آپ کے رب نے اور نہ وہ ناراض ہوا اور یقیناً آخرت آپ

کے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے اور عنقریب آپ کا ربّ آپ کو وہ کچھ عطا کرے گا کہ آپ ﷺ خوش ہو جائیں گے۔ بھلا اس نے آپ کو یتیم پا کر جگہ نہیں دی (پناہ دی) اور راستے سے ناواقف دیکھا تو رستہ دیکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا تو آپ ﷺ بھی یتیم پر ستم نہ کرنے گا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دیجیے گا اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہے گا۔''

''جب حضرت محمد ﷺ پر پہلی وحی کے بعد وحی کا سلسلہ رک گیا تو آپ بہت مغموم رہنے لگے اور عبادات میں بھی خلل پڑا تو کفار مکہ نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا کہ محمد ﷺ کو ان کے خدا نے چھوڑ دیا ہے۔ان کی باتوں پر آپ ﷺ بہت دلبرداشتہ ہوئے تب یہ سورۃ نازل ہوئی تھی۔''

(میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن یہ اب شکوے کے آنسو نہیں تھے ضمیر کو معلوم تھا تبھی اسنے اپنی بات جاری رکھی۔)

''اللہ رب العالمین کو معلوم تھا کہ تم آج پھر دل گرفتہ ہو گی تبھی اس نے تمہیں یہ سورۃ تلاوت کرائی تاکہ میں اسے تمہارے سامنے حجت پیش کر سکوں۔ اگر تم غور کرو تو اللہ تم سے فرما رہا ہے۔

''یہ تو دنیاوی آزمائشیں ہیں اور تم دنیا کی فکر میں مبتلا رہے ہو یہاں کے لوگوں کے رویے تمہیں تنگ کر رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آخرت کا اجر دنیا سے کہیں بہتر ہے۔ مجھ سے شکوے کر کے میری ناشکری نہ کرو۔ تم بے آسرا تھے کیا میں نے تمہیں آسرا نہیں دیا۔ تم تنگ دست تھے کیا میں نے تمہیں غنی نہیں کیا۔ تم محتاج تھے کیا تمہیں لوگوں کی محتاجی سے نہیں بچا لیا۔ تم میری نعمتیں یاد کرتے رہو گے تو کبھی دل گرفتہ نہیں ہو گے۔''

ضمیر بول رہا تھا میں سن رہی تھی' رو رہی تھی اور اللہ کی نعمتیں یاد کر رہی تھی۔ واقعی میں کیا تھی۔ کچھ سال پہلے میں بے نمازی، گناہ گار، ناشکری اور کافر ہوئی تھی اور آج میں ہدایت یافتہ تھی۔ صراط مستقیم کی راہ اپنانا چاہتی تھی۔ مجھے اللہ نے سیدھا راستہ دیکھا دیا تھا۔ دنیا کی وہ تمام نعمتیں دی تھیں جو ایک عام انسان تصور کر سکتا ہے۔ ہدایت اور حساس دل بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ پھر بھی میں شکوے کر رہی تھی۔ اگر میرے ساتھ برا ہو رہا تھا تو اللہ اس کا مکمل البدل بھی تو ان نعمتوں کی صورت میں دے رہا تھا۔ اللہ صحیح کہتا ہے کہ ''اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

''اگر اللہ ہمیں معاف کر دیتا ہے اور نعمتیں نچھاور کرتا ہے تو ہم کیوں نہیں اللہ کی خاطر اللہ کے بندوں کو معاف کر دیتے۔ کیوں صبر نہیں کرتے۔ آخرت کے بجائے دنیا والوں کی فکر میں گلے ہیں۔ تم صرف انہیں نظر انداز کرو، بہتر ہے کہ معاف کر دو۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور انہیں ہر برا بھلا نہ کہو ورنہ صبر و برداشت کا کوئی فائدہ نہیں۔ دل وسیع کر لو اور اپنے اوپر اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور اس کا شکر ادا کرتے رہا کرو۔''

دنیا سے امیدیں وابستہ مت کرو، اپنے سارے مخلص ہو جاؤ، قرآن سے مدد لو اپنے رب سے اپنی زندگی کی ڈور جوڑ لو یہ تمہارے اور تمہارے ساتھ جڑے رشتوں کے لیے بہتر ہو گا۔

میں نے ہار کر آنکھیں موند لی مجھے صبر آ گیا تھا میں اب مسکرا رہی تھی اپنے پروردگار کی نعمتیں اور اپنے لیے اس کی محبت کو یاد کر کے۔ ضمیر بھی مسکرا رہا تھا اپنی کامیابی پر۔ لیکن دور کہیں کوئی رو رہا تھا شیطان آج ناکام ہوا تھا اسے رونا تو تھا ہی کیونکہ آج پھر ضمیر کا خیر شیطان کے شر پر غالب آ گیا تھا۔

آسمانوں پر بہت دور رب کا نور بہت زور سے چمکا جیسے وہ خوش ہو۔ فرشتے سمجھ گئے کہ لگتا ہے آج پھر کوئی اہل ایمان جیت گیا۔

□□.....❁.....□□

جذبہ ایمانی کو تازہ کرتی تحریر

اللہ اجر دے گا

عزت بڑی طاقت ور چیز ہے یہ کم ظرفوں کو راس نہیں آتی ایسا ہی اس عورت کے ساتھ ہوا.....

دستگیر شہزاد

نیکی کر دریا میں ڈال..... یہ مقولہ آپ نے سنا بھی ہو گا۔ پڑھا بھی ہو گا اور اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی ہو گی کہتے ہیں نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ یہ درست ہے لیکن بعض اوقات یہی نیکی گلے بھی پڑ جاتی ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کی جاتی ہے وہ اس کی قدر کرنے کے بجائے نیکی کرنے والے کے لیے مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ محاورہ وجود میں آیا ہو گا کہ نیکی برباد گناہ لازم.....

میں آپ کو امین الدین کی کہانی سناتا ہوں جنہوں نے ایک کم ظرف عورت کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی اور اس وجہ سے ان کا ہنستا بستا گھر برباد ہو گیا اور امین الدین کو قتل کے جرم میں جیل جانا پڑا۔

جب امین الدین نے مجھے یہ بتایا کہ وہ قتل کے جرم میں سزا یافتہ ہیں تو مجھے یقین نہ آیا۔ ان کا نورانی چہرہ' سفید داڑھی اور زیر لب چھپی دھیمی سی مسکراہٹ دیکھ کر دل میں احترام کے جذبات ابھر آئے۔ یہ شخص قاتل یا مجرم ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے دل نے گواہی دی مجرموں کے چہرے اتنے پاکیزہ نہیں ہوتے۔ وہاں تو گناہوں کی لعنت برستی ہے نرمی کی بجائے کرختگی ہوتی ہے۔ لطیف سے تبسم کی بجائے ایک طنزیہ اور زہریلی مسکراہٹ ہوتی ہے۔

''تمہیں یقین نہیں آیا ہو گا۔'' امین الدین نے مجھے تذبذب کے عالم میں دیکھ کر کہا۔

''اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے بعض اوقات حالات کا شکنجہ انسان کو اس بری طرح جکڑ تا ہے کہ انسان بے بس ہو جاتا ہے' میں بھی بے بس ہو گیا تھا۔ میں نے یہ قتل غیرت کی خاطر کیا تھا..... دنیا والے بے شک مجھے قاتل کہیں لیکن میں نے یہ قتل کر کے اپنا فرض ادا کیا تھا۔''

میرے کریدنے پر امین الدین نے مجھے اس قتل کا پس منظر سنا دیا تو میں نے ان کی آپ بیتی کو سچی کہانیاں میں شائع کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے اس شرط پر اجازت دی کہ ان کے نام

بجائے فرضی نام لکھے جائیں اور کسی کو ان کا ریس نہ دیا جائے۔

میری دلچسپی کہانی کے ساتھ تھی نہ کہ کرداروں کے ناموں کے ساتھ اس لیے میں نے فوراً ان کی شرط منظور کر لی۔

میں ان کا تھوڑا سا تعارف کرا دوں۔ زمینداری کرتے ہیں اور خاصے خوش حال ہیں۔ پکے سچے مسلمان ہیں ایک دینی جماعت اور جہادی تنظیم کے باقاعدہ ممبر ہیں۔ تبلیغ کے علاوہ جہاد میں بھی حصہ لیتے ہیں اور کئی بار مقبوضہ کشمیر جا چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اصل نام نہیں دیا جا رہا۔ یہ جہادی تنظیم بھارتی قابضین فوجوں کے خلاف کارروائیاں کرنے کے لیے گروپ بھیجتی رہتی ہے۔ امین الدین چونکہ پینسٹھ سے زیادہ عمر کے ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب انہیں کسی مشن پر نہیں بھیجا جاتا۔ ویسے ان کی صحت اتنی اچھی ہے کہ کسی پہلو بوڑھے نہیں لگتے۔

آج سے تقریباً سات سال پہلے اس کی جہادی تنظیم نے مقبوضہ کشمیر میں قابضین بھارتی فوج کے خلاف کارروائی کے لیے مجاہدین کا ایک دستہ بھیجا۔ اس میں امین الدین بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ ان کے گاؤں کا ایک آدمی صدیق بھی تھا۔ صدیق شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ بڑا لڑکا اور چھوٹی لڑکی...... صدیق اس جہادی تنظیم کا بڑا ہی پُرجوش رکن تھا اور ہندو کی نفرت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب بھی اسے کسی مشن پر بھیجا جاتا وہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر ایسی دلیری کا مظاہرہ کرتا کہ اس کے ساتھی انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتے۔

یہ سات آدمیوں کا گروپ تھا۔ امین الدین اس کے لیڈر تھے۔ ان کے ذمے یہ مشن تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے اندر مسلمانوں کے ایک گاؤں کے قریب چھوٹی سی پہاڑی پر بھارتی فوجیوں نے پوسٹ بنا رکھی تھی۔ اس پوسٹ کے قریب جو گاؤں تھا۔ بھارتی فوجی ان کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان کی مرغیاں اور بکریاں بلا معاوضہ

پکڑ لاتے ان کی جوان لڑکیاں بھی اٹھا لاتے۔ یہ اطلاع دو کشمیری نوجوان لے کر آئے تھے جو اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔

مجاہدین کے اس گروپ نے جب یہ تفصیلات سنیں تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ اس پوسٹ کو بھی اڑا دیں گے اور اس پوسٹ کے کسی بھارتی فوجی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سات مجاہدوں کے اس گروپ نے سب ساتھیوں سے کہا سنا معاف کرایا اور ضروری تیاری کے ساتھ اللہ کا نام لے کر نکل پڑے۔ ہر مجاہد کے پاس ایک کلاشنکوف، چار ہینڈ گرنیڈ، ایک ریوالور ایک لمبے پھل والا شکاری چاقو اور ایک سو راؤنڈ فالتو تھے۔ بیلٹ باندھنے والی جگہ پر کمر کے ساتھ گاترا بندھا تھا جس کے ساتھ اسلحہ تھا۔

ہر ایک کی کمر پر ایک ایک پٹھو (تھیلا) تھا۔ جس میں بھنے ہوئے چنے، گڑ، ایک رسی اور ضرورت کی دوسری اشیاء جن میں فرسٹ ایڈ کے لیے ضروری اشیاء تھیں دو دو ہزار روپے انڈین کرنسی بطور احتیاط ہر مجاہد کو دے دی گئی تھی کہ مشن کے بعد یا اتفاقاً کوئی مجاہد بھٹک کر مقبوضہ کشمیر کی طرف نکل جائے تو بھارتی کرنسی کام میں لائے۔ اس گروپ میں دو مجاہد مقبوضہ کشمیر کے اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جس کے قریب بھارتی فوجیوں نے ایک پہاڑی پر پوسٹ بنا رکھی تھی۔

یہ مجاہد گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے اور اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ ان لوگوں کے پاس ایسی دوربینیں بھی تھیں جن کے ذریعے رات کے اندھیرے میں دیکھنا ممکن تھا۔ یہ پارٹی مظفر آباد کی طرف سے کشمیر میں داخل ہوئی۔ یہ جولائی کا مہینہ تھا لیکن کشمیر میں سخت سردی تھی۔ انہوں نے دس ہزار فٹ کی بلندی تک جانا تھا۔ بارڈر پر پہنچ کر امین الدین نے گائیڈوں کی مدد سے اس علاقے کا نقشہ بنایا جہاں انہوں نے حملہ کرنا تھا۔ یہ بارڈر ایریا تھا اور فارورڈ کہوٹہ کہلاتا ہے۔ یہ پارٹی کشمیری نوجوانوں کی رہنمائی میں ایک مخصوص جگہ سے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوگئی۔

اب وہ اس علاقے میں تھے جہاں کا ہر درخت اور پودا پہاڑیاں اور ایک ایک پتھر ان کا دشمن تھا۔ انہوں نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ گائیڈ انہیں ایسے راستوں اور علاقے سے گزار کر لے جا رہے تھے جہاں گھنا جنگل تھا اور آسمان نظر نہیں آتا تھا وہاں انسان تو کیا ہاتھی بھی چھپ سکتا تھا۔

وہ سب خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہے تھے۔ اندھیرے میں ان کے ہیولے ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ انسان نہ ہوں بلکہ بھوت ہوں۔ سب کو امین الدین نے سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی آواز نکلنے نہ پائے کھانسی یا چھینک کو جسم کے اندر ہی دبا لیا جائے۔ دشمن ذرا سے شک پر اندھا دھند فائر کھول سکتا تھا اور یہ فائر اس قسم کا ہوتا جیسے چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔

چلتے چلتے اچانک ایک نوجوان مجاہد کے منہ سے سسکاری نکل گئی وہ اپنے دائیں ہاتھ کو بری طرح جھٹک رہا تھا۔ قریب جا کر اس کے ہاتھ کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو وہ سوج گیا تھا اور جلد سرخ ہوگئی تھی۔ امین الدین نے سمجھا شاید اس کے ہاتھ پر کوئی زہریلا کیڑا کاٹ گیا ہے۔ ایک کشمیری گائیڈ نے بتایا۔

"یہ کسی زہریلے کیڑے کا کام نہیں بلکہ اس

علاقے میں بعض ایسے پودے پائے جاتے ہیں۔ جن کے پتوں سے انسان کے جسم کا کوئی ننگا حصہ چھو جائے تو اس پر زبردست خارش اور سوزش پیدا ہو جاتی ہے۔''

اس کے بعد امین الدین نے تمام ساتھیوں کو ہدایت کر دی کہ چلتے ہوئے کسی پودے کو ہاتھ نہ لگائیں اور اپنا منہ اور گردن بچا کر چلیں گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ اس علاقے میں بلیک ٹائیگر' سانپ' بچھو اور دوسرے جانور پائے جاتے ہیں۔ یہ سن کر سب لوگ محتاط ہو گئے رات کو اندھیرے میں کئی بار بلیک ٹائیگر کی آنکھیں چمکتی نظر آئیں بہرحال سب لوگ امین الدین کی ہدایت پر درود شریف اور آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے چلتے رہے۔ دن میں بھی یہ سفر جاری رہا۔

یہ کوئی میدانی علاقہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی سڑک تھی۔ وہ لوگ عام راستے سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے جو خاصا دشوار گزار تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ دوسری رات کو انہوں نے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر پڑاؤ کیا اور سو گئے۔ دونوں کشمیری گائیڈ جاگتے رہے۔ اس رات غیر متوقع طور پر بارش شروع ہو گئی تمام مجاہد سردی سے کانپنے لگے کپڑے اور جیکٹس بھیگ کر بھاری ہو گئیں۔ ٹھنڈی ہوا بدن کو کاٹنے لگی۔ اس کے باوجود کسی بھی جنگجو نے ہمت نہ ہاری اور ثابت قدم رہے۔

تھوڑا آگے ایک پہاڑی نالا ہے۔ ایک گائیڈ نے ان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''اس کو پار کر لیں گے تو اپنے ہدف کے قریب پہنچ جائیں گے۔'' یہ سن کر سب ایک نئے جوش کے ساتھ آگے بڑھنے لگے اچانک سب سے آگے چلنے والا ایک گائیڈ پھسل گیا اور ڈھلان میں لڑھکنے لگا۔ سب دم بخود ہو کر اسے موت کے منہ میں جاتا دیکھنے لگے۔ کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بارش نے زبردست پھسلن پیدا کر دی تھی۔ اس گائیڈ کی ابھی زندگی باقی تھی۔ اس لیے وہ خاصا گہرائی میں جا کر ایک درخت کے تنے کے ساتھ جا کر رک گیا۔ اس گائیڈ کو نیچے سے اوپر لانے میں اڑھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ نالا آ گیا جس کا ذکر گائیڈ نے کیا تھا۔

کہنے کو تو یہ نالا تھا لیکن اس کی گہرائی بڑی خوفناک تھی۔ جب اس کو پار کرنے کا مرحلہ آیا تو پل کو دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ یہ پل نہیں بلکہ پل صراط تھا۔ ایک بڑے سے درخت کا تنا بچھا کر اس کو بطور پل استعمال کیا جاتا تھا۔ جب اس پر چلتے تو یہ دائیں بائیں ہلنے لگتا۔ یہ واحد راستہ تھا پار جانے کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ سب سے پہلے ایک گائیڈ اس پل سے گزر کر پار گیا۔ اس کی تقلید میں باری باری سب اس پل صراط سے گزر گئے یہ ایک خوفناک تجربہ تھا۔ یہاں سے ایک گائیڈ نے دوربین سے انہیں ٹارگٹ دکھایا جو ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ یہ ایک بنکر تھا۔ اس کے اردگرد بڑے بڑے پتھر چن کر مورچہ بنایا گیا تھا اور وہاں ایک ہیوی مشین گن لگی ہوئی تھی۔ دو تین بھارتی فوجی ٹہلتے نظر آ رہے تھے۔

''اس مورچے سے دور اوپر دیکھیں۔'' گائیڈ نے کہا۔

''بلند پہاڑوں پر دشمن کی ایک اور پوسٹ ہے ہمیں ان کی نظر سے بھی بچ کر رہنا ہوگا۔'' سب مجاہد جائزہ لے چکے تو گائیڈ نے دوربین کے ذریعے اپنا گاؤں دکھایا۔ سب اپنی اپنی دوربین سے گاؤں کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اور گائیڈ کمنٹری کرتا جا رہا تھا۔ ایک کشمیری عورت اپنی بکریوں کو

ہانک رہی تھی اور ایک بھارتی فوجی اس کے ساتھ کسی بات پر غصے سے بول رہا تھا۔

''یہ میری بھابی ہے۔'' گائیڈ نے بتایا۔

''بھارتی فوجیوں کو ہم دونوں بھائیوں پر شک ہے کہ ہم پاکستان سے آنے والے مجاہدین کی مدد کرتے ہیں ضرور یہ بھارتی کتا اس سے ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہوگا۔'' گائیڈ کے چہرے پر قہر نظر آنے لگا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا بس چلے تو وہ اس بھارتی فوجی کی بوٹیاں اڑا دے۔

انہوں نے ہدف سے مناسب فاصلے پر جا کر ایک محفوظ جگہ پر پڑاؤ کیا اور حملہ کرنے کے لیے اپنے ہدف کا نقشہ بنا لیا دو دن تک یہ مجاہدین اس پوسٹ پر موجود بھارتی فوجیوں کے معمولات کا جائزہ لیتے رہے۔ اندازاً وہاں 15 سے 20 فوجیوں کی نفری تھی۔

دن کے وقت چھ سنتری پہرہ دیتے اور رات کو ان کی تعداد بڑھا کر بارہ کر دی جاتی تھی۔ پوسٹ کے نیچے پانی کا ایک چشمہ تھا جہاں بھارتی فوجی منہ ہاتھ دھوتے یا نہاتے تھے۔ ایک خاص بات جو نوٹ کی گئی وہ یہ تھی کہ بھارتی فوجی پوسٹ سے نیچے آنے اور جانے کے لیے ایک مخصوص راستہ استعمال کرتے تھے اور اس میں بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کشمیری گائیڈ نے بتایا۔

''کم بختوں نے مجاہدین کی کارروائیوں سے ڈر کر پوسٹ کے اردگرد بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں اس کے علاوہ سرچ لائٹ تھی جو ایک مخصوص وقفے کے بعد روشن ہوتی اور پوسٹ کے سامنے والے حصے پر نصف دائرے میں گھومتی ہوئی بند ہو جاتی۔ اس کی روشنی جہاں جہاں پڑتی گھاس کا ایک ایک تنکا تک واضح نظر آنے لگتا۔'' گائیڈ نے بتایا۔

''پوسٹ پر ایک مشین گن' ایک اینٹی ایئر کرافٹ کے علاوہ G2 گنیں موجود ہیں۔'' یہ دن مجاہدوں نے چنے اور گڑ کھا کر گزارہ کیا۔ وہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔ جگہ جگہ قدرتی چشمے مل جاتے تھے۔ کشمیری نوجوانوں نے ان لوگوں کو ایک پھل کھلایا جو وہاں درختوں پر لگا ہوا تھا اور خاصا خوش ذائقہ تھا۔

امین الدین نے گائیڈوں کے مشورے سے پوسٹ پر حملہ کرنے کا جو پلان بنایا اس کے مطابق وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اس پوسٹ کی پچھلی طرف پہنچ گئے۔ سامنے سے حملہ کرنا ناممکن تھا۔ وہاں اکثر گہری دھند چھا جاتی تھی اور رات کو بارش ہو جاتی تھی۔ امین الدین نے اس دھند اور بارش سے فائدہ اٹھانے کے لیے چوتھی رات حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔

چوتھی رات دس بجے سب تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گھڑیاں ملالیں۔ یہ گھڑیاں مخصوص ساخت کی تھیں اور ان کے ڈائلوں پر کیپ یا ڈھکن لگا ہوا تھا تاکہ ان کے ڈائل چمک کر ان کی نشاندہی نہ کر سکیں۔ رات کے اندھیرے اور دھند کی آڑ میں مجاہدوں کا یہ کارواں بلندی پر موجود پوسٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کی رفتار بے حد سست تھی وہ رینگ رینگ کر آگے بڑھتے رہے۔

ذرا تصور میں لائیں دشمن بلندی پر محفوظ جگہ پر بیٹھا ہو تو نیچے سے اوپر جا کر حملہ کرنا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے۔ ذرا شک پر دشمن نے بے دردی سے وار کیا لیکن مجاہدوں کی نیت صاف تھی۔

جذبے بے لوث تھے دل میں شہادت کی تڑپ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قدرت بھی ان کی مدد کر رہی

تھی دھند نے ان کو چھپالیا تھا۔

قدم قدم پر سرکتے وہ پوسٹ کے قریب پہنچ گئے۔ انہیں بھارتی فوجیوں کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تاش کھیل رہے تھے جو پہرے پر کھڑے تھے۔ ان کا دھیان سامنے کی طرف تھا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ان پر عقب سے حملہ ہوسکتا ہے۔ جب یہ لوگ اتنے قریب پہنچ گئے کہ ہینڈ گرنیڈ اندر پھینک سکیں تو امین الدین کے اشارے پر سب نے ایک ایک گرنیڈ نکال لیا۔ امین الدین نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا تو سب نے اپنے اپنے گرنیڈ کی پن نکال لی اور پھر فوراً ہی امین الدین کا ہاتھ نیچے آیا۔ اس کے ساتھ ہی سات گرنیڈ پوسٹ کی طرف گئے۔

صرف ایک گرنیڈ ہدف سے ذرا دور گرا۔ باقی سب مطلوبہ جگہ گرے۔ سب مجاہد کانوں میں انگلیاں دے کر پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ جب سات گرنیڈ اکٹھے پھٹے تو ایسا لگا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ بھارتی فوجیوں کے جسم فضا میں اچھلے اور ان کے پرخچے اڑ گئے جو بھارتی فوجی بچ گئے تھے ان کو گنوں سے فائر کر کے بھون دیا گیا۔

سب مجاہد امین الدین کے اشارے پر واپسی کے لیے پلٹ گئے۔ انہوں نے کامیابی سے اپنا ٹارگٹ تباہ کردیا تھا۔ اب وہاں سے زندہ سلامت نکلنا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے محفوظ مقام کی طرف بھاگنے لگے۔ یہاں کشمیری گائیڈوں کی مہارت کام آرہی تھی۔ اچانک تباہ ہونے والی پوسٹ سے اوپر والی پوسٹ والوں نے اندھا دھند فائر کھول دیا۔ وہ تباہ ہونے والی پوسٹ کے اردگرد فائر کررہے تھے غالباً وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ نیچے والی پوسٹ پر پاکستانی مجاہدوں نے شب خون مارا ہے۔

امین الدین نے اپنے سب ساتھیوں کو سختی سے ہدایت کردی کہ کوئی ایک گولی بھی فائر نہیں کرے گا۔

گولی چلانے کی صورت میں دشمن ان کی پوزیشن سے آگاہ ہوجاتا اور پھر وہاں سے نکلنا ناممکن ہوجاتا۔ یہ لوگ محفوظ راستے پر آگے بڑھتے رہے۔ دشمن بارش کی طرح گولیاں برسا رہا تھا۔ چھوٹے فائر کے ساتھ ہی مارٹر گنوں کے گولے بھی برسنے لگے بھارتی بوکھلاہٹ میں بے دریغ اسلحہ پھونک رہے تھے۔

اچانک مارٹر گن کا ایک گولہ ان کے قریب پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا صدیق کی گردن میں جالگا اور صدیق گر پڑا۔ امین الدین نے صدیق کو سنبھالا۔ مارٹر کے گولے کا ٹکڑا صدیق کی شہ رگ کاٹ گیا تھا اور خون بڑی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ ان کے پاس فرسٹ ایڈ کا جو سامان تھا اس سے خون روکنے کی کوشش کی لیکن تھوڑی ہی دیر میں صدیق شہادت کا رتبہ پاگیا۔

انہوں نے مارٹر کے گولوں اور گولیوں کے دھماکوں میں صدیق کی لاش اٹھائی اور واپسی کا سفر جاری رکھا۔ سب مل کر باری باری لاش اٹھا کر چلتے رہے اور مزید کسی مشکل میں پڑے بغیر بہ حفاظت پاکستانی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد انڈیا ریڈیو آکاش وانی کی خبروں میں اس پوسٹ کی تباہی کی خبر بھی آگئی۔

صدیق شہید کا تعلق چونکہ امین الدین کے گاؤں سے ہی تھا۔ اس لیے اس نے شہید کی میت کو گاؤں پہنچانے کی ذمہ داری لے لی پورا گاؤں صدیق شہید کی میت دیکھنے کے لیے امڈ آیا۔ لوگ بڑی عقیدت کا اظہار کررہے تھے اور اس کی

قسمت پر رشک کررہے تھے۔

عورتیں صدیق کی بیوہ شکیلہ کو حوصلہ دے رہی تھیں مگر وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ عورتیں اسے سمجھا رہی تھیں کہ شہید مرتا نہیں بلکہ زندہ ہوتا ہے اور زندہ پر رونا مناسب نہیں.....

''یہ سب محض باتیں ہیں۔'' شکیلہ نے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔

''میں بیوہ ہوگئی۔ میرے بچے یتیم ہوگئے۔ ہمارا تو کوئی آگے پیچھے بھی نہیں جو ہمیں سنبھال لے..... اگر شہید زندہ ہوتا ہے تو کیا اب بھی وہ ہمارے خرچے پورے کرے گا؟ کیا وہ اب بھی میرے سر پر چادر رکھے گا؟ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں وہ خود تو جنت میں چلا گیا ہے اور ہمیں جہنم میں چھوڑ گیا ہے۔ سب لوگوں کو چپ لگ گئی کسی کے پاس شکیلہ کے سوالوں کا جواب نہ تھا۔

شکیلہ ٹھیک کہہ رہی تھی یا غلط اس سے قطع نظر وہ ایک تلخ حقیقت بیان کررہی تھی۔ صدیق کوئی باقاعدہ تنخواہ دار فوجی نہیں تھا۔ وہ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے یہ جہاد کررہا تھا۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ شہید کی شان میں بڑے قصیدے پڑھے جاتے ہیں تقریریں کی جاتی ہیں۔ نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ مسجدوں میں شہادت کے رتبے کی فضیلت بیان کی جاتی ہے مگر شہید کے لواحقین کو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ تمہارا کیا ہے کیسے جی رہے ہو کہاں سے کھاتے پیتے ہو۔ امین الدین کو اللہ نے خوشحالی عطا کی تھی اور دردِ دل بھی.....

انہوں نے شکیلہ کو تسلی دی کہ مصیبت کی اس گھڑی میں اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے اور جو کچھ ہوسکا اس کے لیے اور بچوں کے لیے ضرور کریں گے۔

امین الدین کی یہ بات بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور ان کی دیکھا دیکھی دو تین اور صاحب ثروت آدمیوں نے بھی اپنے تعاون کی یقین دہانی کرادی۔ اگلے دن سے ہی شکیلہ اور اس کے بچوں کو اچھی خاصی مالی اور دیگر ضروریات کی امداد فراہم کردی گئی اور اس کے لیے ماہانہ خرچ مقرر کردیا گیا۔

اس طرح اس کی اچھے طریقے سے گزر ہونے لگی۔ ابھی صدیق کو شہید ہوئے اڑھائی تین ماہ ہی گزرے ہوں گے جب امین الدین کو یہ اطلاع ملی کہ ان کے علاوہ جو دوسرے لوگ شکیلہ کی امداد کررہے ہیں۔ ان میں سے دو آدمی بری نیت سے شکیلہ کے پیچھے لگ گئے ہیں اور وقت بے وقت اس کے گھر آتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شکیلہ اور اس کے بچوں پر نوازشیں کررہے ہیں اور شکیلہ دونوں سے مال بٹور رہی ہے۔

امین الدین یہ خبر سن کر پریشان ہوگئے ایک شہید کی بیوہ کے ساتھ وہ یہ سلوک کبھی بھی گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ صدیق نے مقبوضہ کشمیر کی سرزمین پر اپنا پاک لہو بہایا تھا اور امین الدین کے ہاتھوں میں شہید ہوا تھا۔ امین الدین اس مسئلے کا کوئی پائیدار حل سوچنے لگے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک حل سوچ لیا۔ ایسا حل جس سے شکیلہ کی عزت بھی محفوظ رہتی اور وہ کسی کی محتاج بھی نہ رہتی۔

امین الدین شام کو شکیلہ کے گھر چلے گئے شکیلہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ امین الدین نے بلا تمہید شکیلہ سے اپنے سارے خدشات کا اظہار کردیا اور اس صورتِ حال میں اپنی ناپسندیدگی بھی ظاہر کردی۔

''میں بڑی مجبور ہوں چوہدری صاحب۔'' شکیلہ نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

''میں کسی کو اپنے گھر آنے سے روک نہیں سکتی۔ میں انہی کا دیا کھاتی ہوں۔ میرے بچے انہی کا دیا پہنتے ہیں..... آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ شادی کرلو۔'' امین الدین نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''تمہارے سارے مسائل کا یہی حل ہے بدنامی سے بھی بچی رہو گی تمہیں اور تمہارے بچوں کو ایک مضبوط سہارا ہمیشہ کے لیے مل جائے گا۔''

''مگر میرے ساتھ شادی کون کرے گا؟'' شکیلہ نے کہا۔

''ایک بیوہ کو اس کے دو بچوں سمیت کون قبول کرے گا؟ وقتی ساتھ دینے کا ہر کوئی خواہش مند ہے۔ عمر بھر کے لیے کوئی بھی اس پھندے کو اپنی گردن میں ڈالنے کو تیار نہ ہوگا۔''

امین الدین نے شکیلہ کو سمجھایا۔

''وہ اپنے دونوں امیدواوں کے سامنے یہ شرط رکھ دے کہ اسے حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ ہے شادی..... اگر ان دونوں میں سے کوئی تمہارے ساتھ مخلص ہوگا تو شادی پر رضامند ہو جائے گا ورنہ تمہارے راستے سے ہٹ جائے گا۔''

شکیلہ نے امین الدین سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی ہدایت پر پوری طرح عمل کرے گی۔ امین الدین کو یقین تھا کہ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرر شکیلہ سے شادی کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شکیلہ صرف نام کی ہی شکیلہ نہیں تھی بلکہ وہ اسم بامسمّٰی تھی۔ عمر بھی اس کی ابھی ستائیس اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی اور گورے رنگ کے ساتھ نین نقش میں بڑی کشش اور جاذبیت تھی۔ اُسے دیکھ کر کوئی بھی مرد اس کی خواہش کر سکتا تھا۔

مگر امین الدین کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ دو دن بعد شکیلہ نے امین الدین کو بتایا کہ اس نے جب دونوں امیدواروں کے سامنے شادی کی شرط رکھی تو دونوں کے منہ لٹک گئے۔ دونوں نے اسے اپنی مجبوریاں بتانی شروع کردیں۔ شکیلہ سمجھ گئی کہ دونوں اس کے ساتھ محض موج میلے کے لیے تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری اٹھانے کو کوئی تیار نہیں۔ امین الدین کو یہ سن کر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ انہوں نے کہا۔

''وہ اس کے لیے خود کوئی مناسب آدمی تلاش کریں گے۔'' پس کے بعد امین الدین نے ان دونوں آدمیوں سے الگ الگ ملاقات کی اور ان کو خوب شرمندہ کیا۔ ان میں سے ایک آدمی رنڈوا تھا اور اس کے چھ بچے تھے اور دوسرا بھی بیوی بچوں والا' یہ دونوں بڑے ہی ڈھیٹ ثابت ہوئے اور شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا شکیلہ پر الزام لگانے لگے۔

وہ خود خراب عورت ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ بہرحال امین الدین نے بڑی سختی سے ان دونوں کو منع کردیا کہ وہ شکیلہ کے گھر نہ جائیں اور ایک شہید کی بیوہ کو بدنام نہ کریں۔ ایک کا نام شرافت اور دوسرے کا نام معراج الدین تھا۔

''ایک بات ذہن نشین کرلو۔'' امین الدین نے کہا۔

''اگر تم نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو میں پورے گاؤں میں تمہیں ذلیل وخوار کرکے رکھ دوں گا۔'' وہ دونوں کوئی کمی کمین نہیں تھے جو امین

الدین کی بات سن کر خاموش رہتے۔ وہ گاؤں کے کھاتے پیتے لوگ تھے اور سراونچا کرکے رہتے تھے۔ اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو لاٹھیاں کلہاڑیاں نکل آتیں۔ مگر یہاں معاملہ ان کی نیک نامی اور اونچے شملے کا تھا اور وہ ایک عورت کے ساتھ بدنام نہیں ہونا چاہتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ دونوں چپ چاپ چلے گئے تھے۔ شرافت اور معراج چپ چاپ چلے تو گئے لیکن آرام سے نہ بیٹھے کہتے ہیں کہ بلی اگر کھائے گی نہیں تو اوندھائے کی ضرور یہی ان دونوں نے کیا۔ انہوں نے شکیلہ کو در پردہ بدنام کرنا شروع کردیا اور جو رقم بطور امداد دیتے تھے وہ بھی بند کردی۔ یہ صورت حال شکیلہ کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ اب اس کا گزارہ صرف امین الدین سے ملنے والی امداد پر ہونے لگا اور وہ تنگدست ہوگئی۔

دوسری طرف امین الدین پوری تندہی سے شکیلہ کے لیے کسی مناسب آدمی کی تلاش میں تھے جو اس کو اس کے بچوں کو اپنا لے لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شکیلہ اگر صرف بیوہ ہوتی تو کوئی نہ کوئی اسے قبول کرلیتا۔ مگر بیوہ کے ساتھ دو بچوں کو قبول کرنے پر کوئی بھی تیار نہ ہوا ایک آدمی نے یہ شرط لگادی کہ وہ بچے چھوڑ دے تو وہ اسے قبول کرنے کو تیار ہے۔

''تو پھر بچوں کا کیا بنے گا؟'' اس سے پوچھا گیا۔

''وہ کہاں جائیں گے؟''

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''کہیں بھی چلے جائیں۔''

یہ مرد فطرت ہے کہ خود چاہے چار بیویاں رکھ لے اور بیس عورتوں سے تعلقات بنالے لیکن اپنے لیے ایسی عورت چاہے گا جسے کسی دوسرے مرد نے دیکھا بھی نہ ہو چھوتا تو بڑی بات ہے۔ اگر یہی شرط عورت بھی لگادے تو پھر..... بچوں کے حوالے سے ایک نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ بچوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوگا کہ اس عورت کا تعلق ماضی میں کسی دوسرے مرد سے رہ چکا ہے اور یہ اسی مرد کی اولاد ہے اور اس طرح وہ رقابت کا شکار ہو جاتا ہے۔

اِدھر شکیلہ کا ہاتھ تنگ ہوا تو وہ دل ہی دل میں امین الدین کو برا بھلا کہنے لگی۔ دراصل بات یہ تھی کہ خاوند کی شہادت کے بعد اس کے ہاتھ میں اتنے پیسے آنے لگے تھے کہ کبھی اس کے شہید خاوند کی زندگی میں بھی نہ آئے تھے۔ سادہ سی زندگی گزارنے والی شکیلہ کے عیش ہوگئے اور وہ اِدھر اُدھر سے پیسے بٹورنے لگی۔

پہلے پہل اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ اسے ایک شہید کی بیوہ سمجھ کر اس کی امداد کرتے ہیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ امین الدین کے علاوہ باقی سب کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی کے بجائے ہوس کے جذبات نظر آتے ہیں۔ اس نے اس صورت حال سے سمجھوتہ کرلیا اور سب کچھ جان کر بھی انجان بن گئی۔

لیکن پھر امین الدین نے سارا کام خراب کردیا۔ شکیلہ نے امین الدین کو بتایا کہ ان کی وجہ سے اس پر مصیبت نازل ہوئی ہے کہ اچھے بھلے پیسے بند ہوگئے ہیں امین الدین نہایت شریف اور خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے شکیلہ کی امداد میں اضافہ کردیا۔ جس سے شکیلہ بہ ظاہر مطمئن ہوگئی۔

معراج اور شرافت کو شکیلہ کو بدنام کرکے بھی

چین نہ آیا تو انہوں نے اپنی توپوں کا رخ امین الدین کی طرف کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ سارے فساد کی جڑ یہی شخص ہے۔ ان دونوں نے امین الدین کو شکیلہ کے ساتھ ملوث کر کے بدنام کرنا شروع کر دیا۔ شکیلہ کے لیے بھی یہ صورت حال پریشانی والی تھی لیکن امین الدین جیسے نیک خصلت انسان کے لیے یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ اگرچہ لوگوں نے ان کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے کو سچ نہیں جانا۔

لیکن امین الدین کے لیے ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر غلط راستے پر چل نکلے اور پھر قیامت والے دن وہ اپنے شہید دوست اور خدا کو کیا جواب دیں گے۔ انہوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کیا انہوں نے شکیلہ سے کہا۔

"وہ اپنی بیوی سے اجازت لے کر اس سے بات کریں گے۔"

اس کے بعد امین الدین نے اپنی بیوی کے ساتھ شکیلہ کے بارے میں تفصیل سے بات کی اور اس سے مشورہ مانگا کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ میاں اگر فرشتہ سیرت انسان تھا تو بیوی بھی کسی طرح کم نہ تھی۔ اس نے فوراً امین الدین کو شادی کی اجازت دے دی۔ وہ اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کس نیت سے یہ شادی کر رہا ہے۔

اس نے شکیلہ سے کوئی جلن یا حسد اس لیے بھی محسوس نہیں کیا کہ وہ اپنی عمر کا سنہری دور امین الدین کے ساتھ گزار چکی تھی اور جانتی تھی کہ اب اس کا شوہر عورت کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

بہرحال امین الدین نے ایک مرتبہ پھر شکیلہ سے کھل کر بات کی۔ ان کے دل میں یہ بات تھی کہ ایسا نہ ہو شکیلہ بعد میں اپنے فیصلے پر پچھتائے۔

"ابھی وقت کی لگام تمہارے ہاتھ میں ہے شکیلہ۔" امین الدین نے شکیلہ سے کہا۔

"خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو...... اگر تم صرف اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کے لیے شادی کرنا چاہتی ہو اور ان کو ایک محفوظ سائبان دینے کے لیے یہ قدم اٹھا رہی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر تمہیں ایک خاوند کی ضرورت ہے تو پھر میری طرف سے انکار سمجھو میرا بڑھاپا تمہاری جوانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر تم چاہو تو میں ویسے ہی تمہارا اور تمہارے بچوں کا پورا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

"میں آپ کی احسان مند ہوں اور جانتی ہوں کہ آپ جو کہہ رہے ہیں کر کے بھی دکھائیں گے لیکن میں لوگوں کی زبانوں کا کیا کروں جو آپ جیسے نیک آدمی کا نام لے کر مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ آپ کی بھی بدنامی ہو رہی ہے کل کو بچے بڑے ہو جائیں گے اور پھر میں ان کے کچے ذہن اس جھوٹ سے آلودہ ہو جائیں گے اور پھر میں ان سے آنکھ نہیں ملا سکوں گی۔

اگر آپ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں تو میرے تمام غم فکر دور ہو جائیں گے۔ میں آپ سے وہ کچھ نہیں مانگوں گی جو دینا آپ کے بس میں نہ ہو۔"

شکیلہ نے ایسے پُرانداز سے گفتگو کی کہ امین الدین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور پھر چند دن بعد ہی نہایت سادہ طریقے سے نکاح کر کے امین الدین شکیلہ کو حویلی میں لے آئے۔ انہوں نے حویلی کا ایک حصہ شکیلہ کے لیے مختص کر دیا۔ شادی کے تھوڑے دن بعد انہوں نے شکیلہ کے بچوں کو اسی اسکول میں داخل کروا دیا جس میں ان کے اپنے بچے پڑھتے تھے۔ ہر وہ چیز جو ان کے اپنے بچوں کو میسر تھی۔ وہی شکیلہ کے بچوں کو بھی ملنے لگی۔

شکیلہ کے معاملے میں بھی انہوں نے کوئی کمی نہ کی اور زرعی زمین کا ایک مناسب ٹکڑا اس کے نام لگا دیا اور اس کو بھی وہی حقوق دے دیے جو پہلی بیوی کو حاصل تھے۔ انہوں نے ایسا انصاف کیا کہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھے۔

شکیلہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی فرش سے اٹھ کر عرش پر آ گئی تھی۔ پہننے کو قیمتی ملبوسات کھانے کو طرح طرح کی نعمتیں رہنے کو محل جیسی حویلی' اس کا تو دماغ خراب ہونے لگا۔ پیٹ بھر کر کھانے کو ملا تو شکیلہ کا حسن اور بھی نکھر آیا۔ مرجھائے ہوئے عارض دہکنے لگا۔

خود کو مہارانی سمجھنے لگی۔ کم ظرف کی مثال ایسے ہی ہے جیسے چھوٹے برتن میں اس کی گنجائش سے زیادہ چیز ڈال دی جائے تو وہ چھلک جاتا ہے۔

شکیلہ بھی چھلکنے لگی تھی ملازموں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک حقارت والا ہوتا تھا۔

وہ ان کو انسان نہیں سمجھتی تھی۔ اس میں غرور اور تکبر پیدا ہو گیا تھا لیکن اس نے کبھی بڑی بیگم کے احترام میں کمی نہ آنے دی۔ وہ دل سے ان کی احسان مند تھی۔

امین الدین کے آگے تو وہ بچھ بچھ جاتی تھی اور اپنی جوان اداؤں سے ان کا دل لبھانے کی کوشش کرتی تھی۔

جب ہر طرح کی آسائش مل گئی تو شکیلہ کے اندر جوانی کے تقاضے سر اٹھانے لگے۔ اس کی حالت اس پیاسی دھرتی کی سی ہو گئی جو پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہی ہو۔

امین الدین نے شکیلہ میں یہ تبدیلیاں محسوس کر لی تھیں اور خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ ان کے ذہن میں موجود بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے تھے۔

شکیلہ زبان سے تو کچھ نہ کہتی لیکن اس کی حرکات سب کچھ واضح طور پر بیان کر دیتی تھیں انہوں نے شکیلہ کا ساتھ دینے کی کوشش بھی کی لیکن چند قدم چل کر ہانپ گئے۔

ایک طرف تند و تیز ندی تھی جس کی سرکش موجیں اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو بہا لے جاتی ہیں۔ اس کی موجوں میں ایک چیلنج ہوتا ہے کہ ہمت ہے تو مجھ میں اتر کے دیکھو۔ دوسری طرف ایک تالاب تھا جس کے ساکن پانی میں کوئی موج نہیں نہ تحرک' اپنے آپ ہل بھی نہ سکتا تھا۔

کبھی تیز ہوا اس کے پانی کی سطح پر کمزور سی لہریں اس کا سکوت توڑ دیتیں۔ امین الدین نے اس شوریدہ سر ندی کے آگے حفاظتی بند باندھنے کی کوشش کی لیکن بھلا کبھی فطرت کے آگے کوئی بند ٹھہرا ہے ایک طرف سے روکو تو پانی نکلنے کا کوئی اور راستہ اختیار کر لیتا ہے بند پر بند بناتے جاؤ اگر پانی کے بہاؤ میں تیزی ہے تو وہ کہیں رکے گا نہیں' راستے بدلتا چلا جائے گا۔ سیدھا راستہ روکو تو الٹے راستے نکل جائے گا۔

شکیلہ بھی الٹے راستے پر چل نکلی اس راستے میں بڑی پُرکشش ترغیبات تھیں۔ رنگینیاں تھیں اور موج میلہ تھا۔ لیکن انجام کار ذلت اور رسوائی کا گڑھا تھا۔ دنیا بھی خراب آخرت بھی برباد

سیدھا راستہ اگرچہ طویل، پُر خار اور مشکلات سے اٹا ہوا تھا لیکن اس کا اختتام بڑی ہی پرسکون منزل پر تھا۔

شکیلہ نے امین الدین کی نیکی بھلا دی اور ان کی بدنامی کا باعث بننے لگی۔ جو لوگ امین الدین کی بے حد عزت کرتے تھے۔ وہ انگلیاں اٹھانے لگے۔ دبی دبی زبان میں شکیلہ کے قصے گونجنے لگے۔

یہ گونج جب امین الدین کے کانوں تک پہنچی تو وہ تڑپ اٹھے۔ ان کی اپنی بیٹیاں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کی بیگم نے صاف صاف کہہ دیا کہ گندگی کی اس پوٹ کو حویلی سے نکال کر نہیں اور لے جائیں۔

امین الدین نے فوری طور پر شکیلہ کو حویلی سے نکال کر الگ مکان میں پہنچا دیا اور اس پر خاص سختی کی شکیلہ نے کسی بھی الزام کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا۔

''یہ انہی دونوں کا پروپیگنڈہ ہے جن کو اس نے شادی سے پہلے ٹھکرا دیا تھا۔''

الگ مکان میں رہنے کی وجہ سے شکیلہ کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ امین الدین کی حیثیت دو کشتیوں کے سوار کی تھی۔ ایک پاؤں حویلی میں ہوتا تو دوسرا ساتھ والے گھر شکیلہ کو خوب کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

اس نے ایک بڑے ہی وجیہہ نوجوان سے دوستانہ گانٹھ لیا تھا۔ یہ نوجوان غریب سے ایک مزارعے کا بیٹا تھا اور شکیلہ کے اشاروں پر چلتا وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے اپنے پاس بلاتی تھی۔

یہ کھیل زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور ایک روز امین الدین نے شکیلہ کو رنگے ہاتھوں اس نوجوان کے ساتھ پکڑ لیا۔

نوجوان تو بھاگ گیا مگر امین الدین کے سر د خون میں غیرت نے ایسا ابال پیدا کیا کہ ان کا پورا وجود کھولنے لگا۔ یہ ابال دماغ کو چڑھ گیا اور انہوں نے شکیلہ کی خوبصورت گردن اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں لے لی اور پوری قوت سے دبانے لگے۔

جب امین الدین ذرا نارمل حالت میں آئے تو شکیلہ کا بے جان وجود ان کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا اور شکیلہ کی آنکھیں اور زبان باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ امین الدین نے خود ہی جا کر تھانیدار کو ساری بات بتا دی۔ تھانیدار نے انہیں گرفتار کر لیا۔

ان کے خلاف عدالت میں کیس چلا۔ وکیل نے فوری اشتعال ثابت کر دیا۔ جج امین الدین کی شخصیت اور جذبے سے متاثر ہوا۔ اس نے صرف چار سال سزائے قید سنائی۔

امین الدین نے اپنی نیک دل بیوی کو جیل سے پیغام بھجوایا۔

''وہ شہید صدیق کے بچوں کا پہلے کی طرح خیال رکھے اور ان کو کسی کی کمی کا احساس نہ ہونے دے۔ یہ بچے ان کے پاس شہید کی امانت ہیں۔''

''میری نیکی میرے لیے وبال بن گئی تھی۔''

اپنی داستان سنانے کے بعد امین الدین نے مجھ سے کہا۔

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آئندہ کسی کے ساتھ نیکی نہیں کروں گا۔ نیکی کا یہ سلسلہ جب تک میں زندہ ہوں جاری رکھوں گا میں کسی انسان سے صلے کی امید نہیں رکھتا اللہ اس کا اجر دے گا۔

□□.....❁.....□□

کتاب تبصرہ

عشق دے پندھ اڑانگے

اقبال کا مصنف فدا شاہین

مجید احمد جائی

بیسویں اور اکیسویں صدی کے اردو اور فارسی شعراء میں اقبال کا مرتبہ بلند اور بے حد بلند ہے۔ تخیل کی عظمت، نظر کی وسعت، فکر کی رفعت، ترجمانی حقیقت، زور اثر اور صاحب درس و پیغام ہونے کے اعتبار سے کوئی دوسرا شاعر آپ کا مثیل و ہمسر نہیں ہے۔ اب سے ایک صدی قبل غالب نے شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا تھا مگر غالب کی رفعت نظر ان کو ''مشکلپسند'' کی حدود سے آگے نہ بڑھا سکی۔ غالب کو کبھی کبھی ''رجائیت'' کے نور کی شعاعیں نظر آتی ہیں۔ مگر ان پر جو ''قنوطیت'' طاری ہے وہ انہیں پھر طلسم تشکک میں گرفتار کر دیتی ہے۔ حالی بے شک پیغمبر سخن تھے جنہوں نے قوم کے دل و دماغ میں ہیجان و انقلاب پیدا کر دیا۔ حالی باوجود یہ کہ وہ ایک پیغمبر تھے پھر بھی حال کے تمام امراض کا علاج نہ بتا سکے۔

اقبال کا دل بھی انہی جذبات سے لبریز تھا انہوں نے بھی اصلاح کا علم اٹھایا اور یورپ زدگی کے خطرناک عواقب سے قوم و ملک کو باخبر کر کے مغربی رو میں بہہ جانے سے روکنا چاہا مگر یہ ان کے بس کا نہ تھا۔

اقبال ''شاعر ماضی، شاعر حال اور شاعر مستقبل'' تینوں حیثیتوں کے جامع ہیں۔ انہوں نے وہ کام بھی کیا جو حالی نے کیا تھا۔ وہ مقصد بھی ادا کیا جو اکبر پورا کرنا چاہتے تھے۔ اقبال بلاشبہ اس عصر کے واحد ''مصلح اور مجدد'' تھے۔ وہ غزالی دوراں بھی تھے۔ عطار و سنائی بھی، سعدی و رومی بھی، حالی و اکبر بھی اور میر و غالب بھی۔ تصوف و حکمت، عشق و موعظت، اثر و رجائیت اور اصلاح و مجددیت'' کا یہ اجتماع دنیائے ادب کے اس ''خاتم الشعراء'' ہی کے لیے مخصوص رکھا گیا تھا۔

یہ اقتباس فدا شاہین بھٹی کی کتاب ''علامہ محمد اقبال'' سے لیا گیا ہے۔ فدا شاہین بھٹی میرے خط کا قلم کار ہے۔ کہانی کے ساتھ ساتھ بہترین شاعری بھی کرتے ہیں۔ ملنسار شخصیت اور میٹھے لہجے والے ہیں۔ اپنی مٹی سے محبت کرنے والے

فدا شاہین بھٹی سرائیکی اور اردو زبان کے ایوارڈ یافتہ شاعر اور ادیب ہیں۔

''عشق دے پندھ اڑانگے'' سرائیکی ناول ہے جس میں فدا شاہین بھٹی نے سرائیکی خطے کا کلچر اور تہذیب کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کا اظہار اپنے کرداروں سے کروایا ہے۔ وڈیروں، جاگیرداروں کے ظلم ستم کا پردہ چاک کیا ہے ''عشق دے پندھ اڑانگے'' اپنی نوعیت کا بہترین ناول ہے۔ اسی طرح ''نیناں دے تیر'' جس میں غزل، قطعے اور اشعار ہیں۔ اس میں بھی فدا شاہین بھٹی اپنے خطے اور مادری زبان سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

فدا شاہین بھٹی کے قلم سے لکھی گئی بچوں کی کہانیوں پر مشتمل خوبصورت کتاب ''پرستان کی پری'' بھی ایک معیاری اور شاندار کتاب ہے۔ فدا شاہین بھٹی بچوں کے ادب کے لیے عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ''پرستان کی پری'' بچوں میں ہمت، جذبہ، اُمنگیں پیدا کرتی ہے۔ پرستان کی سیر کے ساتھ ساتھ بچے اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی درس حاصل کرتے ہیں۔ بچوں کے ذہنوں کی بہترین انداز میں آبیاری کرتی ہے۔

''علامہ محمد اقبال'' کتاب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ جس میں علامہ محمد اقبال کے کردار و شخصیت اور شاعری کی باتیں کی گئی ہیں۔ 124 صفحات پر مشتمل یہ کتاب نیر پبلشرز نے لاہور سے شائع کی ہے۔ جس کی قیمت 350 روپے ہے جو زیادہ نہیں تو مناسب بھی نہیں ہے۔ انتساب کچھ یوں دیا گیا ہے ''پیارے بچوں کے نام علامہ محمد اقبال کا پیغام، میل جول، دوستی اور خلوص و ہمدردی کو اپناؤ۔ اپنے اخلاق و کردار کو محبت کی روشنی سے جگمگاتے رہو۔''

''علامہ محمد اقبال'' کتاب میں عنوانات کے ذریعے علامہ محمد اقبال کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسے حیات اقبال ایک نظر میں تاریخ وار معلومات دی گئی ہیں۔ آئیں اقبال کو سمجھیں، جس میں مشکل الفاظ کے معانی اور اشعار کی تشریح کی گئی ہے۔ اسی طرح قرآن کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ دُنیا کے مفکرین کی اقبال کے بارے رائے بھی دی گئی ہے۔

''فدا شاہین بھٹی'' علامہ محمد اقبال سے متاثر ہیں اس لیے اپنے نام کے ساتھ ''شاہین'' ملایا ہے۔ علامہ محمد اقبال کا ملازموں کے ساتھ سلوک، مطالعہ اور گھریلو معاملات، سحر خیزی اور نجی معمولات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فدا شاہین بھٹی اپنے تاثرات کچھ یوں لکھتے ہیں ''اے علامہ محمد اقبال! ہم آپ کے پاکستان اور قائداعظم کی اس خوبصورت ریاست کی قدر نہیں کر پا رہے۔ ہم اپنے بزرگوں کی قربانیوں اور آپ کے پاکستان کی خاطر بہائے جانے والے خون کو بھول گئے ہیں۔ دولت کی حرص نے ہمیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا ہے۔ اپنے اپنوں کو لوٹ رہے ہیں۔ دہشت گردی قتل و غارت، لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ نشے کی لعنت ہمارے بچوں میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ شراب نوشی، چرس فروش جو ہمارے اپنے ہی ہیں نئی نسل کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ عریاں انڈین فلموں اور گانوں کی ہماری نسل دلدادہ ہوتی جا رہی ہے۔ ڈش، کیبل نے رہی سہی کسر نکال کے رکھ دی ہے۔ ہم شرمندہ ہیں۔ ہم شرمندہ ہیں۔

''علامہ محمد اقبال کا پیارے سرور کائنات ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق تھا۔ علامہ محمد اقبال کی شخصیت کے کئی پہلو ہمارے سامنے ہیں۔ آپ ایک شاعر تھے، فاضل تھے، مفکر تھے، مدبر تھے۔ ایک عظیم قومی رہنما تھے۔ ایک نامور فلسفی تھے۔ راز دان مشرق تھا۔ مزاج شناس مغرب تھے۔ رمز شناس فطرت تھے مگر سب سے بڑھ کر عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہی ایک پُروقار، پُربہار، دلنواز، جہاں ساز اور سماں ساز پہلو تھا جس سے اقبال کے شخصیت کے تعمیر نو ہوئی اور پھر اقبال بلند اقبال بن گئے۔

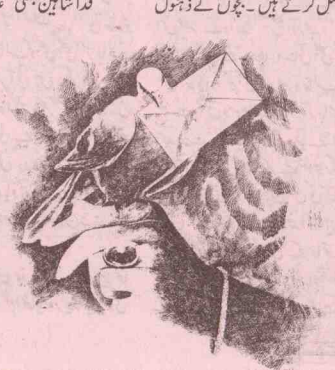

اقوال زریں

☆ کامیابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی میں ہے۔

☆ لوگوں پر ظلم نہ کرنا بھی سخاوت ہے۔

☆ جسے ہار جانے کا خوف ہو وہ ضرور ہارے گا۔

☆ انسان اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں قابلیت پر نہیں۔

☆ انسان کی اصلیت ٹیسٹ میں سامنے آتی ہے۔

☆ پرخلوص، سچا شخص کبھی اپنی سچائی اور خلوص کی قسمیں نہیں کھاتا۔

☆ دل بجھ جائے تو شہر تمنا کے چراغوں سے روشنی حاصل نہیں ہوتی۔

☆ اعتبار عمل میں ہوتا ہے لفظوں میں نہیں۔

☆ ایک لمحے کی نظرت سال ہا سال کی محبت بھلا دیتی ہے۔

☆ انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں نظر آتی ہے۔

☆ رات کی تنہائی میں سُلگنے والے آنسو زمانے بدلتے ہیں اور طوفانوں کا رخ موڑتے ہیں۔

فدا شاہین بھٹی ''علامہ محمد اقبال'' کتاب میں علامہ محمد اقبال کے بارے میں ہر طرح کے عنوان کے ساتھ احاطہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن ہر مضمون میں پیدائش اور وفات کا ذکر گراں گزرتا ہے۔ مضامین کے ساتھ حوالے جاتے نہیں ہیں اور کمپوزنگ کی خال خال غلطیاں بھی طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔

فدا شاہین بھٹی کی چاروں کتابوں کو دیکھا جائے تو آپ بچوں کی کردار سازی میں اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ وطن سے محبت اور اپنے ہیروز سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ فدا شاہین بھٹی کا بچوں کی کردار سازی میں کام ادب کی دُنیا میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

□□.....❁.....□□

میرا رب وارث

زندگی میں کچھ بھی چاہیے ہو بندہ اگر سچے دل سے
اپنے رب کو پکارے تو وہ سب حاصل ہو جاتا ہے.....

منزہ سہام

میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو گزرے تو 18 سال ہو چکے ہیں مگر اس جگہ سے گزرتے ہوئے مجھے وہ دن ایسے یاد آتا ہے جیسے کل کا ہی واقعہ ہو۔ یہ قصہ سنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ اللہ سے رابطے کے لیے آپ زندگی بھر عبادت ہی کریں۔ تنہائی کو اوڑھنا بچھونا بنالیں دنیا ترک کردیں بلکہ اس واقعے نے میرا ایمان اس بات پر اور پختہ کردیا کہ اللہ کو سچے دل سے اگر پکارا جائے تو وہ فوراً سنتا ہے اور روحانیت بھی تو یہی ہے کہ آپ کا اللہ سے مضبوط تعلق ہو۔

آپ کی نظر عام انسان کی نظر سے مختلف ہو..... آنے والی خوشیوں اور مصائب کی آگاہی ہو۔ اللہ سے رابطہ لوگوں کو براہ راست محسوس ہو یہی روحانیت ہے تو آیئے میں آپ کو ثابت کروں کہ اللہ سے رابطے کے لیے صرف اس کو سچے دل سے پکارنا ضروری ہے۔ پھر وہ ہوتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

آپ میں سے بیشتر لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ میرے والد کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے وہ وقت ہم سب پر بہت کٹھن تھا ان کی تکلیف کے سامنے سب بے بس تھے اور سوائے دعا کے کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ روز بروز وہ کمزور ہو رہے تھے۔ پھر وہ تکلیف دہ دن بھی آیا جب وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابو کے انتقال کے بعد میرا بس ایک ہی کام تھا اور وہ تھا رونا.....

میں بچوں سے لاپرواہ ہو چکی تھی کام میں دل نہیں لگتا تھا ایک عجیب سی بے چینی تھی جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ حالانکہ میں ان کے ایصال ثواب کے لیے وہ سب کچھ کرتی تھی جو ایک بیٹی ہونے کے ناطے میرا فرض تھا مگر اس بے کلی کا کوئی علاج نہ تھا آنکھیں تھیں کہ بس برستی ہی رہتی تھیں۔ مجھے خود اس بات کا احساس تھا کہ میری اور بھی ذمہ داریاں ہیں بلکہ ابو کے بعد زیادہ ذمہ داریاں تھیں جو میری منتظر تھیں مگر سب کچھ سمجھنے کے بعد بھی میں بے بس تھی۔

زبان پر یہ شکوہ تو کبھی نہیں آیا کہ اللہ میاں آپ نے میرے ابو کو کیوں مجھ سے دور کردیا مگر میں اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہوں کہ دل میں یہ بات بارہا آئی کہ کچھ دن اور رہ جاتے فلاں کے والد تو اتنے ضعیف ہیں وہ تو ابھی تک زندہ ہیں وغیرہ وغیرہ..... یہ الگ بات ہے کہ بعد میں میں اپنی سوچ پر خود بہت شرمندہ رہی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان بڑا کمزور ہے غم کی حالت میں سب کچھ بھول جاتا ہے یاد رہتا ہے تو بس شکوہ شکایت ہم میں سے اکثر لوگ کہتے تو ہیں کہ اللہ مالک ہے مگر شاید دل سے نہیں مانتے ورنہ دکھ اور پریشانیوں میں کسی انسان کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں اور اللہ سے بھی شکوہ نہ کریں بلکہ کہیں کہ جو اللہ کی مرضی.....

ابو کے انتقال کو 10 واں دن تھا اور مجھے روتے بلکتے بھی 9 دن گزر چکے تھے پھر کسی بڑے نے سمجھایا اور کہا۔

''تم والد کی قبر پر جاؤ اور وہاں جا کر سورۃ یٰسین پڑھو تمہیں صبر آجائے گا۔'' بذات خود میں قبرستان جانے کی قائل نہیں ہوں مگر اس وقت میں اپنی حالت سے خود بہت پریشان تھی اس لیے مشورے پر عمل کیا اور قبرستان چلی گئی۔

جیسے جیسے میرے قدم ان کی قبر کی طرف بڑھ رہے تھے میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر رواں تھا ابو کے لاڈلے ڈرائیور شیر گل کی سربراہی میں' میں اُن کی قبر تک پہنچی میرے ساتھ ابو کے دونوں شکرے دانیال اور زین بھی تھے وہ تو بچے تھے یہ سن کر نانا ابو سے ملنے جا رہے ہیں بہت خوش تھے۔

قبرستان جا کر بھی پوچھتے رہے نانا ابو کہاں ہیں میرے بتانے پر کہ بیٹے یہ پکی قبر ہی اب تمہارے نانا ابو ہیں دونوں پہلے حیران ہوئے پھر مطمئن ہو کر کھیلنے لگے کبھی قبر پر پانی ڈالتے کبھی آس پاس کی قبروں سے پتے اور پھول اٹھا کر لا کر ڈالتے۔ بچے تھے نا بہل گئے۔

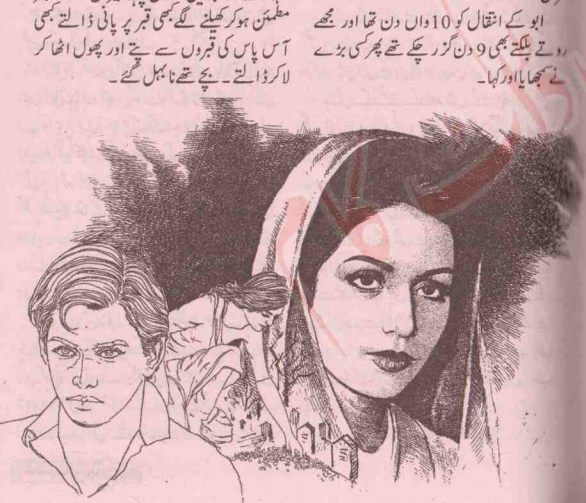

میں بہت دیر بیٹھی اس کچی قبر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور بچے مجھے بلک بلک کر روتا دیکھ کر پریشان ہوتے رہے پھر شیر گل ان کی انگلی تھام کر انہیں ذرا فاصلے پر لے گئے۔ میں نے سورۃ یٰسین پڑھی۔ قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا اور تازہ پھولوں کی پتیاں ڈالیں اب دل کو جیسے کچھ قرار سا آ گیا تھا۔ وقت رخصت صرف یہ شکوہ زبان سے پھسلا۔

''ہائے اللہ میاں ابو کو تو گرمی بہت لگتی تھی وہ یہاں کیسے رہیں گے۔'' کراچی کے رہنے والے یہ بات جانتے ہیں کہ اگست کے مہینے میں خوب گرمی پڑتی ہے اور اس سال 2002ء میں تو بہت غضب کی گرمی پڑی تھی۔ ابو کیونکہ بلند فشار خون میں مبتلا رہتے تھے اس لیے سردیوں میں بھی ان کے کمرے کا ایئر کنڈیشن چلتا رہتا تھا چاہے کمرہ آفس کا ہو یا گھر کا ہم لوگ مذاق میں ابو کے کمرے کو سائبیریا کہتے تھے۔ اب جو اپنے پیارے ابو کو خاک اوڑھے لیٹے دیکھا تو دل پھٹ گیا۔

برستی آنکھوں انہیں خدا حافظ کہا جلد آنے کا وعدہ بھی کیا اور بچوں کو لے کر گاڑی میں آ بیٹھی اب دل پر ایک ناچ کہ لگ چکا تھا کہ اس گرمی میں ابو کتنی تکلیف میں ہوں گے۔ ان کی قبر کی کچی مٹی پر ہاتھ پھیر کر جو سکون ملا تھا وہ اب اس غم کی نظر ہو چکا تھا کہ ابو کو تو گرمی برداشت ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات تو بہت بعد میں سمجھ آئی کہ جانے والے دنیاوی ضرورتوں سے بہت دور جا چکے ہوتے ہیں۔

خیر اس ساری تمہید کا مقصد صرف اپنے پڑھنے والوں کو یہ یاد کرانا ہے کہ سچے دل سے رب کو پکارنے والے کبھی مایوس نہیں ہوتے گاڑی شاہراہ فیصل پر کنٹونمنٹ بورڈ کے قریب تھی کہ اچانک سیاہ بادل اٹھے اور ایسے برسے کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ بارش اتنی شدید تھی کہ گاڑی چلانا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر آسمان کی جانب دیکھا جہاں سے مینہ ایسے برس رہا تھا کہ شاید کبھی رُکے گا ہی نہیں اور بس اُس لمحے مجھے اللہ میاں سے عشق ہو گیا وہ میرے اللہ میاں ہو گئے۔ میرا مالک جو اپنے بندوں کی دل سے نکلی ہر دعا کو قبولیت عطا کرتا ہے جو اپنے بندوں کے زخموں پر پھاہے رکھتا ہے۔ میرے رب نے مجھے بتایا کہ وہ میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

اُس دن میں نے جاگتی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھا جو کتابوں میں پڑھا تھا بڑوں سے سنا تھا۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے بے شک وہ نیتوں کا حال جانتا ہے دوسرے اس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں اور تیسرے یہ کہ وہ 70 ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

3 دن لگاتار برسنے والی اس بارش نے میری عقل پر پڑا پردہ ہٹا دیا منظر بالکل صاف اور واضح ہو گیا۔ میں اس کی بندی اور وہ میرا وارث ہو گیا۔

بارش کے تھمنے کے بعد میں' ناصر بھائی' شیر گل اور نیاز (آفس بوائے) ہم ایک بار پھر قبرستان گئے قبر کیونکہ کچی تھی لہٰذا گورکن سے درست کروائی بہرحال بارش سے بہت نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس دن کے بعد سے میری کیفیت بالکل بدل گئی پھر میں برسا برس چھٹی والے دن قبرستان جاتی رہی اب یہ ذمہ داری ان کے نواسے نبھا رہے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ جتنا پیار مجھے اپنے والد سے تھا اس سے کئی گنا زیادہ پیار میرا رب اپنے ہر بندے سے کرتا ہے بس اب میں اس کی بندی ہوں اور وہ میرا وارث باقی سب بیکار.....

اوکاڑہ سے ارسال کردہ ایسی تحریر جو آپ کو برسوں یاد رہے گی

صاحبِ کرامات

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پیر صاحب سے دونوں کا تذکرہ آج ضرور کروں گا۔ کالج سے واپسی پر میں نے کھانا میز پر رکھتے پیر صاحب کو مخاطب کیا۔ ''سرکار گھاسی رام کے کارخانہ کے کوارٹروں میں.....

جاوید راہی

میرے خاندان کی دو پشتیں گیلانی صاحب کے ڈیرے پر چاکری کرتی آ رہی تھیں۔ میرے والد صاحب پیر اختر گیلانی سرکار کے دربار پر خادم کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے آ رہے تھے۔ میں 15 سال کی عمر میں گیکو پیر جو گیلانی سرکار کے چھوٹے صاحبزادے تھے اور سنگھرہ شریف سے بیس پچیس کلومیٹر کی دوری پر کالج میں پڑھ رہے تھے ان کے ساتھ تھا۔ پیر ناصر گیلانی جو پیر صاحب کی رحلت کے بعد گدی نشین بنے ہزاروں مرید وں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحت کا سامان تھے' مجھے ان کی خدمت کرتے فخر ہوتا تھا۔ انہوں نے خود حکم دیا کہ'' تم گیکو پیر صاحب کے پاس شہر چلے جاؤ۔''

''جی سرکار جو حکم'' میں نے نظریں نیچی کیے سر ہلا دیا۔

میرے والد صاحب نے مجھے چلتے ہوئے کہا کہ ''بیٹا سرکار کی چاکری کرتے بھی کوئی عذر مت کرنا۔'' اور مجھے دعاؤں کی بوچھاڑ میں ڈیرہ کے بڑے خادم انور عرف انو کے ساتھ سنگھرہ سے شہر روانہ کر دیا جو گیکو شاہ کے لیے گھر سے خرچہ اور راشن دینے جیپ پر جا رہا تھا۔ انو نے مجھے سامان کے ساتھ جیپ کی پچھلی سیٹ کے درمیان فرش پر بیٹھا دیا کیونکہ ہم مرید ان پیر صاحبان کی سیٹوں پر بیٹھنا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ گیکو سرکار اخلاق کے دھنی اور بڑے ہی دھیمے لہجے کے مالک تھے۔ اس گھرانے کا شجرہ بالا پیر گیلانی سرکار سے ملتا تھا۔ پورے ملک میں بڑے بڑے سرمایہ دار اور اعلیٰ عہدوں پر فائز آفیسران کے گھر کی چوکھٹ پر حاضری دیتے تھے۔ میں نے مڈل سنگھرہ شریف میں ہی کیا تھا، آگے بڑھتا جا رہا تھا مگر بڑے پیر صاحب نے یہ کہہ کر منع فرما دیا کہ گھر سے باہر کے کام میں ہاتھ بٹانا پڑھائی سے ضروری تھا۔ اس لیے میں نے اس حکم کی تعمیل کی اور مال ڈنگر سے لے کر آنے والے مہمانوں کی خدمت تک کو اپنا شعار بنا لیا۔ شہر میں گیکو شاہ صاحب جس ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے وہ بڑے لوگوں کی کالونی کہلاتا تھا۔ پیر صاحب بڑی شفقت

سے پیش آئے مجھے اپنی رہائش گاہ کے پچھلے حصے میں بنے کوارٹر میں جگہ دیتے فرمایا ”تمہارے ذمہ صفائی اور گھر کی نگرانی کرنا وغیرہ ہوگا اور کھانا بنانا جو کہ تمہیں آتا ہے سارا کھانے پینے کا سامان کچن میں ملے گا۔ گوشت فریزر میں باقی موجود ہے باقی جو کرنے کا کام ہوگا وہ اپنی عقل سے بغیر پوچھے کرلیا کرنا۔“

”جی سرکار۔“ میں نے ادب سے جواب دیا۔ دو چار روز لگے مجھے سب سمجھنے اور آس پاس کی دکانوں سے سودا سلف لانا اور ایسا ہی کچھ اور جس کی ضرورت پڑتی۔ پیر صاحب ناشتہ کرکے اپنے کالج چلے جاتے۔ پیچھے صفائی ستھرائی سے فارغ ہوکر کھانا بنانا اور باقی کا وقت ٹی وی پر پروگرام دیکھتے گزر جاتا۔ جب وہ کالج سے واپس آتے تو میں روٹیاں بنا کر ان کو کھانا دیتا اور باہر دروازے کے پاس آجاتا تاکہ ان کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو میں مہیا کردوں۔ مجھے شہر آئے چار ماہ بیت چکے تھے، اس دوران ایک آدھ بار کیکو شاہ ستگھرہ آئے اور میں بھی اپنے گھر والوں سے ملنے آگیا۔ جس گھر میں پیر صاحب رہ رہے تھے اس کی چھتیں خراب تھیں، ایک دو پراپرٹی ڈیلروں سے مکان کی بابت معاملہ چل رہا تھا۔

ایک گھر دکھانے کے لیے پراپرٹی ڈیلر کا کارندہ آگیا۔ پیر صاحب گھر پر ہی تھے، وہ مجھے بھی ساتھ لے آئے۔ گھاسی رام کے کارخانہ سے ملحقہ نئی کالونی آباد ہوئی تھی۔ ابھی زیادہ گھما پھری نہیں تھی مگر صاف ستھرا ماحول تھا۔ مکان پیر صاحب کو پسند آگیا، کرایہ وغیرہ اور سارا معاملہ طے ہونے پر گاؤں سے دوسرے مریدوں کو بلوا کر پیر صاحب نے گھر کا سارا سامان نئے گھر میں شفٹ کروالیا۔ ادھر تو سب کچھ قریب سے مل جاتا تھا مگر اس کالونی میں کافی فاصلے پر ایک دو اسٹور تھے۔ گھاسی رام کا کارخانہ تو نام کی حد تک کارخانہ تھا بڑے بڑے گودام اور بند پڑی مشینری ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی یا کارخانہ کے آخری حصہ میں چند خستہ حال کوارٹر اور باہر گیٹ کے اندر ایک کونے میں پرانی طرز کی مٹی نما عمارت کے نیچے اوپر جانے کے لیے پرانی اینٹوں سے بنی سیڑھیاں نظر آئیں۔ جب سے ہم اس کالونی میں آباد ہوئے تھے کبھی کبھار کارخانے کا چوکیدار اوپر والی مٹی نما بالکونی میں حقہ کی نے منہ میں لیے کارخانہ کے گیٹ کی طرف دیکھتا گزر جاتا کیونکہ گیٹ کے ساتھ والا چھوٹا دروازہ ادھ کھلا ہی رہتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے عجیب کشش سی محسوس ہوتی۔

پیر صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں فارغ تھا اس لیے باہر سے تالا لگا کر میں کالونی کی چھوٹی سی مارکیٹ میں گھر کی چند چیزیں لینے کی غرض سے چل پڑا۔ جب گھاسی رام کے کارخانہ کے قریب سے گزرا تو میری نظر دو نوجوان لڑکیوں پر پڑی جو ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگ پکڑے کوارٹروں کی طرف جارہی تھیں۔ دونوں نے میری طرف گھوم کر دیکھا اور مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کوارٹروں میں لوگ آباد ہیں۔ اب جب بھی میں ادھر سے گزرتا ایک بار ضرور کونے والے کوارٹروں کی طرف دیکھتا مگر مایوسی ہوتی، وہ دونوں پھر نظر نہ آئیں۔ پیر صاحب نے پراٹھا چھوڑ کر بریڈ انڈے کا ناشتہ شروع کردیا تھا۔ صبح کے لیے انڈے پڑے تھے مگر بریڈ ختم تھی، حالانکہ مجھے یاد تھا کہ پیر صاحب کے دوست آئے ہوئے تھے ان کے کھانے کے انتظام میں سارا وقت گزر گیا۔ برتن سمیٹتے میری نظر خالی ریک کی طرف گئی تو بریڈ نہ پاکر میں پریشان ہوگیا۔ پیر صاحب کو نا کریں صبح ناشتہ کے لیے بریڈ لینے گھر سے نکل آیا۔

کارخانہ کے باہر دیوار پر لگے بلب کی روشنی میں میری نظر چھوٹے گیٹ کی جانب گئی۔ حسب معمول اندر ماسوائے نیم تاریکی کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ بریڈ لے کر واپس آرہا تھا کہ وہی دونوں لڑکیاں سامنے سے آتیں نظر آئیں۔ شاید میں خاموشی سے نظریں جھکائے گزر جاتا کہ میرے کانوں میں مترنم آواز آئی۔ ”بات سنیں۔“ میں رک گیا۔ ”آپ کالونی میں رہتے ہو نا؟“

”ہاں جی۔“ میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”ذرا اسٹور تک جائیں گے کچھ چیزیں لانی ہیں۔“

”جی چلا جاتا ہوں۔ میں نے ان کا جائزہ لیتے جواب دیا۔ ان میں سے ایک نے ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے دو چار چیزیں لانے کا کہا اور خود دونوں ایک سائیڈ پر جا کھڑی ہوئیں۔

میں واپس اسٹور کی جانب چل پڑا۔ ان کا بتایا سامان لے کر دو کپ آکس کریم کے بھی اپنی جیب سے پیک کروائے اور ان کی طرف چل پڑا۔ سامان اور بقایا ان کے سپرد کرتے میں نے دوسرا شاپنگ بیگ ان کی طرف بڑھایا تو دونوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ”یہ تکلف کیوں کیا آپ نے؟“

”میں اپنی خوشی سے لایا ہوں۔“

دونوں نے اپنا اپنا کپ نکال کر لکڑی کے چمچ سے ایک ایک بھرا اور میری طرف بڑھایا۔ ”یہ ہماری دوستی کے نام۔“ میں ان کی بے تکلفی پر ٹپٹا گیا۔ پہلے ایک نے پھر دوسری نے آکس کریم کا چمچ میرے منہ میں ڈال دیا۔ پھر وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے ساتھ باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے اپنا نام ثریا اور دوسری نے شنو بتایا۔ میں نے بھی اپنا مختصر تعارف کرواتے ہوئے پیر صاحب کے ساتھ بطور خادم رہنے کا بھی بتا دیا۔

گیٹ کے قریب آ کر ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ وہ دونوں سامان والے شاپنگ بیگ پکڑے نیم وا چھوٹے گیٹ کے اندر داخل ہو گئیں اور میں آگے بڑھ گیا۔ رہ رہ کر میرے دل میں دونوں کا لطیف سا احساس جاگ اٹھا تھا۔

گھر پہنچ کر میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے اپنی قسمت پر بھی نازاں تھا جو مجھ پر مہربان ہوئی تھی۔ شنو کی خوابناک آنکھوں نے مجھ پر عجیب طرح کی کیفیت عیاں کی تھی۔ اس کے برعکس ثریا ذرا شرمیلی اور کم گو تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر دکھائی دیتی تھیں۔ اچانک گاؤں سے بڑے پیر صاحب کی طبیعت خراب ہونے کا پیغام آیا تو گیگو شاہ جی ان کی خیریت جاننے چھٹی لے کر گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس کالونی میں سکیورٹی کا خاصا معقول انتظام تھا۔ اس لیے مکان کو باہر سے تالے لگا کر ہم بے فکری سے گاؤں کے لیے نکل پڑے۔ ویگن کنڈکٹر نے پیر صاحب کے لیے فرنٹ والی سیٹ اور مجھے درمیان میں سواری کے ساتھ بٹھا دیا۔ دو تین دن کے بعد پیر صاحب کی واپسی ہوئی۔ گھر کی صفائی کے دوران جب اوپر والے حصہ میں آیا تو مجھے زوردار جھٹکا لگا اور پرمیز پر وہی شاپنگ بیگ اور آئس کریم کے کپ پڑے تھے جو میں نے لڑکیوں کو دیے تھے۔ دونوں کپوں میں موجود آئس کریم پگھل کر گاڑھے لیس دار مادے میں تبدیل ہو کر اکٹھی پڑی تھی۔ جب سے ہم اس مکان میں شفٹ ہوئے تھے پیر صاحب کبھی کبھار اوپر والے کمرے کے باہر برآمدے میں پڑی میز کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے کاج کا کام کرتے تھے۔ اس دوران میں ان کے لیے چائے وغیرہ بنا کر رکھ جاتا مگر آئس کریم نہ تو کبھی آئی اور نہ ہی پیر صاحب نے کبھی منگوائی۔

میں صفائی کے دوران اچھی طرح جھاڑ پونچھ کرتا، میں نے غور کیا تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی دونوں کپ اور لکڑی کے چمچ تھے، کپوں کے اندر پگھلی آئس کریم کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کپوں میں سے ایک ایک بائٹ لی گئی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر سرایت کر گئی۔ اگر یہ دونوں کپ وہی تھے جو میں نے گاؤں جانے سے پیشتر ان کو اپنی جیب سے خرید کر دیئے تھے تو یہ یہاں کیسے آ گئے۔ اگر میری غیر موجودگی میں پیر صاحب کا کوئی دوست ان کو ملنے آیا تھا تو کم از کم مجھے تو پتہ ہوتا مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے دونوں کپ اور ان میں موجود لکڑی کے چمچ شاپنگ بیگ میں ڈال کر کوڑے والی ٹوکری میں پھینک کر کمرہ اندر سے صاف کیا اور تذبذب کے عالم میں سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گیا۔ جب تک پیر صاحب واپس نہ آ گئے میں پریشانی میں الجھا رہا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں اس بات کا تذکرہ ان سے کروں۔ پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ کہیں وہ میری اس بات پر ناراض نہ ہو جائیں کہ تمہیں کس نے اجازت دی کہ تم پرائی لڑکیوں کو یوں دیدہ دلیری سے آئس کریم کی دعوت دیتے پھرو۔ اسی ڈر سے میں خاموش رہا۔ ایک طرح کا ڈر میرے دل میں جڑ پکڑ گیا کہ وہ دونوں گھر میں کس طرح داخل ہو کر اوپر چڑھ کر آئس کریم کے دونوں کپ رکھ کر واپس چلی گئی تھیں۔

ایک طرف پیر صاحب کا خوف دوسری

جانب پراسراریت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے پر چارپائی پر بے سود آ پڑا جب تک نیند نہ آ گئی میں اس حیرت ناک معاملہ پر سوچتا رہا۔

صبح میں جلدی اٹھنے کا عادی تھا کیونکہ پیر صاحب نے کاج کے لیے نکلنا ہوتا اس لیے ناشتہ وغیرہ ان کے کپڑے تیار کرنا، جوتا پالش کرنا وغیرہ حسب معمول سارے کام نپٹا کر میں نے گھر کی صفائی کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ کر باہر کا تالا لگا کر گھاسی رام کے کارخانہ والی سڑک پر نکل آیا۔

آمد و رفت ابھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ چھوٹے گیٹ پر رُک کر میں نے اندر جھانکا، چاروں جانب سناٹے کا راج تھا، میری نظریں سرونٹ کوارٹروں کی جانب تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں چھوٹا گیٹ عبور کر کے ادھر اُدھر دیکھتا پتلے قدموں سے چلتا ہوا چھوٹی اینٹوں سے بنے ٹوٹے پھوٹے راستے پر کوارٹروں کی جانب آگے بڑھنے لگا۔ کوارٹروں کی تعداد آخری کونے تک پھیلی ہوئی تھی۔ میری نظریں ہر طرف سے ہاپوں ہو کر پیپل کے پرانے درخت پر آ کر رُک گئیں جو کوارٹروں کے آخری حصہ میں کسی چوکیدار کی طرح سر اٹھائے عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

میں اسی سوچ میں تھا کہ کسی کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹا کر ان دونوں کے بارے میں دریافت کروں مگر میری ہمت نہ پڑی اور نہ ہی مجھے کوئی آس پاس دکھائی دیا۔ اچانک ایک چھوٹا سا لڑکا نہ جانے کس طرف سے نکل کر پیپل کے بوڑھے درخت کی طرف بھاگتا ہوا چلا گیا۔ میں سمجھا کہ کسی کوارٹر کی طرف گیا ہے ابھی میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا تھا کہ میرے عقب سے آنے والی نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''کس سے ملنا ہے؟'' میں نے پلٹ کر دیکھا، ایک خاتون جو درمیانی عمر کی دکھائی پڑتی تھی، مجھ سے مخاطب تھی۔

''جی شنو بی بی کا کوارٹر کونسا ہے؟'' اس نے کسی بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور ہاتھ کے اشارے سے پیچھے کی طرف ایک کوارٹر کی نشاندہی کی اور خود جس کوارٹر کے آگے کھڑی تھی اس کے اندر داخل ہو گئی۔ میں اس کے بتائے کوارٹر کی جانب چل پڑا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے چند لمحے خود کو پُرسکون کیا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے دی۔ کنڈی جو پرانے زمانے کی خاصی موٹی اور مضبوط بنی ہوئی تھی لکڑی پر لگتے کافی گونج چھوڑ گئی۔ چند پل گزرے کہ اندر سے مدھم سی آواز آئی۔ ''کون؟'' میں نے آواز پہچان لی وہ ثریا تھی۔ ''میں ہوں۔'' میری آواز پر اس نے اندر سے دروازے کی کنڈی گراتے ایک پٹ کھولا اور مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ پھر اس نے پیچھے منہ کرتے ہوئے شنو کو پکارا۔ شنو کی آواز آئی۔ ''آ رہی ہوں۔''

''اندر آ جاؤ۔'' ثریا نے ایک طرف ہوتے مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں بے دھڑک کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ کوارٹر خاصا بڑا تھا اور اس میں رہنے والوں کے معیار کی گواہی دے رہا تھا کہ یہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ جس کمرہ میں مجھے لا کر بٹھایا گیا وہ خاصا سجا سجایا تھا۔ شنو نے کمرے میں آتے ہی زندگی سے بھرپور قہقہہ لگاتے مجھ سے کہا ''ہم تمہاری لائی آئس کریم اوپر رکھ آئے تھے۔'' اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ثریا سے مخاطب

ہوئی۔ ''جاؤ کچھ کھانے پینے کے لیے لے آؤ۔''

''میں کیوں کھاؤں گا آپ کے گھر سے تم تو میری لائی آئس کریم بھی واپس کرآئی تھی۔''

''ارے نہیں یہ بات سب گھر والوں کو اچھی نہیں لگی تھی اور الٹے پاؤں ہمیں تمہارے گھر آنا پڑا۔ دروازہ کھلا پا کر ہم نے اندر جھانکا تو برآمدے میں کوئی تھا اور نہ ہی تم دکھائی دیتے۔ ہم نے آوازیں بھی دیں تو کوئی جواب نہ پاکر ہم دونوں گھر میں داخل ہوگئیں اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئیں۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ہم نے دونوں کپ رکھے اور واپس گھر آگئیں۔''

''مگر میں تو گھر پر ہی تھا ہوسکتا ہے میں اندر کام میں لگا آپ کی آواز نہ سن پایا ہوں گا مگر آپ اکیلی نہیں؟''

ہاں ہاں لگ بھگ گئے ہوئے ہیں۔'' ثریا ٹرے میں چائے وغیرہ لیے اندر داخل ہوئی اور ٹرے رکھتے سامنے بیٹھ گئی۔ چائے کے دوران کوئی خاص باتیں نہ ہوئیں بس ادھر اُدھر کے قصے۔ پھر میں ان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتا اجازت لے کر واپس آ گیا۔ اس دوران دو تین بار میں نے ان کے ہاں اور ایک بار وہ بھی پیر صاحب کی غیر موجودگی میں چکر لگا گئیں۔ شنو مجھ میں خاصی دلچسپی لینے لگی تھی اور میرے دل میں بھی اس کے لیے جگہ بن چکی تھی مگر میں ڈرتا ہوا کوئی اظہار نہ کر پایا۔ ثریا ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر تھی، مطلب کی بات کرتی ورنہ ہم دونوں کی ہی سنتی رہتی۔

کالونی کے واحد اسٹور پر میں کچھ سامان لینے آیا تو وہ دونوں ادھر مل گئیں۔ بڑی اپنائیت سے پیش آئیں۔ میں نے لڑکے کو لکھے سامان کی چٹ پکڑائی اور ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ دونوں چھوٹی چھوٹی چیزیں ہاتھوں میں جمع کرتی ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں اور میں ان کے ساتھ ساتھ باتیں کرتا چل رہا تھا۔ کاؤنٹر پر آ کر میں نے اپنا سامان اٹھایا بل چکا کر دونوں کی طرف پلٹا تو ان کو گھر آنے کی دعوت دی۔ شنو نے جواباً کہا ''اپنے پیر صاحب سے تو ملواؤ۔''

''ٹھیک ہے میں آج بات کروں گا ان سے۔'' میں اپنا سامان لے کر باہر جانے لگا تو کاؤنٹر پر موجود لڑکے نے مجھے مخاطب کیا۔ ''عابد بھائی آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کراؤ۔ یہ کب سے آپ کو مرض ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ مجھے کیا کہہ رہا تھا پھر میرے اندر خود ہی بات اٹھی کہ اسے میرا ان دونوں سے اتنی دیر تک بات کرنا شاید برا لگا ہو۔ وہ بھی اس کی بات سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ میں سر ہلاتا ہوا اسٹور سے باہر آ کر گھر کی جانب چل پڑا۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پیر صاحب سے دونوں کا تذکرہ آج ضرور کروں گا۔ کالج سے واپسی پر میں نے کھانا میز پر رکھتے پیر صاحب کو مخاطب کیا۔ ''سرکار گھاسی رام کے کارخانہ کے کوارٹروں میں رہنے والی دو بہنیں آپ سے ملنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ ان سے کالونی کے اسٹور پر واقفیت ہوئی تھی۔ ایک دو بار آپ کا پتہ کرنے بھی آئیں تھیں مگر آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔''

''اچھا، ان کو چھٹی والے دن آنے کا کہہ دینا کوئی روحانی معاملہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' میں نے گلاس میں پانی بھرتے ان کی تائید کی۔ کھانے کے بعد پیر صاحب اپنے کمرے میں آرام کے لیے چلے جاتے تھے، میں برتن وغیرہ سمیٹ کر اپنے کمرے میں

آجاتا۔ سب کام نپٹا کر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کارخانے والے راستہ پر ان کے کوارٹر کی طرف چلا جارہا تھا۔ کوارٹر کا دروازہ دو بار کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا اور مایوس ہوکر میں واپس پلٹ آیا۔ دوسرے دن بھی گیا مگر کوئی جواب نہ پاکر واپس آ گیا۔ کسی نہ کسی بہانے اسٹور پر بھی آیا مگر ان سے ملاقات نہ ہوئی۔

اس روز کالج کی چھٹی تھی پیر صاحب چھٹی والے دن دیر سے جاگتے تھے۔ اس لیے میں نے بھی پڑا سوتا رہتا تھا۔ باہر دروازے پر دستک ہوئی، میں نے سوچا شاید کوئی گاؤں سے آیا ہوگا کیونکہ اکثر ہی چھٹی والے دن پیر صاحب کو ملنے کوئی نہ کوئی گھر سے شہر آ جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے بستر چھوڑ دیا اور آ کر دروازہ کھولا تو مجھے جھٹکا لگا۔ سامنے شنو اور ثریا کھڑی تھیں۔ میں مسکرا کر ان کو ملا اور اندر آنے کا کہا۔ وہ میرے پیچھے اندر آ گئیں۔ میں نے چلتے چلتے ان کو بتایا کہ پیر صاحب نے آپ کو بلانے کی اجازت دے دی تھی۔

''ہاں ہم لوگ ایک فوتگی پر دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا سامنے والوں نے ہمیں آتے ہی بتایا کہ آپ دو بار کوارٹر پر آئے تھے۔ رات دیر سے واپسی ہوئی ورنہ ہم آ جاتیں۔'' شنو نے زندہ دلی سے مسکراتے جواب دیا۔ میں ان کو بڑے کمرے میں بٹھا کر ان کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرنے کچن میں آ گیا۔ پیر صاحب بھی جاگ گئے تھے۔ مجھے آواز دے کر بلایا اور پوچھا کس سے باتیں کر رہے تھے۔ ''سرکار وہی لڑکیاں ہیں، جن کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔''

''ان کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرو میں بھی تیار ہو کر آتا ہوں''

''جی بہتر سرکار۔'' میں نے واپس کچن کی طرف جاتے کہا اور کچن میں آ کر ناشتہ وغیرہ تیار کرنے لگا۔ جب میں ناشتہ اور ان کے لیے چائے پانی لے کر کمرے میں آیا تو پیر صاحب اپنے مخصوص صوفہ پر بیٹھے دونوں سے محوِ گفتگو تھے۔ میں نے نظریں نیچی کرتے سارا سامان میز پر سجا دیا اور قریب ہی مؤدب کھڑا ہوگیا۔

پیر صاحب اور شنو جس موضوع پر تبادلہ خیال کر رہے تھے وہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ بس یہی پتہ چلا کہ دونوں پیر صاحب کی رہنمائی چاہتی ہیں۔ جاتے ہوئے پیر صاحب نے دو روز کے بعد شام پانچ سے سات بجے کا وقت دیا۔ پیر صاحب نے مجھے بتایا کہ ''پانچ سے سات بجے تک دونوں یہاں انگریزی پڑھنے آیا کریں گی تمہیں باہر برآمدے میں ان کے بیٹھنے کا انتظام کرنا ہوگا اور اس دوران ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا بھی تمہارے فرائض میں شامل ہے۔''

''جی سرکار جو حکم آپ کا۔'' پیر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں برتن وغیرہ سمیٹنے میں لگ گیا۔ دو روز بعد شنو اور ثریا ٹھیک پانچ بجے آ گئیں، میں نے پہلے سے برآمدے میں دو آرام دہ کرسیاں اور پیر صاحب کے لیے تخت پوش پر نرم میٹرس بچھا کر اوپر صاف ستھری چادر ڈال دی تھی۔ دونوں بڑی محبت سے ملیں اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے رجسٹر کرسیوں کے آگے پڑے میز پر رکھتے ہوئے پیر صاحب کا پوچھا۔ پیر صاحب اپنے بستر پر بیٹھے کالج کا بھی کام کر رہے تھے۔ میں نے جھک کر سلام کرتے دونوں کے آنے کی خبر دی تو انہوں نے مجھے چائے وغیرہ بنانے کا کہا اور اپنی کتابیں سمیٹ کر میرے پیچھے ہی باہر نکل آئے۔ دونوں اٹھ کر کھڑی ہوگئیں، پیر صاحب سلام کا جواب دیتے اپنے تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ کچن سے باہر برآمدے کا

سارا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ میں چائے وغیرہ کی ٹرے لگا کر برآمدے میں آ گیا اور میز پر رکھتے ایک طرف باادب کھڑا ہو گیا۔ پیر صاحب دونوں کو کچھ لکھوا رہے تھے۔ وہ انگلش کا کوئی سبق تھا مگر میری سمجھ سے بالاتر ہونے کے باعث میرے پلے نہیں پڑا۔ چائے کے خالی برتن میں نے میز پر سے اٹھائے اور لے کر کچن میں آ گیا۔ جب تک وہ پیر صاحب کے روبرو ہوتیں میں گیٹ کے ساتھ چھوٹے سے لان میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا پیر صاحب کے حکم کا منتظر رہتا۔ آتے جاتے وہ دونوں اب میری جانب سرسری نظر ڈالتے گزر جاتیں۔ میری بھلا کیا اوقات کہ میں ان کی اس سرد مہری کا کوئی ردعمل ظاہر کرتا۔

ان کو پیر سائیں سے درس لیتے کئی ہفتے بیت رہے تھے اب وہ باہر برآمدے کی بجائے پیر صاحب کے کمرے میں بیٹھنے لگی تھیں۔ میری ڈیوٹی گیٹ کے اندر اوپن چھت کے نیچے ہو گئی تھی جہاں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی تھی۔ جب پیر صاحب کو کوئی ضرورت پڑتی تو وہ اندر سے آواز دے کر مجھے طلب کر لیتے۔ جب وہ یہاں رکتیں تو پیر صاحب گیٹ کا تالا اندر سے لگانے کا کہہ دیتے۔ میں تالا لگا کر اوپر جا سوتا۔ ایک روز ایسا ہی ہوا صبح جب میں نیچے آیا تو برآمدے میں ثریا کرسی پر ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں باادب اس کے قریب آ کر رکا "میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ دو بار اوپر گئی مگر تم بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ اس لیے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ تم گیٹ کا تالا کھول دو میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے گیٹ کی طرف دیکھا۔

میں نے جیب سے چابی نکالتے اندر سے گیٹ

غزل

حلقۂ یاراں میں ہے احساسِ تنہائی مجھے
یعنی بزم دوستاں بھی راس نہ آئی مجھے

کسقدر دشوار ہے اپنوں میں اپنوں کی تلاش
آرزوئے زندگی آخر کہاں لائی مجھے

ہم پشیمان تمنا تھے پسِ عہد وفا
اُس کو احساسِ ندامت خوفِ رسوائی مجھے

ہے سبب تسکین کا مجھ کو مرا ذوق سخن
باعثِ توقیر کب ہے سخن آرائی مجھے

دیکھتے رہنا مجھے بالائے بام آ کر ترا
یاد ہے اب تک ترا وہ عہدِ رعنائی مجھے

بزم ہستی میں وہ آنا بے حجابانہ ترا
اک یہی وہ بات جو دنیا میں لے آئی مجھے

ہر گھڑی ہے اس جہاں میں اک تغیر کا ظہور
اب نظر آتی ہے تصویر دھندلائی مجھے

ہیں تو یہ آثار اب قرب قیامت کے سخی
اب تو وہ ہرجائی بھی کہتا ہے ہرجائی مجھے

سخی کنجاہی

کا تالا کھول دیا وہ میرے سامنے خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں گیٹ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہو کر میں نے کچن میں آ کر ناشتہ تیار کیا اور پیر صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ پیر صاحب نے اپنے کمرے سے آواز دی کہ ناشتہ ادھر ہی لے آؤ۔ میں نے جلدی سے سارا سامان ٹرے میں سجایا اور لے کر پیر صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جانے کے لیے گھوما ہی تھا کہ انہوں نے یہ کہہ کر مجھے بُری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا کہ "ناشتہ میں نے ہی کرنا ہے، ثریا، شنو تو رات کو ہی چلی گئی تھیں۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ سرکار پیر صاحب کیا فرما رہی تھے۔ ثریا کو تو میں نے خود صبح گیٹ کا تالا کھول کر باہر نکالا تھا۔ پیر صاحب ناشتہ کر رہے تھے اور میں بے حد پریشانی میں ان کے قریب کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔

برتن اٹھا کر میں کچن میں آ گیا اور اسی بات پر غور کرتا رہا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ شنو موجود نہیں تھی، ثریا برآمدے میں کرسی پر آنکھیں بند کیے نیم دراز تھی۔ یکدم میری چھٹی حس کروٹ لے کر بیدار ہو گئی کہ جس روز میں دونوں سے اسٹور میں باتیں کر رہا تھا اور جب کاؤنٹر پر آیا تو لڑکے نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے پوچھا کہ یہ بیماری کب سے ہے وہ دونوں بھی قریب ہی کھڑی تھیں اس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی جیسے وہ وہاں موجود نہ ہوں۔ اس طرح سوچتے پیر صاحب کے کالج جاتے ہی میں نے جلدی جلدی کام سمیٹا اور گھر کو باہر سے تالا لگا کر کارخانہ کی طرف چل پڑا۔

چھوٹا گیٹ کھلا تھا اور بڑے گیٹ والی سائیڈ پر ہی اوپر جانے والی سیڑھیوں پر سے نیچے آتے چوکیدار پر میری نظر گئی تو میں رُک گیا۔ چوکیدار نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ "بابا جی میں نے ادھر کوارٹروں میں جانا ہے۔"

"کیوں خیر ہے؟"

"جی ادھر شنو بی بی اور اس کے گھر والوں کو ملنا ہے۔" چوکیدار حیرانگی سے میری طرف دیکھتے بولا۔

"دماغ تو درست ہے تمہارا؟ ارے بیوقوف انسان وہ کوارٹر تیس سال سے بند اور ویران پڑے ہیں۔ جب سے یہ کارخانہ سرکار نے اپنے قبضہ میں لیا ہے یہاں صرف ایک چوکیدار کے سوا کسی کا کوئی عمل دخل نہیں۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا ہو۔ میں گرتا پڑتا کارخانہ کا چھوٹا دروازہ عبور کر کے سڑک پر نکل آیا۔ گھوم کر میں نے کوارٹروں کی طرف دیکھا تو مجھے وہاں دو ہیولے سے دکھائی دیئے جن کی پشت میری جانب تھی۔ شاید وہ شنو اور ثریا تھیں۔

گھر واپس آ کر پیر صاحب سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ دھیمے سے مسکرائے۔

"میرے آباؤ اجداد نے عبادت کر کے وہ درجہ پایا ہے جس کی بدولت غیر انسانی مخلوق بھی ہم سے رابطہ کرتی ہے ولایت کے اس درجے پر فائز ہونے کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔"

میں منہ کھولے ان کی بات سن رہا تھا۔

وہ دونوں انسان نہیں تھیں اس بات نے مجھ پر جھرجھری طاری کر دی۔ میں نے پیر صاحب کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میرے لیے دعا کریں۔

اور اس دن میں نے جانا کہ اللہ کے نیک بندوں کی خدمت کا موقع بھی ہر کسی کو نہیں ملتا۔

□□......۞......□□

کراچی سے بھیجا گیا شاہکار

خواجہ سرا

ایسی سچی کہانی جونسلوں سے زبان زدعام ہے

فرح انیس

رک کیوں گئی آگے بڑھ نہ بانو اپنی سہیلی سکینہ کو درخت کے پاس رکتا دیکھ کر اور درخت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ کر اس کا بازو ہلاتے ہوئے بولی۔

سنا ہے اس درخت کا پھل کھانے سے اولاد ہو جاتی ہے وہ اس درخت کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی جس پر بانو ہنسنے لگی۔

ہاں بچے عورتوں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں ہیجڑوں کے ہاں نہیں بانو اس کی بات پر خوب ہنس رہی تھی جس پر سکینہ برا مان کر اسے دیکھنے لگی۔

یہ کیا برا ماننے کی کیا بات بھلا ہیجڑوں کے ہاں کبھی سنا بچہ پیدا ہوا ہو۔

ہاں یہ تو ٹھیک کہا تو نے ہیجڑوں کے ہاں کب بچہ پیدا ہوتا ہے بانو کی بات پر سکینہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔

چل اب دیر ہو رہی ہے بانو کی بات پر وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی مگر سکینہ کے دماغ میں یہ بات اٹکی تھی اگر میں یہ درخت کا پھل کھاؤں تو کیا ہوگا وہ کتنے ہی لوگوں کو اس درخت کا پھل کھاتا دیکھتی تھی اور پھر رب کی شان کے اللہ کی قدرت سے اس پھل میں ایسی تاثیر تھی کہ بے اولادوں کو اولاد ہو جاتی۔

اگلے دن سکینہ جو گھر سے نکلی تو اس کے دماغ میں اتنے دن سے اس درخت کو لے کر جنگ چل رہی تھی اب جب وہ بانو کے ساتھ اس پیڑ کے پاس سے گزری تو نجانے اس کے دل میں کیا سمائی اس نے پھلوں سے لدے پیڑ میں سے ایک پھل توڑ کر اس پھل کو کھانا شروع کر دیا جس پر بانو حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی تجھے کیا لگتا ہے یہ پھل کھا کر تجھے اولاد ہو جائے گی بانو ہنستے ہوئے بولی جس پر سکینہ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموشی سے خواجہ غریب نواز رحہ اور بی بی حافظ جو خواجہ غریب نواز کی صاحبزادی ہیں ان کی بارگاہ میں پہنچی اور بولی میں نے وہ پھل کھا لیا میری بھی اولاد ہو جائے گی کیا اس کے چہرے پر بکھری ہنسی دیکھ کر خواجہ غریب نواز رحہ نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔

کچھ دنوں بعد اس کنز کو اپنے وجود میں ایک

نئے وجود کا احساس ہوا اللہ کی قدرت سے اس کے پیٹ میں بچہ آ گیا تو وہ گھبرا کر خواجہ غریب نواز کی بارگاہ میں حاضر ہوئی کہ حضور مجھے معاف کر دیں میں نے مذاق کیا تھا جس پر خواجہ غریب نواز بولے تو نے مانگی اولاد تو اب لے اولاد۔ پوری بستی میں مشہور ہو گیا کہ ہیجڑے کو اولاد ہو رہی ہے ہر شخص انگشت بداناں تھا کہ کبھی نہیں سنا تھا نہ دیکھا تھا کہ ہیجڑے کو اولاد ہو جب پیدائش کا وقت قریب آیا تو اس وقت وہ کنز جنگل میں تھی چار لوگوں نے مل کر سکینہ کے پیٹ کو پتھر سے چاک کیا وہ پتھر پیٹ میں موجود بچے کو لگا وہ موقعے پر ہی دم توڑ گیا اور کچھ لمحوں بعد سکینہ نے بھی دم توڑ دیا خواجہ غریب نواز نے فرمایا اسے بی بی حافظ کے قدموں میں رکھ دو سکینہ اور اس کے بیٹے کا مزار خواجہ غریب نواز کی صاحبزادی حافظ بی بی کے سرہانے میں موجود ہے۔

سکینہ اور اس کے بیٹے کا نام خواجہ سرا رکھا گیا تب سے ان کو خواجہ سرا کہا جاتا ہے۔

آج بھی اس درخت میں پھل لگتا ہے اس درخت کا پھل سوا مہینے غریب نواز کی صاحبزادی کے مزار کے پاس رکھا جاتا ہے اور اللہ کی قدرت ہوتی ہے کہ پھر اولاد اللہ پاک عطاء کرتا ہے۔

کنز کا مزار ہندوستان جسے اولیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے اجمیر شریف کے مقام تارا گڑھ پر موجود ہے اسے غریب نواز کی بستی بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ غیاث الدین رح جن کو ایک بار خواب آیا اور اس خواب میں انہوں نے دیکھا اللہ کے محبوب دونوں جہاں کے سردار حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اے غیاث الدین تمہارے نصب سے اللہ ایسا ولی بھیج رہا ہے جو ہزاروں انسان پر مہربان رہے گا جب حضرت خواجہ غیاث الدین کی آنکھ کھلی تو اس

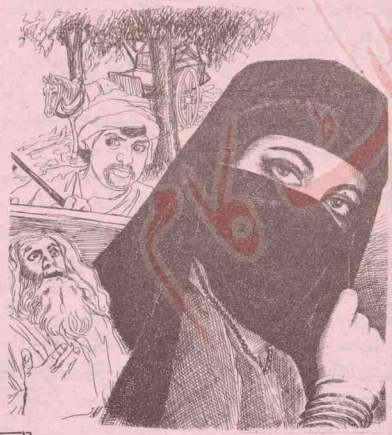

کے بعد حضرت غیاث الدین کے لبوں پر دعا تھی کہ اے اللہ جلد یہ خواب پورا فرمائے۔ اب حضرت خواجہ غیاث الدین کے لبوں پر ہمہ وقت یہی دعا رہتی تھی۔۔

چودہ رجب المرجب پانچ سو تیس ہجری بمطابق اٹھارہ اپریل گیارہ سو چھتیس عیسوی بروز ہفتہ مغرب کے وقت اصفہان شہر کے ایک قصبے میں اللہ کے نیک بندے حضرت خواجہ غیاث الدین چشتی رح کا خواب اللہ نے پورا فرمادیا اور ان کی جھولی میں حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی رح کو ڈال دیا۔

آپ کی پیدائش پر آپ کے والد بے انتہا مسرور تھے۔ لوگوں نے آپ کو جب اتنا خوش دیکھا تو آپ کی خوشی کا سبب پوچھا تو آپ نے ان لوگوں کو اپنا خواب سنا کر کہا کہ یہ میرا بیٹا اللہ کی طرف سے رحمت بنے گا۔

آپ کی جب پیدائش ہوئی تو آپ کے سینے پر ایک تل تھا جیسے عربی زبان میں لفظ اللہ لکھا ہو۔

بچپن سے ہی آپ کو عبادت کا شوق تھا کافی سال آپ علم حاصل کرتے رہے ابھی آپ پندرہ سال کے تھے کہ آپ کے والد حضرت غیاث الدین رحہ رحلت فرما گئے اس ہی سال آپ کی والدہ کی وفات بھی ہوگئی آپ کو پن چکی اور ایک باغ ورثے میں ملا جو آپ نے وہ باغ غریبوں میں تقسیم کردیا اور پھر آپ قرآن حفظ کرنے کے لیئے بخارا شریف آگئے کافی سال علم حاصل کرتے رہے یہاں تک کے آپ نے قرآن اس طرح حفظ کرلیا کہ اگر کوئی آپ سے سوال کرتا تو آپ ہر سوال کا جواب قرآن پاک کی مختلف آیات سنا کر دیتے۔

کافی سال آپ تصوف کا درس لیتے رہے۔

آپ کی عمر بیئس برس تھی جب آپ بغداد آپہنچے بغداد میں گھومتے گھومتے جنید بغدادی کی مسجد میں آئے تو دیکھا ممبر پر حضرت خواجہ عثمان ہارونی اللہ کے مخلوق کی اصلاح کر رہے تھے ان کا انداز گفتگو اور چہرے کا نور جب خواجہ معین الدین چشتی رحہ نے دیکھا تو ان کے قریب آگئے اور بولے آپ نے خواجہ عثمان ہارونی کی بیعت کرلی اور عرض کیا میں آپ کی مریدی میں آنا چاہتا ہوں اور جس انداز گفتگو سے آپ لوگوں کی اصلاح کر رہے ہیں میں بھی ایسی اصلاح چاہتا ہوں۔۔

حضرت خواجہ عثمان ہارونی نے آپ کو اپنا مرید بنالیا آپ کافی سال تصوف کا درس لیتے رہے ایک دن حضرت عثمان نے کہا معین الدین حج پر چلو گے آپ نے کہا اس سے بڑھ کر میرے لیئے کیا ہوگا کہ میں اپنے رب کے در جاؤں۔

حضرت عثمان ہارونی اور حضرت معین الدین چشتی رحہ حج کے لیے روانہ ہوئے۔

حج پر جب گئے تو طواف کا جب ساتواں چکر ختم ہوا تو حضرت عثمان نے آپ کا ہاتھ تھام کے کہا۔

اے میرے رب میں تیرے حضور معین الدین کو پیش کرتا ہوں میرے سب مریدوں میں سب سے پاک دامن اور نیک ہے یہ تو اس سے وہ کام کرا جو تو چاہتا ہے اور پھر آپ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب روانہ ہوگئے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر حضرت عثمان نے حضرت معین الدین کا ہاتھ تھام کے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ معین الدین تیری امت کے غریبوں سے بہت پیار کرتا ہے اگر کوئی غریب اس کے سامنے آجاتا ہے تو اس کو خالی نہیں جانے دیتا۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے وجود میں جو فیض چھپا ہے اس کو آشکار کرا اور اسے اس کی منزل

سے ملادے۔

بس یہ دعا مانگ رہے تھے کہ کچھ دیر بعد حضرت عثمان نے خواجہ معین الدین کی پیشانی کو چومنا شروع کردیا تو آپ نے عرض کیا۔

اے میرے استاد آج آپ کی آنکھوں میں اتنی الفت کی چمک کیوں تو آپ کے استاد نے کہا اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں غریب نواز کے لقب سے نوازا دیا ہے۔

آج کے بعد تو کسی بھی غریب کے لیے دعا کرے گا تو اللہ وہ دعا رد نہیں کرے گا اس کے بعد واپس اپنے شہر بغداد چلے گئے۔ بغداد آنے کے بعد خواجہ عثمان مسلسل چلے میں رہتے تھے ایک دن غریب نواز کو بلا کر اپنا کرتا اور نعلین عطا کی اور کہا جاؤ آج کے بعد اللہ کے بندوں کی اصلاح کرتے رہو میں نے تم کو اجازت دے دی اس کے بعد خواجہ غریب نواز مختلف گاؤں اور دیہات میں جا کر اللہ کے بندوں کی اصلاح کرتے ان کو دین حق بتاتے آپ کے انداز گفتگو میں وہ مٹھاس تھی جو بھی آپ کی بات سنتا تھا آپ کا مرید بن جاتا تھا۔

بس یوں وقت گزرتا گیا اور حج کا زمانہ آگیا تو آپ اپنے مریدوں کے ساتھ اللہ کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے حج کیا حج کے بعد سجدے میں سر رکھ کے آپ نے رب کی بارگاہ میں دعا کی کے اے اللہ میرے مریدوں کو جنت عطا فرما۔

حج کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اس خادم کے لیے کیا حکم ہے رات جب سوئے تو خواب میں دیکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں آتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

اے معین الدین جاؤ میں نے تم کو ہند کی سلطنت عطا کی جاؤ اور وہاں لوگوں کی اصلاح کرو۔

خواجہ نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی لاہور میں جس دربار پر حاضری دی وہ داتا گنج بخش ہجویری رحہ کا مزار اقدس تھا یہاں آپ نے چلا کشی کی اور پھر ملتان تشریف لے گئے ملتان جو ان دنوں ہندوستان میں علم وادب کا گہوارہ تھا آپ نے وہاں ہندوستان میں بولی جانے والی معروف زبانیں سیکھیں کچھ عرصہ ملتان میں قیام کے بعد آپ دلی تشریف لے گئے اور پھر اجمیر شریف کا رخ کیا۔

اجمیر کا اصل نام آجامیر ہے آجا سورج کو کہتے ہیں اور میر کہتے ہیں پہاڑ کو، ساتویں صدی میں اجمیر کی بنیاد رکھی گئی یہ علاقہ پرتھوی راج کی سلطنت ہے ادھر انسان کو اپنی ذات سے پہچانا جاتا تھا غریب مفلس کو اس کی مفلسی کا احساس دلایا جاتا تھا ظلم وہاں عام تھا۔

خواجہ غریب نواز اپنے مبارک قدم لیے اجمیر میں اپنے مریدوں کے ساتھ پھرتے رہے اجمیر کے لوگ حیران تھے ایسا بارعب نورانی چہرہ نہیں دیکھا گھومتے گھومتے آپ اس جگہ پہنچ گئے جس جگہ کو لوگ سب سے کمتر سمجھتے تھے آپ اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں بیٹھ گئے شام ہونے لگی تو کچھ لوگ آئے بولے۔

اٹھو بابا یہاں گورنمنٹ کے اونٹ بیٹھتے ہیں آپ نے مسکرا کر کہا۔

اللہ کی زمین بہت وسیع ہے جاؤ کسی اور جگہ بٹھا لو تو وہ بولے اٹھو بابا یہاں پرتھوی راج کے اونٹوں کی جگہ ہے جاؤ کہیں اور بیٹھو بس یہ کہنا تھا کہ غریب نواز اپنی جگہ سے اٹھے اور فرمایا وہ اونٹوں کو بٹھا تو لو مگر اونٹ بیٹھے رہیں گے۔

آپ وہاں سے اٹھ کر ایک جھیل کے کنارے آ بیٹھے وہاں ہزاروں پنڈت تھے جو آپ کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر آپ مسلسل ذکر الٰہی

میں مصروف رہے بس رات گزر گئی اور صبح ہوئی تو گورمٹ کے ملازم آکر غریب نواز کے قدموں میں گر گئے اور کہنے لگے اللہ کے ولی ہم سے غلطی ہوگئی ہم کافی دیر سے اونٹوں کو اٹھا رہے ہیں مگر وہ اٹھ نہیں رہے بیٹھے ہوئے ہیں مگر اٹھ نہیں پا رہے۔

خواجہ غریب نواز رحمہ نے ان کی بات سن کر کہا جاؤ تمہارے اونٹ اٹھ چکے ہیں ملازم جب وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں سب اونٹ کھڑے ہو چکے ہیں اور ان اونٹوں کا سر احترام میں خواجہ غریب نواز رحمہ کی جانب جھکا ہے یہ بات پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی پرتھوی راج کو بھی پتا چلا تو وہ اندر سے خوفزدہ ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد وہ جوگیل پر پنڈت بیٹھے تھے وہ سب پرتھوی راج کے پاس آئے اور کہنے لگے

اے ہمارے راجا ندی کنارے ایک فقیر آیا ہے وہ ندی کنارے نماز پڑھتا رہتا ہے۔ ندی کا پانی وضو کے لیے استعمال کرتا ہے وہ ندی کا پانی خراب کر رہا ہے۔

اسے ندی سے اٹھا دے کیونکہ دو دن بعد ہمارا میلہ ہے اور ہزاروں لوگ ندی کنارے آئے گے۔ اگر آپ نے اٹھایا نہیں تو ہم اس فقیر کو مارے گے اور وہاں سے اسے بھگا دے گے تو پرتھوی راج نے کہا۔ اجازت ہے تمہیں جاؤ اس ڈھونگی فقیر اور اس کے مریدوں کو مار کے بھگا دو۔

جب مرید ندی کنارے وضو کے لیے آئے تو وہ پنڈت لاٹھیاں لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ان مریدوں کو بری طرح زخمی سے کر دیتے ہیں وہ مرید روتے ہوئے خواجہ کی بارگاہ میں آتے ہیں اور کہتے ہیں یہاں سے چلتے ہیں وہ پنڈت مارتے ہیں اور کہتے ہیں تم لوگ پانی پلید کرتے ہو تو خواجہ فرماتے ہیں پانی کسی ایک انسان کا نہیں بلکہ خالق کا ہے جس نے انسانوں کے لیے اسے نعمت بنا کر بھیجا۔

آؤ میرے ساتھ ان پنڈتوں سے بات کرلے ہیں یہ کہہ کر خواجہ اپنے مریدوں کے ساتھ چل پڑے ہیں اس وقت جھیل کنارے میلہ لگا ہوا تھا ہزاروں لوگ تھے آپ کے چہرے پر ایسا رعب تھا جو بھی آپ کو دیکھتا آپ کو دیکھتا رہ جاتا خواجہ غریب نواز بولے۔

تم لوگ کیا سمجھتے ہو یہ پانی تمہارا ہے تو ایک پنڈت بولا ہاں یہ پانی ہمارا ہے تو خواجہ نے کہا اس پانی کا مالک رب ہے جس نے تمام انسانوں کے لیے یہ نعمت عطا کی تو وہ پنڈت بولا جاؤ بابا جاؤ کسی اور جگہ جاؤ اس کی بات پر خواجہ غریب نواز بولے۔

ٹھیک ہے ہم جا رہے ہیں ہم اپنے حصے کا پانی لے کر جا رہے ہیں آپ نے ایک لوٹا جھیل میں ڈالا جیسے ہی لوٹا اوپر اٹھا جھیل کا پورا پانی سمٹ کر لوٹے میں آگیا وہاں کھڑے پنڈت حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہوا ہے خواجہ جھیل کو چھوڑ کر آگے چلنے لگے ان کے پیچھے ان کے مرید اور ان مریدوں کے پیچھے وہ ہزاروں لوگ جو میلے میں آئے تھے ان کے قدموں میں گر گئے اور کہنے لگے اے اللہ کے ولی ہمیں پانی دے دو ہمیں معاف کر دو خواجہ غریب نواز ان کی بات پر بولے بھی کسی انسان کو کمتر نہ سمجھو کیونکہ تمہیں کیا پتا جسے تم کم سمجھ رہے ہو وہ اللہ کے نزدیک سب سے عزیز ہو بس یہ کہہ کر خواجہ نے اپنے لوٹے کا پانی اس جھیل میں ڈال دیا جھیل پھر سے بہنے لگی۔

اللہ کے ولی کا یہ معجزہ دیکھ کر وہاں جو لوگ تھے سب مسلمان ہوگئے یہ بات پرتھوی راج تک پہنچی تو وہ ڈر گیا اور سوچنے لگا یہی وہ فقیر ہے جو میری سلطنت کو تباہ کرے گا۔

بس خواجہ غریب نواز رحمہ کے مرید بڑھتے گئے اور سب کے لبوں پر اللہ کے ان ولی کا ذکر تھا یہ باتیں

پرتھوی راج کو ناگوار گزری۔

اس نے خواجہ غریب نواز کی عزت کم کرنے کے لیے بڑے بڑے پنڈتوں کو بلایا اور کہا تاؤ اس فقیر کو کے اسے کچھ نہیں آتا لیکن جو بھی آئے وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلے۔

پرتھوی راج کے دربار پر جو سب سے بڑا عالم تھا جس سے وہ ہر بات کا مشورہ کرتا تھا اس کا نام سادھو رام تھا۔

پرتھوی راج نے کہا جاؤ سادھو رام اس فقیر کو بتاؤ اسے کچھ نہیں آتا وہ سادھو جاتا ہے اور خواجہ غریب نواز کی توہین کرنے کی کوشش کرتا ہے خواجہ غریب نواز نے اپنا جھکا سر اٹھایا اور کہا کب تک سادھو رام اپنے آپ سے جھوٹ بولو گے تم بظاہر تو اپنے آپ کو ہندو بولتے ہو مگر اندر ہی اندر تم مسلمان ہو یہ کہنا تھا سادھو رام گھبرا کر قدموں میں گر گیا اور کہنے لگا اس بات کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہ تھا میں آپ کا مرید ہوں آپ سچ کہہ رہے ہیں میں مسلمان ہوں۔

بس جب سب عالم تھک گئے تو پرتھوی راج نے جادوگروں کا سہارا لیا اس دور میں ایک بہت بڑا جادوگر ہوا کرتا تھا جس کا نام جے پال تھا۔

اس کو بلایا گیا جس کے چار سو شاگرد تھے وہ خواجہ غریب نواز رحمہ کی توہین کے لیے آپہنچا بس ایک طرف وہ جادوگر تھے تو دوسری جانب اللہ کا وہ ولی تھا۔

وہ پوری رات جادو کرتے رہے مگر ان جادو کا خواجہ غریب نواز رحمہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

آخر کار وہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگے یہ عام انسان نہیں اس پر اللہ کا کرم ہے اور جس پر اللہ کا کرم ہو اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

وہ جادوگر کہنے لگے اس کے چہرے کا نور بتا رہا ہے یہ سچا ہے اور جس دین پر یہ ہوگا وہ دین بھی سچا

میت

سفید سفید بشر طیہ
میں مرا پڑا ہوں
خشک آنکھیں لیے
ہر طرف تک رہا ہوں
سانس بوجھ ہے

یا
رک گئی ہے
شعلے زبانوں سے بھڑک رہے ہیں
جن میں، میں جل رہا ہوں
میں مرا پڑا ہوں
خودی کے چہرے
بے باک دھوپ میں دمک رہے ہیں
میں مرگیا ہوں
بے ضمیر قافلہ آئے گا، مجھے اٹھائے گا
چار آنسو بہائے گا
اور جلد سے جلد زمین میں ڈال جائے گا
مری مرقد اتنی بڑی بنائے گا
کہ میں مل نہ سکوں دوبارہ
مری لاش کی آنکھ سے
اِک آنسو نکلا ہے
اور اپنی اس اوقات پہ
سفید چہرے کی کھال میں جذب ہوگیا ہے
مراسمِ ختم ہوگیا ہے

ہے وہ تمام جادوگر بھی مسلمان ہوگئے اس بات سے خواجہ غریب نواز رحہ کی شہرت اور بڑھ گئی۔

پرتھوی راج نے خواجہ غریب نواز رحہ کے مریدوں پر ظلم شروع کر دیا اور ان کو قید کر لیا اور خواجہ غریب نواز کو یہ پیغام پہنچایا کہ اگر تم راجستھان چھوڑ دو گے تو میں تمہارے مریدوں کو چھوڑ دوں گا نہیں تو میں ان کو مار دوں گا۔

آپ اپنے مریدوں سے بہت پیار کرتے تھے آپ نے کہا ٹھیک ہے یہ بات ہے تو میں چلا جاتا ہوں مگر یہ سلطنت مجھے بلائے گی یہ زمین مجھے بلائے گی اور تم جلد مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاؤ گے۔ پرتھوی راج ہنسنے لگا آپ اپنے مریدوں کو لے کر چلے گئے ان دنوں شہاب الدین غوری جو پرتھوی راج سے شکست کھا کے بیٹھا ہوا تھا وہ بار بار اپنی شکست کو یاد کرتا اور روتا رہتا تھا۔

ایک دن اس کے خواب میں اللہ کے ولی آئے اور کہنے لگے۔

"اے شہاب الدین اٹھو اور جاؤ پرتھوی راج سے جنگ کرو وہ جلد تمہارے ہاتھوں قید ہوگا۔" اس خواب کے بعد شہاب الدین افغانستان سے چلا اور راجستھان پر قابض ہو گیا اور پرتھوی راج سے جنگ لڑی اور اسے قید کر لیا جیسے ہی وہ قید ہوا تو لوگ کہنے لگے یہاں ایک فقیر ہوا کرتا تھا اس نے کہا تھا کہ جلد پرتھوی راج مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوگا۔

شہاب غوری نے کہا میں اس فقیر کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں اور اپنے نو جیوں سے کہا جاؤ اللہ کے اس ولی کو ڈھونڈو بس ڈھونڈتے ڈھونڈتے خواجہ غریب نواز کے قدموں میں وہ فوج آ پہنچی اور خواجہ غریب نواز کی بات سچی ہوئی کہ ہندوستان کی زمین مجھے خود بلائے گی۔

پانچ رجب المرجب چھ سو تیتیس ہجری کو عشاء کی نماز کے بعد آپ اپنے حجرے میں گئے اور مریدوں سے تاکید کی کہ کوئی بھی حجرے میں نہ آئے وقت تہجد تک ذکر حق کی آواز آتی رہی پھر موقوف ہوگئی فجر کا وقت قریب آیا تو آپ کے خادمین حجرے کے دروازے پر آ کر نماز کی پکار لگانے لگے۔

لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا بس فجر کا وقت ختم ہونا تھا مرید حجرے میں آ کر دیکھتے ہیں تو آپ دار الفنا سے دار البقا کی طرف کوچ کر چکے ہیں آپ کے چہرے مبارک سے نور کی شعاعیں ابھر رہی ہیں اور پیشانی پر نور سے اللہ کا اسم تحریر ہے۔

آپ کی قبر مبارک جہاں پر بنیلی تھی جب تعمیل نہیں ہوئی تھی اس وقت غریب نواز کی قبر مبارک کے اردگرد گھنا جنگل تھا اور اس جنگل میں جنگلی جانور شیر وغیرہ رہتے تھے شیر باادب اپنی گردن کو جھکا کر ان کی قبر مبارک پر حاضری دیتے تھے اور ادب سے گردن جھکائے کھڑے رہتے تھے۔

آپ کا فیض تا ابد قائم و دائم رہے گا غریب نواز نے نو لاکھ کو مسلمان بنایا بلکہ کہتے ہیں مسلمان ہونے والوں کی تعداد نو سے لاکھ سے زیادہ ہے۔

کہتے ہیں ہندوستان کا کوئی بادشاہ تب تک بادشاہ نہیں بنتا جب تک آپ کے قدم نہ چومے۔

آپ کو بہت سے القابات سے نوازا گیا۔

نائب رسول

عطائے رسول

سلطان ہند

غریب نواز بھی کہا جاتا ہے۔

آج ہزاروں لاکھوں غریب نواز کے دیوانے ان کے مزار پر حاضری دینے آتے ہیں جن میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں بیشک اللہ والے ہی اللہ سے قریب کرتے ہیں۔

□□.....❁.....□□

رباظ

(قسط نمبر 5)

وہ انسانوں کی دنیا میں چلا آیا تھا پھر اس کے ساتھ کیا ہوا.....

لمحہ لمحہ پُراسراریت بڑھاتی تحریر

کاوش صدیقی

"کیوں..... کیا ایسی ہی خطرناک بات ہے.....؟" سعدیہ نے تشویش سے پوچھا۔

"دیکھو..... تم جانتی ہو کہ میرا خون کس قدر ناپاک ہے..... اور میں نور اہی کسی بات کا اثر لے لیتی ہوں..... دوسری بات یہ ہے کہ تم میری امی سے اچھی طرح واقف ہو..... دیکھ لو..... رات کو میں صرف ڈر کر جاگ گئی تھی اور وہ فوراً ہی شاہ صاحب سے میرے لیے تعویذ لے کر آ گئیں..... دیکھو.....!!"

یہ کہہ کر سعدیہ نے گلے میں سے تعویذ نکال کر دکھایا۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا.....!" دردانہ بولی۔

"بتانے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں ڈرا رہی ہوں..... بلکہ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ سب باتیں تمہارے علم میں ضرور آنی چاہئیں..... ورنہ دیکھ لو..... میں بھی تو یہاں رہ رہی ہوں.....!!"

"چلو..... تم بتاؤ تو سہی.....!!"

"اچھا..... سنو..... یہاں آرام سے رہو..... کوئی مسئلہ نہیں ہے..... لیکن اس گھر کے پچھلے حصے کی طرف مت جانا.....!" دردانہ نے آخر بتا ہی دیا۔

سعدیہ کے ساتھ میں بھی چونک سا گیا تھا۔

"کیوں..... کیا ہوا ہے.....؟"

"ارے یار.....!" دردانہ بھنا اٹھی۔

"بس تمہیں اتنا بتا دیا..... یہی بہت ہے..... کبھی بھار اس حصے میں بھی آوازیں وغیرہ سنائی دیتی ہیں..... کچن میں برتنوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن ہوتا کچھ نہیں ہے.....!"

"لو..... اتنا کچھ ہوتا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ کچھ نہیں ہوتا..... نا بھئی..... میں تو اب گھر چلی جاؤں گی..... اتنا کر سکتی ہوں کہ صبح جلدی آ جاؤں..... اور بس.....!!"

''کیا گل ہوگئی ہو.....؟ کچھ نہیں ہوتا.....! اور پھر میں تمہیں رات کو الگ تو نہیں سلاؤں گی..... تم میرے ساتھ ہی سوؤ گی..... دیکھو نا..... میں ہٹی کٹی تمہارے سامنے تو موجود ہوں..... میرے گلے میں تو کوئی تعویذ بھی نہیں ہے..... تم کم از کم اس طرف سے بے فکر تو رہو.....!''

''کل تم بھی میرے ساتھ چلنا.....!!''

''کہاں.....؟''

''شاہ صاحب کے پاس..... وہ گھر کے لیے بھی کچھ دے دیں گے..... مسئلہ حل ہو جائے گا تمہارا.....!''

''آئیڈیا تو اچھا ہے.....!'' دردانہ نے سر ہلایا۔

''چلو..... اگر کل فرصت ہوئی تو تمہارے ساتھ ضرور چلیں گی.....!!''

''کیا واقعی یہاں کوئی اثر ہے.....؟'' سعدیہ نے پوچھا۔

''اتنا بڑا مکان ہم لوگوں کو اتنی کم قیمت میں مل گیا ہے..... کچھ تو ہوگا.....!!'' دردانہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

''اوہ.....'' سعدیہ کے منہ سے نکلا۔

ایک بار پھر اذہان اس طرف آنکلا اور ان کی باتیں پھر ختم ہوگئیں وہ اپنے روایتی انداز میں ایک بار پھر چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا..... اس کا جھکاؤ سعدیہ کی طرف زیادہ تھا..... لیکن وہ خود کو لیے دیے رکھے ہوئے تھی.....

اب یہ رونق اپنے اختتام کی طرف رواں دواں تھی..... مہمان رخصت ہو رہے تھے..... دردانہ اس وقت اس کے قریب ہی موجود تھی۔ دفعتاً اذہان نے اس سے کہا۔

''دادی.....! مجھے تم سے ایک کام ہے.....!''

''کیا.....؟'' اس نے غور سے اذہان کی طرف دیکھا۔

''کچھ بات کرنی ہے.....!'' وہ بولا۔

''میں رات کے وقت آؤں گا.....!''

''ارے.....!!'' دردانہ بڑی ادا سے بولی۔

''تم تو رات بھر جاگنے کی عادی ہو.....! تمہیں کیا فرق پڑے گا.....؟''

''لیکن..... سعدیہ میرے ساتھ ہوگی.....!'' اس نے بتایا۔

''وہ شاید جب سو چکی ہوگی.....!'' اذہان بولا۔

''میں اس کے چہرے پر تھکن کے آثار دیکھ رہا ہوں.....!''

''ہاں..... مجھے معلوم ہے کہ وہ رات کی نیند کی کافی کچی ہے..... لیکن اذہان..... کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے.....!''

''بچوں والی باتیں کر رہی ہو..... سب ہی تھکے ہوئے ہیں..... پڑ کر سو رہیں گے.....!!'' یہ کہہ کر اذہان خاموش ہو گیا تھا.....

یہ ساری گفتگو کافی رازداری سے ہو رہی تھی..... ساتھ ساتھ وہ مہمانوں سے بھی فارغ ہو رہے تھے..... اذہان پیش پیش تھا..... کیونکہ اس کی والدہ دردانہ کی خالہ تھیں کافی قریبی تعلقات تھے!!

بہرحال یہ ہنگامہ فرو ہوا تو سب نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا..... دردانہ کے بھائی کا نام ارسل تھا..... آج اس کی رسم مایوں تھی!!

دردانہ اور سعدیہ نے ایک کمرے کا رخ کیا..... جو دردانہ کا کمرہ تھا..... وہ دونوں کچھ دیر

تک باتیں کرتی رہیں..... پھر سعدیہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور جلد ہی اس کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے.....

دردانہ اب بھی بیٹھی ہوئی تھی..... میں اپنے اندرونی جذبے کو اب تک چھپائے ہوئے تھا..... ورنہ دردانہ کا دلکش وجود مجھے اس بات کے لیے مجبور کر رہا تھا کہ میں اسے ابھی اپنی آغوش میں لے لوں.....!!

لیکن ایک وجہ تو اذہان تھا کہ جس کی وجہ سے میں اب تک رکا ہوا تھا..... اور دوسری وجہ وہ عجیب سا احساس تھا، جو اب تک میرے ذہن سے چمٹا ہوا تھا!!

نہ جانے کیا ہے چینی تھی! کیسی خلش تھی.....! کہ جس نے مجھے گھیر رکھا تھا..... یہ خلش سعدیہ کے ساتھ ہی ساتھ میرے ذہن سے لپٹ کر اس گھر میں داخل ہوئی تھی.....

میں پھر کہوں گا کہ انسانوں کی صحبت میں رہ کر شاید میری کچھ صلاحیتیں متاثر ہوئی تھیں..... وگرنہ میں ضرور اس خلش کا کھوج لگا لیتا.....

دردانہ نے اب کمرے میں بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا تھا..... مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب گھر کے بیشتر حصے تاریکی میں ڈوب چکے تھے..... اکثر مکینوں کو نیند کی آغوش نے گھیر لیا تھا.....!!

پھر دردانہ کا انتظار ختم ہوا..... دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی..... دردانہ جھٹ سے دروازے کی طرف لپکی..... اس نے دروازہ کھولا اور اذہان جھٹ سے اندر آ گیا.....

اس نے فوراً ہی بیڈ کی طرف نگاہ ڈالی تھی، جہاں سعدیہ بے خبر سوئی ہوئی تھی.....!! دردانہ عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی.....

ادھر میں کشمکش میں تھا کہ پہلے اپنی خواہش کو پورا کروں..... یا پھر اذہان کے اس وقت آنے کا مقصد معلوم کروں..... بہرحال میں نے پھر خود کو باز رکھا اور وہیں رک کر ان دونوں کی باتیں سننے لگا.....

دردانہ کافی جذباتی کیفیت میں تھی..... اس نے دروازہ باقاعدہ لاک کیا تھا..... پھر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اذہان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا.....

''لیکن..... میں تم سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں.....!'' اذہان نہ جانے پریشان سا ہو گیا.....

''میں جانتی ہوں تمہاری باتوں کو.....'' وہ مسکرائی۔

''لیکن مجھے سعدیہ کے اٹھ جانے کا ڈر ہے.....!!''

''آؤ..... باہر چلتے ہیں.....!!'' اذہان نے تجویز پیش کی۔

''باہر کہاں.....؟'' دردانہ چونکی۔

''لان کی طرف..... وہاں کوئی نہیں آئے گا..... آرام سے بیٹھ کر بات ہو سکے گی.....!''

''ارے توبہ کرو.....!'' دردانہ جلدی سے بولی۔

''وہاں تو ڈیڈی نے دن میں جانے سے بھی منع کر رکھا ہے..... اور اب تو آدھی رات ہو چکی ہے.....!''

''کیوں..... ایسا کیا ہو گیا؟''

''اس طرف اثر ہے.....! اور ہے بھی کافی زبردست.....!!'' دردانہ سنجیدگی سے بولی۔

اذہان نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا تھا..... اسی وقت سعدیہ نے کروٹ بدلی۔

''ارے کیا کر رہے ہو..... وہ اٹھ جائے گی.....!'' دردانہ جھلا کر بولی۔

''تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو.....'' وہ آہستہ سے ہنسا۔

''تم اس زمانے میں اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میں اس وقت کافی زور سے ہنستا، لیکن تمہاری دوست نہ اٹھ جائے.....!!''

''رات اتنی ہو چکی ہے کہ میں اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی..... ورنہ آوازیں تو میں نے خود سنی ہیں اور.....!''

''ارے چھوڑو یار.....!'' اذہان نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ کھینچا۔

''چلو ادھر ہی چلتے ہیں.....!''

پھر دردانہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ باہر نکل آئی..... چاروں طرف سناٹے کا راج تھا..... اور نیم تاریکی نے اس سناٹے کو مزید مستحکم کر دیا تھا.....!! وہ دونوں چلتے ہوئے عقبی حصے کی طرف آ گئے.....

یہ ایک وسیع باغیچہ تھا..... جس میں گھاس اور درخت کافی اجڑی ہوئی حالت میں موجود تھے..... دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے..... یہاں کسی قدر روشنی تھی..... کیونکہ سامنے موجود دیوار کے اوپر روشنی کا ہالہ موجود تھا.....!!

عین اسی وقت میں نے ایک درخت کے عقب سے سایہ سا نکلتے ہوئے دیکھا، اور میں فوراً ہی محتاط سا ہو کر ایک طرف ہو گیا..... ابھی تک وہ واضح نہیں ہوا تھا.....

اذہان اس وقت دردانہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا..... دوسری طرف دردانہ مدہوش سی ہو کر اس سے لپٹی جا رہی تھی..... میں نے اس وقت کچھ اور سوچا تھا..... لیکن اس سائے نے مجھے موقع نہیں دیا..... میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو چکی تھی.....

پھر میں بری طرح چونکا تھا..... اور اس سے پہلے کہ اس سائے کی نظر مجھ پر پڑتی، یا وہ مجھے محسوس کرتا..... میں وہاں سے قدرے دور ہٹ گیا..... ویسے مجھے اندازہ تھا کہ اسے میرے وجود کا کسی حد تک علم ہو چکا تھا..... کیونکہ اب وہ رک کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا..... لیکن اتنی دیر میں، میں نے اپنے گرد ایک خاص حصار کھینچ لیا تھا..... جو ایک محفل میں خاشاب نے بتایا تھا اور اتفاق سے وہ میرے ذہن میں محفوظ ہو چکا تھا.....

سایہ ایک بار پھر آگے بڑھ چکا تھا..... اس کا رخ اب دردانہ کے کمرے کی طرف تھا، جہاں سعدیہ اکیلی بے خبر سو رہی تھی..... اب یہ معاملہ کافی حد تک میری سمجھ میں آ چکا تھا..... پھر بھی ابھی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کا متمنی تھا۔

سائے نے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھولا تھا..... اور پھر وہ اندر داخل ہو گیا..... مجھے بھی اندر ہی جانا تھا، لیکن مجھے قدرے توقف کی ضرورت تھی..... چنانچہ میں نے بے چینی سے یہ تھوڑا سا وقت گزارا.....

پھر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں بھی اندر داخل ہو گیا..... پھر یہ دیکھ کر میرے غصے کی انتہا نہ رہی کہ سائے نے بڑی عجلت میں اپنا کام دکھایا تھا اور سعدیہ کے جسم کا زیریں حصہ لباس کی قید سے آزاد ہو چکا تھا.....

''یہ تو کیا کر رہا ہے.....؟'' میں دھاڑا۔

یہ ہم جنوں کی مخصوص زبان تھی..... اور اس کی یہ خوبی تھی کہ انسانی سماعت اسے سن نہیں سکتی

تھی..... ورنہ تو سعدیہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی.....!

سایہ اچھل پڑا..... اس نے فوراً ہی گھوم کر مجھے دیکھا..... اس کی آنکھوں میں بھی حیرت کے دیے جل اٹھے تھے..... لیکن پھر فوراً ہی وہ خونخوار لہجے میں بولا۔

''تو کون ہے.....؟''

''کیا تو اندھا ہے.....؟ میں تیرا ہی ہم جنس ہوں.....!'' میں نے کہا۔

''ہاں..... وہ تو میں دیکھ رہا ہوں.....!'' اس کا وہی لہجہ تھا۔

''لیکن تو کس قبیلے سے ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے.....؟''

''کیا میں تجھے جواب دہ ہوں.....؟'' میں نے تنک کر کہا۔

یہ سن کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''تجھے جواب تو دینا ہی پڑے گا..... کیونکہ میرا نام قرامطبل ہے اور میں زنبہ سے تعلق رکھتا ہوں.....!!''

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا..... کیونکہ زنبہ قبیلے سے کون واقف نہیں تھا.....؟ یہ ایک شیطانی گروہ تھا..... جو ایسی عیاریوں اور سفاکیوں میں دور دور تک مشہور تھا..... مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر وہ ہنسا اور بولا۔

''اب جا..... اور اپنا راستہ لے.....! نہ جانے کیوں میں تجھے بخش رہا ہوں..... ورنہ یہیں تجھے جلا کر بھسم کر دیتا..... جا چلا جا.....!!''

یہ کہہ کر وہ لاپروائی سے مڑا اور اس نے سعدیہ کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے، میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے تھامے اور ایک جھٹکے سے اسے بیڈ سے دور کر دیا.....

''تو نے اپنی موت کو آواز دی ہے.....!!'' وہ غرایا.....

اگلے ہی لمحے وہ مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا..... اس نے آگے بڑھ کر مجھے زوردار انداز میں دھکا دیا..... نتیجہ یہ کہ میں زمین بوس ہو چکا تھا.....

دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر سوار ہو چکا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے پورے وجود میں کسی نے آگ بھر دی ہو..... پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا.....

☆.....☆.....☆

مجھے ہوش آیا، تو سب سے پہلے مجھے یہ احساس ہوا کہ میرا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے..... شدید تکلیف تھی..... جسے برداشت کرنا شاید میری قوت سے باہر تھا۔

اسی عالم میں میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی، تو کچھ مانوس سا ماحول دکھائی دیا..... لیکن نہ یہ کمرہ تھا اور نہ ہی وہ گھر..... یہ کوئی اور ہی جگہ تھی..... جس سے میں کافی حد تک مانوس تھا۔

اور پھر مجھے اپنے اس احساس کو تقویت مل گئی..... کیونکہ مجھ سے تھوڑا پرے ایک جنی موجود تھی..... جو کافی کم عمر تھی..... اس نے مجھے ہوش میں آتے دیکھا تو فوراً ہی میری طرف لپکی۔

''تم..... تم کون ہو.....؟'' میری آواز خود مجھے ہی اجنبی لگ رہی تھی۔

''اب کیا حال ہے تمہارا؟'' وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''بہت برا..... مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میں کہاں ہوں.....؟''

''میں راعنا ہوں!'' وہ مسکرائی۔

''اور میں تمہیں جانتی ہوں.....''

یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔

''تم مجھے کیسے جانتی ہو.....؟''

''تم رباظ ہونا.....؟''

''ہاں.....!''

''اب یہ بتاؤ کہ کیا تکلیف میں کچھ کمی ہوئی.....؟''

''نہیں.....'' میرے منہ سے نکلا۔

''فکر مت کرو..... ہو جائے گی.....! میں ایک بار پھر آپ صحت مل دیتی ہوں.....!''

''اف..... میرا جسم جل رہا ہے.....!'' میں کراہا۔

''ہاں..... تم پر حملہ ہی ایسا ہوا تھا..... مجھے بابا نے بتایا تھا.....!''

''بابا کون.....؟''

''میرے باپ..... اور کون ہو گا.....!'' وہ بولی۔

''کیا نام ہے تمہارے باپ کا.....!''

''ابھی آتے ہوں گے..... خود ہی دیکھ لینا.....!'' اس نے کہا۔

پھر اس نے کسی طرف سے ایک طشتری اٹھائی تھی..... تب مجھے احساس ہوا کہ میرا وجود اس کے سامنے بالکل برہنہ ہے..... میں نے سمٹنا چاہا..... لیکن وہ سر ہلا کر بولی۔

''کیا ہوا.....؟''

''کک..... کچھ نہیں.....!'' میں نے اتنا ہی کہا۔ پھر اپنے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر ہی اس نے میرے جسم کے ایک ایک حصے پر کوئی سیال ملا تھا..... حیرت انگیز طور پر جہاں بھی وہ سیال پڑ رہا تھا، مجھے ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا..... اور پھر مجھ میں لگی ہوئی آگ خود بخود بجھتی چلی گئی..... کتنا سکون ملا تھا.....!

اور پھر قدموں کی آہٹ ہوئی..... راعنا اٹھ کر ایک طرف ہو گئی..... اور کوئی اندر داخل ہوا، پھر جیسے ہی میری نظر اس پر پڑی، میں بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بوڑھا خاشاب تھا.....

''لیٹے رہو رباظ.....!!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ابھی تم آرام کرو.....!!''

''تمہیں دیکھ کر میں بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں بابا خاشاب.....!'' میں نے عقیدت سے کہا۔ پھر میں نے پوچھا۔

''لیکن میں تو اس گھر میں تھا..... یہاں کیسے پہنچ گیا.....؟ وہ لڑکی..... نہ جانے اس آدم زادی کے ساتھ اس شیطان صفت نے کیا کیا ہو گا.....''

''فی الحال تو اس کی بھی جان بخشی ہو گئی ہے اور..... تمہاری بھی.....!'' خاشاب مسکرایا۔

''میں بروقت وہاں پہنچ گیا ورنہ وہ..... تمہیں ہلاک کر چکا ہوتا..... بہرحال میں نے کسی حد تک اسے گھائل کر کے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا.....!''

یہ سن کر میں سوچ میں ڈوب گیا..... خاشاب غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا..... پھر وہی بولا تھا۔

''دراصل..... میری وجہ سے ہی تم اپنے قبیلے سے نکالے گئے ہو..... اس لیے میرا بھی فرض ہے کہ میں تم پر نظر رکھوں اور تمہارا خیال رکھنے کی کوشش کروں..... مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ سردار سے بات کرنے کا یہ نتیجہ نکلے گا..... اس نے میری بات کو رد تو نہیں کیا، البتہ تمہیں بھی وہ سزا دینے سے نہ چوکا.....!!''

''لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے بابا خاشاب.....!'' میں نے کہا۔

''کیونکہ میری خواہش نے یہ رنگ دکھایا

ہے..... بہرحال اب فی الحال تم یہاں رہو..... تمہاری خدمت کے لیے راعنا موجود ہے..... میں یہاں آتا رہوں گا اور تمہارا حال پوچھتا رہوں گا.....''

''لیکن بابا خاشاب..... ! میں اس لڑکی کے لیے فکرمند ہوں..... ہوسکتا ہے کہ تمہیں بھی یہ بات بری لگے..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہا ہوں.....!''

''میں نے ہرگز برا نہیں مانا.....!'' وہ مسکرایا۔

''کیونکہ بشر نہ صرف رب کی مخلوق ہے، بلکہ وہ اشرف المخلوقات بھی ہے..... اگر ہم اس سے خار رکھتے ہیں، یا پرخاش رکھتے ہیں، تو یہ ہماری نادانی ہے..... اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کائنات میں ہر کوئی اپنی اجارہ داری جمانے کے چکر میں رہتا ہے..... لیکن جو جہاں اور جس منصب پر فائز ہے، وہ منصب کوئی اس سے نہیں چھین سکتا..... یہ قانونِ قدرت ہے..... اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا.....!! اب اگر میں جن ہو کر خود پر یہ گھمنڈ کروں کہ مجھ میں مافوق الفطرت صلاحیتیں موجود ہیں..... میں انسانی آنکھ سے اوجھل ہوں..... میں پلک جھپکتے میں ادھر سے ادھر جا سکتا ہوں..... جس انسان پر چاہوں اس پر اپنا قبضہ جما سکتا ہوں..... تو یہ غلط ہے..... انسان بہرحال انسان ہے..... اس کی فطرت میں سادگی ہے..... لیکن اس کے باوجود اسے فطرت کے لحاظ سے ہم پر سبقت حاصل ہے..... اب اس سے نفرت کرنا، یا حسد کرنا ہماری کم ظرفی ہے.....!! بہرحال چھوڑو ان باتوں کو..... اب تمہارا کیا حال ہے.....؟''

''میں..... اب خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں.....!''

''وہ شیطان میرے ہاتھوں بچ گیا..... ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ ضرور اس لڑکی کی طرف رجوع کرے گا.....!! لیکن اس کا حصار صرف اسی جگہ ہوسکتا ہے، جہاں وہ لڑکی اس وقت موجود ہے..... اور اگر اس جگہ اس نے لڑکی کے وجود میں خود کو ضم کرلیا، تو پھر اسے نکالنا مشکل ہوگا.....!!''

''ہوں..... تو پھر مجھے وہاں جانا ہوگا.....!'' میں بے تابی سے بولا۔

''نہ جانے کب اس کی واپسی ہو جائے.....!''

''لیکن تم وہاں جا کر کیا کرسکو گے..... اگر وہ واپس آ بھی گیا، تو کیا تم اس کا مقابلہ کر پاؤ گے.....؟''

''میں..... میں کوشش کروں گا.....!''

''اچھا..... ذرا ٹھہرو.....!'' اس نے سر ہلایا۔

''میں ابھی تو جا رہا ہوں..... لیکن رات گئے میری واپسی ہوگی..... میں اس وقت تمہیں کچھ چیزیں بتا دوں گا..... تم ان پر عمل کرو گے تو شیطان کے شر سے محفوظ رہو گے..... پھر تم کل روانہ ہو جانا..... قراطبل ابھی خود گھائل ہے..... میرا خیال ہے کہ اتنی جلدی اس کی واپسی نہیں ہوگی.....!''

یہ کہہ کر خاشاب اٹھ کھڑا ہوا..... میں نے پھر خاموشی اختیار کرلی..... اس کے چلے جانے کے بعد ایک بار پھر راعنا میرے قریب آ گئی..... وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی..... اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سا ہی تاثر دکھائی دیا۔ آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کیا انسانوں سے تمہیں کچھ زیادہ ہی رغبت ہے.....؟''

''لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے.....!'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن اس کی وجہ؟'' وہ بولی۔

''کیا ہماری قوم میں کوئی کمی ہے.....؟''

''نہیں..... ایسا تو نہیں ہے.....!'' میں جلدی سے بولا۔

''میں خود بھی تو اجناس میں سے ہوں.....!''

''تو پھر..... تم مجھے دیکھو.....!'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا مجھ میں کچھ کمی ہے.....؟''

یہ سن کر میں چونک اٹھا..... وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں..... میں سمجھا نہیں.....!''

وہ مسکرائی اور بولی۔

''میں بابا خاشاب کی بیٹی ہوں.....! اپنے بابا کے عہدے کی وجہ سے میرا اکثر اس قسم کے لوگوں سے سامنا رہتا ہے..... کئی واقعات میرے مشاہدے سے گزرتے ہیں..... اور میں دیکھتی ہوں کہ ہمارے جنّہ انسانوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی لڑکیوں کی طرف راغب ہوتے ہیں..... اب آج تم میرے سامنے موجود ہو، تو میں تم سے ہی یہ سوال کر رہی ہوں کہ کیا ہم میں کوئی کمی رہ گئی ہے.....؟ ان میں کیا ایسا ہے، جو ہم میں نہیں ہے.....!!''

میں لاجواب ہو کر رہ گیا تھا..... ہم دونوں اس وقت وہاں تنہا تھے..... وہ میرے اور بھی قریب آ گئی..... اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے دمک رہا تھا..... لیکن میں بخوبی واقف تھا کہ یہ جذبات اس کی انا اور خودی کے تھے..... پھر ان ہی کے تحت وہ پوری طرح میرے سامنے آ کھڑی ہوئی.....

وہ میرے سامنے اب اس حالت میں موجود تھی کہ میں اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو دیکھ سکتا تھا..... اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''بتاؤ مجھے..... آخر اس لڑکی میں ایسی کیا خوبی ہے کہ جو مجھ میں نہیں.....!!''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے میں ہکا بکا تھا۔

''بولو..... جواب دو.....'' اس کی آواز بلند ہوگئی۔

''ابھی کوئی آدم زادی تمہارے سامنے اس حالت میں موجود ہوتی تو شاید تم اس پر مر بھکوں کی طرح ٹوٹ پڑتے..... لیکن..... میں چونکہ ایک جنی ہوں..... اس لیے شاید میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی.....!''

''ایسی بات نہیں ہے راعنا.....!'' میں جلدی سے بولا۔

''تم بابا خاشاب کی بیٹی ہو..... اس لیے میں تمہارے بارے میں غلط سوچنا بھی گوارا نہیں کرسکتا، کچھ اور تو دور کی بات ہے.....!''

''اگر میں اس کی بیٹی ہوں، تو کیا یہ کوئی جرم ہے.....؟ طازلہ نے بھی یہی بہانہ بنا کر مجھ سے جان چھڑائی تھی..... اور..... میں آج تک اس کی محبت کی آگ میں جل رہی ہوں.....!!''

''طازلہ.....! یہ..... کون ہے.....؟''

''ہمارے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے.....!'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''میں نے اسے چاہا، اس سے محبت کی..... اس کے لیے اپنی آنکھوں کے پردے بچھا

دیے..... اس پر اپنا دل و جان فرش کر دیا لیکن وہ بھی آدم زادوں کی دنیا میں کھو گیا..... اب تم مجھے بتاؤ نا کہ مجھ میں کیا کمی ہے..... تم دیکھو میری طرف..... غور سے دیکھو.....!!''

اس نے میری خدمت کی تھی..... رات دن میرا خیال رکھا تھا اس لیے اس کا دل توڑنا میرے لیے گوارا نہیں تھا..... لیکن خاشاب کی ذات کا خیال رکھتے ہوئے میں نے ایک حد کے اندر رہتے ہوئے اس کی خوبصورتی کو داد دی..... اسے سراہا..... !پھر میں نے کہا۔

''تم..... تم بہت اچھی ہو راعنا..... ! بہت اچھی.....!!''

''مجھے لگ رہا ہے کہ یہ بات بناوٹی ہے..... تم صرف میرا دل رکھ رہے ہو.....!''

''یہ تمہارا وہم ہے..... ایسا کچھ نہیں ہے..... اگر طازلہ نے تمہیں دھوکا دیا ہے یا تمہاری محبت کو نظر انداز کیا ہے، تو یہ اس کی بدقسمتی ہے..... میں اپنے ایک دوست قالان سے اس سلسلے میں بات کروں گا..... پھر ہم دونوں مل کر تمہارے طازلہ کا پتا لگائیں گے میں خود اس سے بات کروں گا.....!!''

راعنا نے کوئی جواب نہیں دیا..... وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کو بابا خاشاب کی واپسی ہوئی تھی..... اس نے آتے ہی میرا حال چال معلوم کیا تھا۔ پھر میرے تشفی بخش جواب کے بعد اس نے مجھے کچھ عمل کرنے کے لیے بتائے..... پھر میرے گرد ایک خاص حصار کھینچنے کے بعد وہ بولا۔

''تم کل وہاں چلے جانا..... مجھے پوری امید ہے کہ اس حصار کے بعد اور یہ عمل جو میں نے تمہیں بتائے ہیں، تم انہیں اپنے ورد میں رکھو گے تو تم شیطانی طاقتوں سے محفوظ رہو گے..... قرابلس اس لڑکی پر بری طرح عاشق ہو چکا ہے..... اور مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ اس پر ضرور قابو پانے کی اور اسے اپنے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرے گا..... اس وقت یہ چیزیں تمہاری مدد کریں گی..... اب مجھے ایک بات بتاؤ.....!''

''کہو بابا خاشاب.....!'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''کیا تم اپنے قبیلے میں واپس جانا چاہتے ہو.....!''

یہ سوال کافی خلاف توقع تھا..... میں فوری طور پر اس کا جواب دینے سے قاصر رہا۔

''بولو..... خاموش کیوں ہو.....؟''

''نہیں.....!'' میں نے طویل سانس لی۔

''جب مجھے وہاں سے نکال دیا گیا ہے تو پھر میں وہاں واپس جا کر کیا کروں گا..... کیونکہ اگر میں نے ایسا کر بھی لیا، تو نہ تو وہ بات رہے گی اور نہ ہی میرے شناسا مجھے عزت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے۔''

''ہوں..... تو پھر کیا اسی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہو گے.....؟''

''اب اگر یہی نصیب ہے، تو پھر یہی سہی.....!!''

''تمہارا صبر واقعی قابل تعریف ہے..... خیر..... فی الحال تم اس لڑکی کا معاملہ دیکھو..... اس کے بعد تم ایک آدم زاد سے ضرور ملنا!!''

''کس سے.....؟''

''شاہ غیاث الدین سے.....!!''

''یہ کون ہے.....؟''

''ایک انسان ہی ہے.....!'' وہ مسکرایا۔

''ان کے پاس پہنچ جاؤ، تو میرا حوالہ ضرور دینا.....!! تمہارے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے.....!!''

''اچھا.....لیکن وہ کہاں رہتا ہے.....؟ کون ہے.....؟ میں اس سے کیسے ملوں گا.....؟''

''اس کی تم فکر مت کرو..... ! جب تم اس سے ملنے کی خواہش کرو گے تو خود بخود راستے بن جائیں گے اور تم اس کے سامنے پہنچ جاؤ گے.....!! اب تم آرام کرو..... صبح روانہ ہونا ہے.....!! ہو سکتا ہے کہ جب تم یہاں سے نکلو تو میری تم سے ملاقات نہ ہو سکے.....!! بہرحال زندگی رہی تو پھر ملیں گے..... کیونکہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے.....ہاں..... یہ حقیقت ہے.....اٹل حقیقت.....!!''

دوسرے دن میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا..... کیونکہ یہ وہ جگہ نہیں تھی، جہاں خاشاب اور راعنا سے ملاقات ہوئی تھی..... اور اب میں جہاں تھا یہ یقیناً دردانہ نامی لڑکی کا ہی گھر تھا.....

میں اس وقت باغیچے میں ہی موجود تھا..... میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی..... کوئی بھی موجود نہیں تھا..... اور ویسے بھی مکان کے اس حصے کا کوئی رخ نہیں کرتا تھا.....

میں دردانہ کے کمرے کی طرف آ گیا..... یہاں دونوں موجود تھیں..... دردانہ کا چہرہ کچھ ستایا ہوا سا تھا..... خود سعدیہ بھی کھوئی کھوئی سی تھی۔

''مجھے ہرگز امید نہیں تھی.....'' دردانہ کہہ رہی تھی.....'' اس نے تمہیں کیا دیکھ لیا..... لٹو ہی ہو گیا.....! اف..... ان لڑکوں کی یہی خصلت ہوتی ہے.....''

''اگر..... تم کہو تو میں چلی جاؤں.....؟''

سعدیہ بول اٹھی۔

دردانہ نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بھی میری جان جلاؤ..... ایک ہی کیا کم ہے.....! تمہیں تو میں کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتی..... چاہے کچھ ہو جائے.....''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا دردانہ.....!'' وہ بولی: ''میں دوستی ختم نہیں کر رہی..... میں تو فی الحال یہاں سے ہٹ جانے کی بات کر رہی ہوں.....!''

''ہوں..... پرسوں بھائی کی شادی ہے.....'' اس نے سر ہلایا: ''کیا میں تمہارے بغیر اس میں شرکت کروں گی..... لوگ کیا سوچیں گے..... اور پھر سب سے بڑھ کر امی اور ابو جان کو کیا جواب دوں گی.....؟''

''کہہ دینا کہ میری طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی..... البتہ ہال میں ضرور آ جاؤں گی.....!''

''نہیں بھئی.....!'' دردانہ نے نفی میں سر ہلایا: ''اس موقع پر مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہیں ہو گی.....!!''

''یار دردانہ.....!'' سعدیہ کے لہجے میں الجھن سی تھی: ''کل رات بھی مجھے عجیب و غریب خواب دکھائی دیئے ہیں..... نہ جانے کیا بات ہے..... ایسا کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ.....!!''

''ارے ہوتا ہے کبھی کبھی.....!'' وہ لاپروائی سے بولی: میں رات کے وقت تمہارے قریب تو ہوتی ہوں..... ڈرنے والی کیا بات ہے..... مجھے لگتا ہے کہ تم اس گھر کے پچھلے حصے کے متعلق کچھ زیادہ ہی سوچ رہی ہو..... ارے بھئی اپنا دھیان بٹاؤ..... خوش رہو..... کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ..... او ہاں..... آج میں نے گانوں کا پروگرام رکھا ہے..... بڑا مزا آئے گا.....!!''

''ہاں..... وہ تو ہے.....!!! اچھا پھر اذہان کے

بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......!'' سعدیہ نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''چولہے میں ڈلواسے...... اب میرے سامنے اس کا نام بھی مت لینا......!'' وہ بھنا کر بولی۔

''کیوں بھئی......؟''

''میں نے کہانا کہ چھوڑو اسے......!''

''نہیں پہلے مجھے اس کی وجہ بتاؤ......!''

''اس نے اپنی اوقات دکھا دی ہے...... مجھے تو پوری امید تھی کہ جلد ہی اس کے گھر سے میرے لئے رشتہ آئے گا...... لیکن پرسوں رات کو وہ خبیث مجھ سے تمہارے متعلق پوچھ رہا تھا...... کمینہ......!!''

''میں اسی لئے تو تم سے کہہ رہی ہوں کہ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی...... البتہ تمہاری کیفیت سے اسے میں آگاہ کرنے کی کوشش کروں گی...... میں اسے بتا دوں گی کہ تم اسے دل سے چاہتی ہو......!''

''کوئی ضرورت نہیں ہے......!'' دردانہ بولی: ''اس کی اصلیت میرے سامنے آچکی ہے...... وہ سراسر فلرٹ ہے...... دھوکے باز ہے......!! وہ جانتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں......''

''پھر بھی میں......''

''یار ختم کرو...... میں اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی......!'' دردانہ بیزاری سے بولی۔

سعدیہ خاموش ہو گئی تھی...... لیکن اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ دردانہ کا یہ رویہ اسے اچھا نہیں لگا تھا...... بہر حال اب میں اذہان کے بارے میں غور کر رہا تھا......

مجھے ایک شرارت سی سوجھی...... چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ رات گئے اس کے کمرے کا رخ ضرور کر دوں گا فی الحال تو مجھے قراطبل کا انتظار تھا......

لیکن مجھے شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا...... قراطبل نہیں آیا تھا...... چنانچہ رات کے وقت میں نے اپنے منصوبے کے مطابق اذہان کے کمرے کا رخ کیا...... آج وہ مجھے زیادہ اچھلتا کودتا ہوا دکھائی نہیں دیا تھا...... شاید دردانہ نے اسے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی تھی......!

اس وقت بھی وہ ایک کرسی پر گم صم سی حالت میں بیٹھا ہوا تھا...... میں نے بھاری سی آواز میں کہا: ''اے نوجوان......! میری بات سن......!''

وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا...... لیکن وہاں اسے کون نظر آتا...... چنانچہ میں نے پھر کہا: ''ادھر ادھر دیکھ کر اپنی آنکھوں کی بینائی ضائع مت کر میں قراطبل کا بھوت ہوں...... تجھے نظر نہیں آؤں گا...... تیری آنکھیں نکال لوں گا...... جو تجھے ملی ہے، تو بس اس پر قناعت کر...... تیری صحت کے حساب سے تیرے لئے وہی کافی ہے...... سمجھ گیا......؟''

اس کی حیرت کا کیا پوچھنا...... یوں لگ رہا تھا جیسے ایک سمندر اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہو...... ساتھ ہی ساتھ خوف اور دہشت میں اس کے چہرے سے مترشح تھی......!!

''تت...... تت...... تم ہو کون...... سامنے تو آؤ......!'' وہ کسی قدر جی کڑا کر کے بولا۔

مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا...... دل چاہا کہ اس کے تھپڑ رسید کر دوں...... میری آواز سے کانپ رہا تھا۔ اگر میں ظاہر ہو جاتا تو اس کا کیا حال ہوتا......!!

''بکواس مت کر......!'' میں غرایا: ''سامنے آنے پر تو تیرا دم ہی خشک ہو جائے گا...... تو دردانہ سے جا کر معافی مانگ اور توبہ کر کہ آئندہ سعدیہ کا نام بھی نہ لے گا...... جلدی بول......!!''

''ہاں...... نہیں لوں گا......!'' وہ ہونٹوں پر

زبان پھیر کر بولا۔

''اٹھک بیٹھک کر...... اور کان پکڑ کر مرغا بن جا...... جلدی کر......!!'' میں گرجا۔

مرتا کیا نہ کرتا...... اسے میری ہدایات پر عمل کرنا پڑا...... پہلے اس نے اٹھک بیٹھک کی...... اس کے بعد مرغا بنا ہوا تھا کہ اچانک ہی بڑی آہستگی سے دروازہ کھلا اور...... کوئی اندر آ گیا......

☆......☆......☆

یہ دردانہ تھی...... میں خود بھی چونک اٹھا تھا...... جبکہ اذہان اب بھی مرغا ہی بنا بیٹھا تھا...... دردانہ نے اسے دیکھا تو حیرت کے مارے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا......

''یہ...... یہ تم کیا کر رہے ہو......؟'' اس کی آواز حیرت زدہ تھی۔

اذہان اچھل کر کھڑا ہو گیا...... وہ دردانہ کو سامنے دیکھ کر سٹ پٹا گیا تھا...... پھر اس نے چاروں طرف دیکھا تھا:

''میں پوچھ رہی ہوں یہ تم کیا کر رہے تھے......؟'' دردانہ اب بھی حیران تھی...... پھر اس نے چاروں طرف دیکھا تھا:

''میں پوچھ رہی ہوں یہ تم کیا کر رہے تھے......؟'' دردانہ اب بھی حیران تھی...... اور اسے تیز نظروں سے گھور رہی تھی۔

''میں...... میں تو......'' وہ بولتے بولتے رک گیا...... پھر اس نے دوبارہ چور نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا تھا...... دفعتاً وہ ہنس پڑا اور بولا: ''ارے...... یہ تو میری...... عادت ہے......!!''

''عادت......؟'' دردانہ بولی۔

''مذاق...... مذاق کر رہا ہوں...... دراصل میں پریکٹس کر رہا تھا......!!''

''کس چیز کی پریکٹس......؟''

''میں...... میں تم سے بہت شرمندہ ہوں...... میں نے تو تم سے مذاق کیا تھا اور تم سنجیدہ ہو گئیں...... میں اس مذاق کے لئے تم سے...... معافی مانگنے کی پریکٹس کر رہا تھا...... میں ابھی تمہارے پاس آنے ہی والا تھا...... پھر میں تمہارے سامنے اٹھک بیٹھک کرتا...... کان پکڑتا اور مرغا بنتا...... تم تو خود ہی ادھر آ گئیں......!''

میں اس کی چالاکی پر اش اش کر اٹھا...... خوب بات بنائی تھی اس نے...... بروقت اپنی عقل کا استعمال کیا تھا...... میں نے بھی اب چپ سادھ لی تھی......

''تم باتیں بنانے میں نمبرون ہو......!'' دردانہ بولی: ''سچ بتاؤ...... ابھی کیا کر رہے تھے......؟''

''میں...... تم سے جھوٹ بول کر کیا کروں گا......!'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''ہوں...... لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ نیک خیال کیوں آیا تمہارے ذہن میں......؟''

''بس دردانہ......! میں واقعی شرمندہ ہوں...... اور...... اور میں اب تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کروں گا......!''

''مجھے تم پر بالکل بھروسہ نہیں ہے......'' دردانہ کی آواز بھرا گئی: ''میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی ہوں...... ورنہ تم نے جو حرکت کی تھی...... اس کے بعد میں نے طے کر لیا تھا کہ تم سے بات بھی نہ کروں گی......!!''

''ارے ارے...... ایسا غضب مت کرنا...... وہ گھبرا گیا: ''اب تم ہی تو بچی ہو...... مم میرا مطلب یہ ہے کہ ایک تم ہی تو ہو میری زندگی میں...... اور...... اور کون ہے......؟''

میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی...... بڑا

ہی مکار لڑکا تھا..... عین اسی وقت مجھے سعدیہ کا خیال آیا اور میں چونک اٹھا..... دردانہ یہاں باتیں بگھار رہی تھی دور وہاں سعدیہ اکیلی ہوگی.....!!

قراطبل میرے ذہن میں گھومنے لگا..... اور پھر میں جلدی سے دوسرے کمرے کی طرف لپکا..... اور پھر جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا، دھک سے رہ گیا.....!!

☆.....☆.....☆

سعدیہ بستر پر دوزانو بیٹھی ہوئی جھوم رہی تھی..... اس کے لمبے لمبے بال پریشان ہو کر چہرے پر بکھرے ہوئے تھے..... میری تھوڑی سی غفلت سے قراطبل نے فائدہ اٹھایا تھا اور اب وہ سعدیہ پر حاوی ہو چکا تھا۔

مجھے اس نے نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ دیکھ بھی لیا تھا..... کیونکہ عین اسی وقت سعدیہ کے حلق سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور وہ بولی:

"آؤ ریاظ..... آؤ.....!! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا.....!!"

"اگر تمہیں میرا انتظار تھا، تو پھر رکنا تھا..... تم نے اس لڑکی پر کیوں قبضہ کیا.....؟"

یہ سن کر وہ زور سے ہنسا:

"اب میں اتنا نادان نہیں ہوں..... میں جانتا ہوں کہ تیرے گرد اب حفاظتی حصار قائم ہے..... اور ہو سکتا ہے کہ میں اب تجھ سے شکست کھا جاؤں..... لیکن اب یہ لڑکی میرا دفاع کرے گی..... اور اب میں تیری بے بسی کا تماشہ دیکھوں گا.....!! ہاہا..... ہاہا.....!!"

اس کی ہنسی ایک بار پھر میرے کانوں میں زہر گھولنے لگی۔ میں غصے کے عالم میں بولا:

"صاف صاف کہو کہ تم کم بخت ہو..... تم میں مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے..... وگرنہ تم گھٹیا حرکت ہرگز نہ کرتے..... اگر مقابلہ کرنا ہے تو اس آدم زادی کو ہٹا کر سامنے آؤ.....!!"

"اب میں اسے اسی وقت چھوڑ سکتا ہوں، جب یہ مر جائے گی..... اس سے پہلے کسی صورت میں ایسا ممکن نہیں ہے....." اس نے پختہ لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بزدل ہو..... ڈرپوک ہو.....!"

"بکتے رہو..... میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا.....!" وہ لاپروائی سے بولی تھی.....

اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ قراطبل کی آواز تھی، جو سعدیہ کے منہ سے نکل رہی تھی.....

"اب تم جاؤ..... اور یہاں سے دفع ہو جاؤ..... کیونکہ اس پر اب میرا قبضہ ہو چکا ہے..... یہ اب صرف میری ہے..... صرف اور صرف میری.....!!"

میں اب شکستے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا..... وہ واقعی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی..... جب تک قراطبل اس کے وجود سے باہر نہ آتا..... میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ دوسری صورت میں سعدیہ کی جان کو خطرہ تھا.....!!

میں نے تذبذب کے عالم میں اس کی طرف دیکھا، اس نے ایک بار پھر فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا..... اور پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور دردانہ کمرے میں داخل ہوئی۔

اور پھر جیسے ہی سعدیہ پر اس کی نظر پڑی، وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑی..... کیونکہ وہ اب بیڈ پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی..... اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر لٹکے ہوئے تھے..... اور لمبے لمبے بال سینے تک آئے ہوئے تھے..... دردانہ کے منہ سے نکلا:

"سعدیہ..... سعدیہ.....!!"

لیکن یہ تو میں جانتا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے.....

البتہ اس نے بڑے غضب ناک انداز میں ضرور دیکھا تھا..... اس کی آنکھوں کی جگہ دیکھتے ہوئے انگارے رکھے ہوئے تھے.....!!

اسے اس حال میں دیکھ کر اب دردانہ خود پر قابو نہ رکھ سکی..... اور حواس باختہ ہو کر کمرے سے نکل بھاگی..... اس کے باہر نکلتے ہی ایک بار پھر سعدیہ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کیا: "اب تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے علیحدہ نہیں کر سکتی..... ہاں.....!!

☆.....☆.....☆

تھوڑی دیر میں ہی گھر کے افراد اس کمرے میں جمع ہو گئے اور ایک ہجوم سا لگ گیا..... لیکن اس وقت تک سعدیہ پلنگ پر بے سدھ ہو چکی تھی..... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سوئی ہوئی ہو.....

کمرے میں داخل ہو کر دردانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا..... پھر وہ اپنے گھر والوں کی شکلیں تکنے لگی تھی..... "تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا.....!" یہ دردانہ کا باپ تھا: "سعدیہ تو سو رہی ہے.....!!"

"نہیں ابو.....!" دردانہ گھبراہٹ کے عالم میں بولی: "میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے عجیب سے حال میں دیکھا تھا..... اف.....!!"

"خیر.....!" انہوں نے طویل سانس لی: "فی الحال تو یہ سو رہی ہے..... اب تم بھی سو رہو..... صبح دیکھتے ہیں.....!"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی بیگم کو آنکھ سے اشارہ کیا اور پھر وہ لوگ باہر نکل گئے..... اذہان ان میں نظر نہیں آ رہا تھا..... وہ شاید اپنے کمرے سے نکلا ہی نہیں تھا.....!!

ان لوگوں کے جانے کے بعد دردانہ کافی دیر تک پٹڑ پر بیٹھ کر سعدیہ کی طرف دیکھتی رہی..... جو اب واقعی دوسری طرف کروٹ لے کر بے سدھ ہو کر سو رہی تھی.....

تھوڑی دیر بعد وہ بھی ایک طرف ہو کر لیٹ گئی..... لیکن ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ دردانہ چونک کر اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔

"کون ہے.....؟" اس نے پوچھا تھا.....

"اذہان.....!" کہا گیا۔

دردانہ نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا اور اذہان اندر آ گیا..... وہ غور سے دردانہ کی طرف دیکھ رہا تھا..... پھر اس نے کہا:

"کیا ہوا تھا.....؟"

"تم اس وقت کہاں تھے.....؟"

"بب..... باتھ روم میں.....!" اذہان نہ جانے کیوں ہکلا کر بولا: "تم بتاؤ..... کیا ہوا تھا.....!"

دردانہ نے مختصراً اسے سعدیہ کے متعلق بتایا..... دونوں دبی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے..... اذہان بڑے غور سے سنتا رہا تھا..... پھر اس نے کہا:

"یار..... یہ واقعی حقیقت ہے کہ ہم لوگ کسی آسیبی چکر میں پھنس گئے ہیں.....!"

"کیا مطلب.....؟" دردانہ نے اسے گھورا۔

"تم نے اس وقت جو کچھ کمرے میں دیکھا تھا، اس کے بارے میں تمہارا خیال ہے.....؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں.....!" اس نے کندھے اچکائے۔

"ویسے بھی پورا یقین ہے کہ سعدیہ اس وقت اسی حال میں تھی.....!"

(اس دلچسپ اور تحیر خیز آپ بیتی کا اگلا حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔)

سارے جگ کی بوا اماں رحمت مرحومہ

اماں جان کی صبح کا آغاز نماز فجر سے ہوتا تھا اور نماز کے بعد ناشتہ پکانے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت ان کا معمول تھا ان کا قرآن مجید بڑی سائز کا ہے جو آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔

ایم اے خالق بھٹی

اپنی سادگی، سخاوت اپنے بے مثال خلق کے باعث سب رشتہ داروں اور جاننے والوں میں بوا کے قابل احترام لقب سے معروف تھیں۔

خاندان میں بڑی ہونے کے باعث سب خاندان والوں کی بزرگ ہونے کی وجہ سب ان کا احترام کرتے تھے دوسرا اپنے والدین کی پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کا مقام ومرتبہ سب بہن بھائیوں میں بلند تھا اور یہ اس باپ کی بیٹی تھی جو خاندان کے علاوہ اہل علاقہ کے سیاسی، گھریلو معاملات کے فیصلے کرنے کی وجہ سرپنچ ہونے کی وجہ سے باوقار تھے ان کا اسم گرامی حاجی احمد بخش بھٹی ہے اپنے والد کی طرح میری والدہ صاحبہ بھی خاندان بھر کے فیصلے کرنے کے باعث خاندان بھر میں قابل احترام تھیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ان کی آخری اولاد ہوں۔ جس چاہت سے انہوں نے میری تربیت کی ہے یا پھر پیٹ گھڑوری کا بیٹا ہونے کے ناطے میرے ناز نخرے اٹھائے ہیں اور میرے ہر لاڈ کو پورا کیا ہے ان سب کو یاد کر کے ان کی جدائی مجھے رنجیدہ کر دیتی ہے بچپن میں اماں جہاں کہیں کسی عزیز رشتہ دار یا کسی ہمسائے کی خوشی یا غمی میں شریک ہونے کے لیے جاتیں تو میں بھی بغل بچہ کی طرح ان کے ہمراہ ہوتا۔ اماں جان کی صبح کا آغاز نماز فجر سے ہوتا تھا اور نماز کے بعد ناشتہ پکانے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت ان کا معمول تھا ان کا قرآن مجید بڑی سائز کا ہے جو آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ ماضی میں گھریلو مصروفیات کے باوجود رشتہ داروں اور ہمسایوں کی لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھاتی ہی ہیں آج بھی وہ خواتین مجھے ملتی ہیں تو اماں جان کو دعائیں دیتی ہیں۔ اماں جان کو تمام رشتہ دار بڑے ہوں یا چھوٹے سب بوا کے لقب سے مخاطب کرتے تھے حالانکہ کسی کی دادی کسی کی رشتے میں ممانی اور خالہ ہیں لیکن سب ان کو بوا ہی کہتے تھے ان کی دیکھا دیکھی ہمسائیوں کی خواتین و بچیاں بھی ان کو بوا کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

میرے بڑے بھائی حاجی عبدالحمید بھٹی کے بعد پیدا ہونے والی میری بہن کم عمری میں انتقال کر گئیں تھی ان سے چھوٹے حافظ عبدالرشید بھٹی 14 مئی 2009ء میں شوگر اور ہارٹ کے عارضے میں انتقال کر گئے ان کے بعد حاجی عبدالعزیز بھٹی، حاجی عبدالمالک بھٹی ہیں ان کے بعد میرے تین بھائی کم عمری میں انتقال کر گئے تھے اور ان کی آخری اولاد (راقم) محمد عبدالخالق بھٹی ہے میری پیدائش سے قبل اماں جان کو شدید خواہش تھی کہ اب کی بار بیٹی پیدا ہوگی لیکن ان کی بیٹی کی خواہش تو پوری نہ ہوسکی البتہ راقم کو بچپن میں لڑکیوں والے پھولدار کپڑے بہت پسند آتے تھے اور ایک بار بازار میں ابو کے دوست عزیز اللہ ہاشمی صاحب کی کپڑوں والی دکان سے لڑکیوں والے کپڑے پسند کیے تو انہوں نے کہا کہ یہ کپڑے لڑکیاں پہنتی ہیں لیکن میں نے مزید اصرار کیا تو پھر بھی دینے سے انکار کر دیا تو میں ابو کو اپنے ساتھ لے گیا تو میرے ابو ان سے مخاطب ہوئے۔

"عزیز اللہ ایہہ میڈا پیٹ گھڑوری دا بال ہے ہیوا کپڑا ایکو پسند آوے ڈیڈ ینہ کرو" (یہ میرا پلوٹھی کا بیٹا ہے اسے جو کپڑا پسند آئے دے دیا کریں) اپنے بچپن کی بھولی عمر میں پھولدار کپڑے جن میں چکم کا کپڑا ابھی شامل ہے بہت پہنے ہیں۔ میری اماں جان نے 1976ء میں حج کرنے کا اچانک ارادہ کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے کسی دوسری عورت کے پاسپورٹ پر جانے کا سبب پیدا دیا اور وہ میرے ماموں محمد حسین المعروف کپتان بھٹی صاحب کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کیں کیونکہ اس دور میں قوانین میں نرمی تھی کراچی کے پرانے ایئر پورٹ کے جس ہال میں پاسپورٹ اور ویزہ کی چیکنگ ہوتی ہے اور سامان کا وزن بھی اس ہال میں ہم بھی چلے گئے تھے۔ اماں جان کی ڈیڑھ ماہ کی جدائی میں راقم بیمار پڑ گیا تھا حالانکہ میری بڑی والدہ صاحبہ میرا بہت خیال رکھتی تھی اور میری اماں جان جو لوہے کا ٹرنک اپنے ساتھ سعودی عرب لے گئیں تھی آج بھی یہ میرے پاس محفوظ ہے اسے جب بھی دیکھتا ہوں تو ان کے حج پر جانے، اپنی جدائی اور کراچی کے پہلے سفر کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

اماں جان نے دوسرا حج میرے ابو کے ساتھ 1982ء میں کیا تھا جبکہ میرے ابو نے پہلا حج 1983 میں اپنی بوڑھی دادی کے ہمراہ 125 روپے کرایہ میں بحری جہاز کے ذریعے کیا تھا۔ اماں جان کی 1985ء میں تانگے کے ایکسیڈنٹ میں بائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی جو بڑھاپے کے باعث صحیح طور پر جڑ نہ سکی۔ ادویات کے استعمال سے وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا تھا لیکن کچھ دنوں بعد درد دوبارہ شروع ہو جاتا تھا لیکن انہوں نے اپنی اولاد کو پریشان کرنے کی بجائے صبر وشکر میں زندگی گزار دی اسی طرح ان کی یہ صفت بھی ضرب المثل ہے خاندان اور ہمسائیوں کے مرد و خواتین کی مالی امداد کے علاوہ انہیں قرضہ بھی دے دیتی تھیں۔

اماں جان کبھی کبھی ہمیں اپنے خاندان کے ماضی کے بارے میں بتاتی تھیں کہ ماضی میں ہمارے خاندان کا غربت کے باعث یہ عالم تھا جب کبھی سبزی خریدنے کی استطاعت نہ ہوتی تھی تو ٹاہلی کے درخت سے بور چن کر پکا لیتے تھے اس کے علاوہ ماضی میں اماں جان نے اپنے ہاتھوں سے کھجی کے پتوں سے مصلے، روٹی رکھنے والی چھبیاں

اور ہاتھ سے چلانے والے پنکھے آدھی رات تک مٹی کے تیل والی چمنی کی روشنی میں بن کر فروخت کیے ہیں لیکن آخیر عمر میں اپنے شوہر اور اپنی اولاد کا مالی عروج بھی دیکھا ہے جب تک اماں جان زندہ رہی ہیں تمام بھائیوں اور ان کی اولاد کا کھانا ایک دیگچی میں پکتا تھا لیکن ان کی وفات کے بعد سب بھائی اپنی اپنی فیملی کے ساتھ الگ کھانا پکاتے ہیں ماسوائے بھائی حاجی عبدالعزیز بھٹی صاحب اور میری فیملی کا کھانا اب بھی مشترکہ پکتا ہے جس کے تمام اخراجات بھائی عبدالعزیز بھٹی صاحب ادا کرتے ہیں یہ ان کی اپنے چھوٹے بھائی سے مہربانی اور شفقت کی زندہ مثال ہے۔ اماں جان کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا نزدیک و دور سے کوئی بھی انہیں ملنے کے لیے آتا تو اسے کچھ کھلائے پلائے بغیر رخصت نہ کرتیں اور اگر دوسرے شہر سے کوئی رشتہ دار خواتین آتیں تو انہیں خرچی یا مٹھائی دیے بغیر رخصت نہ کرتیں۔

پھر زمانے نے دیکھا ان کے پاس درجنوں چاندی اور سونے کے زیورات تھے جب بھی کسی شادی میں شریک ہوتیں تو خود بھی پہنتی اور جس رشتہ دار کے پاس زیورات نہ ہوتے اسے بھی پہننے کے لیے دیتی تھی۔ اماں جان کی اپنے سگے بھائی حاجی غلام حسین بھٹی صاحب سے محبت کا یہ سچا اظہار ہے کہ انہوں نے اپنے چار بیٹوں کی شادیاں ان کی بیٹیوں سے کی ہیں جب میرے بھائی حافظ عبدالرشید بھٹی کی بیوی کی وفات ہوگئی تو ان کی دوسری بیٹی سے میرے بھائی کا بیاہ کرا دیا۔ آپ ہمیشہ شٹل کاک سفید رنگ کا برقع پہن کر ہی باہر جاتی تھیں لیکن حادثہ میں ٹانگ ٹوٹنے کے بعد مجبوراً چادر کا استعمال شروع کر دیا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہی دنوں میرے ماموں سسر، بھائی اور بھتیجے نے کاریں خرید لیں تھی جس کی وجہ سے کرائے کی سواری میں سفر کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ ہماری حویلی کے تمام افراد نے ٹی وی خرید لیے تھے اور ہم سب ٹی وی کے پروگرام دیکھتے تھے لیکن اماں جان میرے ابو کی طرح ٹی وی نہیں دیکھتی تھی اور سردیوں کی راتوں میں ان کی روٹین تھی کہ اپنے باورچی خانہ میں چولہے کے گرد اپنی چھوٹی اماں، اپنی چھوٹی بہن، اپنی ایک دو بھابیوں اور کسی ایک بہو کے ساتھ بیٹھ کر آپس میں حال احوال کرنے میں رات گئے تک بیٹھی رہتیں اور جس دن مٹی کی ہانڈی میں ساگ پکاتیں تو سب خواتین ہانڈی میں باری باری لکڑی کا چمچ گھماتے جاتے اور ان کا آپس میں باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

جب میرے والد صاحب اور بھائیوں کے پاس پیسوں کی ریل پیل ہوگئی تو بھی ان کی زندگی سادگی میں ہی گزری اور ان کی پیدائش 1930ء میں حاجی احمد بخش بھٹی مرحوم کی پہلی بیوی سے ہوئی کیونکہ میرے دادا کی یکے بعد پانچ شادیاں ہوئی تھیں اور 30 نومبر 2003ء کو رات کے دس بجے اچانک ان کا بلڈ پریشر لو ہو گیا میں فوری طور پر ہسپتال سے ڈاکٹر کو بلا لایا اور ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد میڈیکل اسٹور سے انجکشن لانے کے لیے بھیجا میں دوڑتا ہوا گیا اور جب انجکشن لی کر واپس آیا تو ہماری اماں جان ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر رخصت ہو گئیں تھی ان کی آخری آرام گاہ اپنے محلے کے آبائی قبرستان میں میرے والد مرحوم کے بائیں جانب ہے۔ وقتاً فوقتاً ان کی مرقد پر حاضری دیتا ہوں لیکن آج تک میرا ذہن اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ اماں جان ہم سے دور چلی گئی ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہیں کہیں میرے آس پاس ہیں۔

کراچی سے بھیجی گئی آپ بیتی

میں پنجتن کی غلام ہوں

لپٹ کے میں کعبے سے آنسو بہالوں
عطا ہوں مجھے ایسی گھڑیاں سہانی

الماس فاطمہ ارمان

جب انسان ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اُسے اللہ اور ان کے سچے وسیلے یاد آتے ہیں آج سے سولہ سال پہلے کی بات میں بہت پریشان تھی اپنوں سے مایوس اپنے خون کے رشتے کے ہاتھوں مجبور یعنی اپنے بھائی کے ہاتھوں دھوکا کھایا جس کو انگلی پکڑ کر راستہ دکھایا ماں کے مرنے کے بعد ماں بن کر پالا باپ کے مرنے کے بعد بھی ہمیں ہمیشہ اُس کے ساتھ رہی میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ تو میں ابو کے گھر میں رہنے لگی ہم دو ہی بہن بھائی تھے ایک بھائی اور میں میری چھوٹی سی بچی تھی جو تین سال کی تھی ہم ایک دوسرے کا سہارا تھے یا پھر رب ہمارا وارث تھا میں ابن سینا اسپتال کی کینٹین میں کوکنگ کا کام کرتی تھی عزت سے بچی کو پال رہی تھی چند سالوں بعد بھائی کی شادی ہو گئی۔

بھابی میرے والد کے دوست کی بیٹی تھی میرا بھائی گورنمنٹ دفتر میں ملازم تھا اُس کو وہاں فلیٹ بھی ملا ہوا تھا بھابی نے وہاں رہنا منظور کیا اور وہ چلی گئی۔ میرا کام جو اسپتال میں تھا وہ ختم ہو گیا۔ میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری گھر میں بچوں کی چیزوں کی دکان کھولی لی آہستہ آہستہ پرچون کی دکان بنالی گھر بیٹھے اللہ تعالیٰ پنجتن کے صدقے میں روزی دے رہے تھے۔ مگر شاید میرے نصیب میں یہ سب نہ تھا یہ مکان میرے ابو نے میرے نام سے وابستہ کیا تھا یہ کہہ کر یہ الماس کا گھر ہے فائل بنا کر اخبار میں اشتہار لگا دیا تھا۔

کورٹ سے کاغذات نہ بنوا سکے وہ بیمار ہو گئے اور ان کی زندگی نے وفا نہ کی چند دن مکان کا کوئی تذکرہ میرے سامنے نہ آیا۔ پھر اچانک بھائی نے کہا۔

”یار میں فائل کورٹ سے پکی کراتا دیتا ہوں مجھے دو۔“ میں نے اندھا اعتبار کیا اور فائل حوالے کر دی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر دی۔ بھائی نے مکان کا سودا کر دیا میں نے بہت کوشش کی نہ بکے تین منزلہ مکان بک گیا اوپر کا پورشن بھائی نے کرائے پر دیا تھا میں نے بھی

لالچ نہیں کیا وہ خود کرایہ لے جاتا تھا میں نے بہت سمجھایا۔

''یہ ابا کی کمائی کا مکان ہے تم یہ ظلم مت کرو برباد مت کرو میں کہاں جاؤں گی چھوٹی سی بچی کو لے کر..... مجھے تسلیاں دیں کہ ہم اپنے فلیٹ میں ساتھ رکھیں گے اس رقم سے میں شوروم کھولوں گا۔''

بھابی کہتی ہیں کسی کو اپنے ساتھ نہیں رکھوں گی میں بہت پریشان یا اللہ میری مدد کر میں کیا کروں خاندان میں کس کے گھر جاؤں کوئی کسی کو نہیں رکھتا آخر وہ وقت آ گیا جب مجھے مکان خالی کرنے کا نوٹس مل گیا میں نے ان سے کہا۔ جب تک مجھے میرا حصہ نہیں ملے گا میں گھر نہیں چھوڑوں گی جنہوں نے گھر خریدا تھا بتایا آپ کے بھائی نے سولہ لاکھ کا گھر بیچا ہے اور ہمارے پاس صرف تین لاکھ کی رقم ہے جو نہیں دینا ہے میں حیران ہوئی اتنا بڑا گھر سولہ لاکھ کا مگر میں کیا کرتی اپنے ہی نشیمن کو آگ لگاتے ہیں انہوں نے کہا آپ ایجنسی والے سے رابطہ کریں ہمیں ایک ہفتے کے اندر گھر خالی چاہیے۔ سخت سردیوں کا موسم تھا میں ہر طرف سے مایوس تھی جمعرات کا دن تھا میں نے چراغ جلایا پنجتن پاک سے رو رو کر فریاد کی۔

''یا علی مولا یا اللہ آپ میرا سہارا ہیں نہ میری ماں نہ باپ نہ ہی شوہر میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ میں آپ کی ماننے والی آپ کی فقیرنی ہوں اگر آپ نے مجھے سہارا نہ دیا تو میں پھر بھی

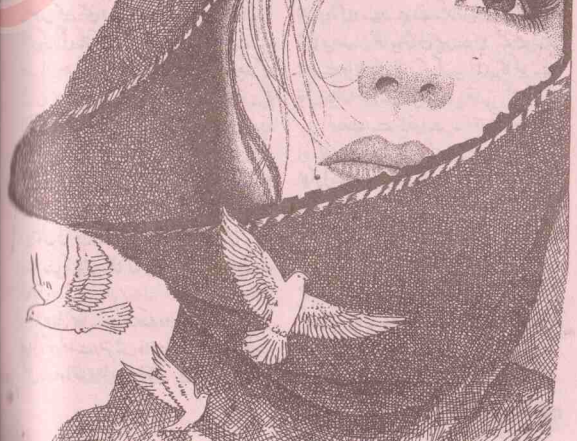

آپ سے فریاد نہیں کروں گی میں رو رو کر دعا کرتی رہی اپنے اللہ پاک اور اپنے مولا علی سے لڑتی رہی تھک کر میں بچی کے پاس جا کر لیٹ گئی اور طے کر لیا۔

''کرائے پر مکان دیکھوں گی صبح جا کر چاہے ایک کمرے کا ہی ہو۔'' روتے روتے آنکھ لگ گئی میں نے خواب میں دیکھا ایک بزرگ میرے سامنے کھڑے ہیں ان کے چہرے پر نور ہی نور ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اٹھو میرے ساتھ چلو تم ہم سے ناراض ہو یہ کیسے ممکن ہے تم نے بہت آس سے ہمیں پکارا ہے ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں چلو اٹھو مگر اس کے بعد بھی ہمیں پکارتی رہنا تمہارا اس طرح ہم سے ہم کلام ہونا ہمیں اچھا لگا۔'' میں ان کے پیچھے پیچھے جلدی ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر کچے پکے مکان تھے وہ ایک گلی میں مڑ گئے ایک دروازے پر رک گئے۔

''یہ تمہاری منزل ہے صبح آنا مل جائے گی اس سے منہ مت موڑنا یہ اللہ کی طرف سے تحفہ ہے اس پر قادر رہنا۔'' صبح میری آنکھ جب کھلی تو میں نے خواب کے بارے میں سوچا نماز سے فارغ ہو کر میں نے بچی کو ساتھ لیا اور اسی گلی میں پہنچ گئی جو خواب میں نظر آئی تھوڑی دیر کے بعد مجھے وہی مکان نظر آیا میں نے دروازے پر دستک دی ایک آدمی باہر آیا۔

''جی بہن کیا کام ہے؟''

''بھائی مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ مکان کرائے پر دینا چاہتے ہیں مجھے چاہیے۔''

''بہن پہلے ارادہ تھا مگر اب مجھے فروخت کرنا ہے مجھے یہاں سے جانا ہے میری بیوی گاؤں میں سخت بیمار ہے۔''

''آپ اس مکان کی کیا قیمت لگا رہے ہیں؟''

''ساڑھے تین لاکھ.....'' میں خاموشی سے ایجنسی والے کی طرف چل دی میں نے ناصر سے پوچھا۔

''میرے حصے میں کتنے پیسے آئے ہیں۔'' ناصر نے بتایا۔

''آپ کا بھائی باقی رقم لے گیا ہے صرف دو لاکھ بچانو بے ہزار ہیں۔'' میں نے ناصر سے کہا۔

''اگر تم مجھے بہن سمجھتے ہو تو یہ رقم مجھے مت دو بلکہ مجھے گھر دلا دو۔'' وہ میرے ساتھ آیا اُس نے مالک سے بات کی وہ بڑی مشکل سے تین لاکھ پر راضی ہوا میں نے کچھ رقم اپنی دوست سے لی اس طرح میرے اللہ نے مجھے یہ جھونپڑی عطا کی واقعی مکان کم جھونپڑی زیادہ لگتی تھی چھت ٹین کی چادر کی تھی۔

دیواروں پر پلستر نہیں ہوا تھا کچن برائے نام تھا زمین کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا باتھ روم میں دروازہ تک نہیں میں نے اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا کم از کم میں کسی کے در پر تو جا کے نہیں پڑی جب بارش ہوئی تو تمام سامان بھیگ گیا میں ایک کونے میں بچی کو لے کر بیٹھی رہی۔

پوری رات اپنی اور بچی کی حفاظت کرتی آیت الکرسی پڑھ کر دم کرتی رہتی پہلا محلہ بہت اچھا تھا سب جانتے تھے بچپن سے وہیں رہتے آئے تھے۔ یہاں میں بالکل اکیلی پٹھانوں کے علاوہ سرائیکی وغیرہ کی تعداد زیادہ تھی مگر میں اپنے رب پر بھروسہ کرتی وہی میری اور بچی کی حفاظت کرنے والا ہے میں صبح ہوتے ہی بچی کو اسکول چھوڑتی اور کوشش کرتی کہ مجھے قریب ہی کوئی

جاب مل جائے کوشش کرنے سے سب کچھ مل جاتا ہے۔

مجھے قریب ہی ایک میٹرنٹی ہوم میں او پی ڈی کی پرچی وغیرہ کے لیے کام مل گیا۔

صبح نو بجے سے تین بجے تک میں نے اسکول کے لیے وین لگا دی وہ میری بیٹی کو یہی چھوڑ جاتا اس طرح ماہ سال گزرنے لگے میں نے اپنی محنت کی کمائی سے تھوڑا تھوڑا کر کے گھر کو بنایا ہر جمعرات کو وہی چراغ جلاتی اور نیاز کرتی مگر میرا شہباز قلندر جانا نہیں ہوا میں ہمیشہ دعا کرتی کسی طرح میرا جانا ہو جائے۔

محرم میں میرا انچولی آنا جانا رہتا ہے میں نے وہاں لکھا دیکھا کہ 12 محرم کو یہاں سے بسیں روانہ ہوتی ہیں مناسب کرایہ لیتی ہیں اور سیبون شریف اور دیگر زیارتوں پر جاتی ہیں۔ میں نے فوری اپنی سیٹ بک کروائی۔ جس دن جانا تھا تھوڑے حالات خراب تھے۔ مگر میں نے جانے کا ارادہ کرلیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو تمام لوگ جمع تھے مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میں بھی قلندر کی زیارت کروں گی کافی ٹائم گزر گیا گاڑی کے آنے کا نام ہی نہ تھا پتہ چلا گاڑی والے نے منع کیا ہے کہ حالات خراب ہیں میں نہیں جا سکتا۔ تمام بسیں اپنے اپنے وقت پر روانہ ہو چکی تھیں ہمیں پیسے بھی واپس مل چکے تھے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل غمگین کہ قلندر بابا شاید آپ کو میری حاضری منظور نہیں میں بھی اپنا سامان اٹھا کر چل دی ابھی میں رکشے والے کو اشارہ کر رہی تھی کہ ایک بڑے میاں نے مجھے روکا۔

''بیٹی بات سنو تم بڑی غمگین ہو تمہیں سیبون جانا ہے مجھے بھی جانا ہے آؤ میں تمہیں الآصف بس کے اڈے پر لیے جاتا ہوں۔ میں بھی زیارت کے لیے جا رہا ہوں۔'' پہلے تو میں گھبرائی پتہ نہیں یہ کیسے آدمی ہیں مگر میں نے غور کیا دیکھا اُن کا نورانی چہرہ تھا۔ وہ بہت نیک بزرگ لگ رہے تھے۔

''بیٹی تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے بڑے بھائی یا والد کی جگہ ہوں چلو رکشے میں بیٹھو۔'' اس طرح میں ان کے ساتھ بس کے اڈے پر آئی انہوں نے سیبون کے ٹکٹ لیے مجھ سے پیسے بھی نہیں لیے میں نے بہت اصرار کیا۔

''محترم یہ تو غلط ہے۔''

''نہیں غلط نہیں تم میری بیٹی ہو اور اس ہستی کی زیارت کو جا رہی ہو جس کا مقام اعلیٰ ہے یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔''

خیر سے میں گاڑی میں بیٹھ گئی بزرگ میری سیٹ سے کافی دور تھے میں ان کو پلٹ کر دیکھنا چاہتی تھی پھر میں نے سوچا بس رُکے گی تو میں ان کا شکریہ ادا کروں گی۔ اپنی منزل کو روانہ تھی ایک ہوٹل پر بس رُکی تمام لوگ چائے کے لیے اترے میں بھی اتری میں نے پلٹ کر ان بزرگ کو تلاش کیا۔

نہ نظر آئے میں نے سوچا وہ نیچے اتر چکے ہیں میں نے بیٹی کو چائے وغیرہ پلائی خود بھی واش روم وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی سیٹ پر آ گئی مگر مجھے وہ بزرگ نظر نہ آئے میں کافی پریشان ہوئی یہ بس ہمیں اتار کر چلی جائے گی پھر ہم مزار پر کیسے پہنچے گے بس سیبون کے اڈے پر جا کر رُکی میں اتر کر ایک قریبی ہوٹل میں بیٹھ گئی رات کے چار بج رہے تھے اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

''سیبون کا مزار کس طرف ہے اور کیسے جانا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''بہن ابھی یہیں بیٹھی رہو پانچ ساڑھے پانچ پر مزار کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ یہ سامنے بہت سے رکشے کھڑے ہیں ان میں سے کسی سے بھی کہنا وہ مزار پر اتار دیں گے واپسی کا راستہ بھی اسی طرح ہے یہاں آ کر آپ کراچی جانے والی کوچ کا ٹکٹ لے کر کراچی چلی جانا یہ گاڑی نصیر آباد واٹر پمپ پر رکتی ہے جہاں مرضی اتر جانا۔''

مجھے اطمینان ہو گیا میں اب صحیح طریقے سے پہنچ سکتی ہوں پانچ بجے مزار پر آگہی اذان ہونے والی تھی جیسے ہی اذان ہوئی ڈھول بجنے لگا نماز کے بعد ایک بار پھر ڈھول کی تھاپ پر دھمال ہوا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا میرا دل میرا تن سب میرے مرشد کے لیے ہے میں زار و قطار جالی کو پکڑ کر رو رہی تھی۔ اپنا دکھ ان سے بیان کر رہی تھی کافی دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا میں کافی دیر مزار پر بیٹھی سپارہ پڑھتی رہی پھر چلنے کا ارادہ کیا کیونکہ بچی کا ساتھ تھا میں نے چادر چڑھائی اور دعائیں منت مانگ کر گھر آ گئی اس پورے وقت میں مجھے وہ بزرگ نظر نہیں آئے اب میں ہر سال خود ہی سیبون جاتی ہوں چادر چڑھاتی ہوں لنگر جو حسب حیثیت ہوتا ہے تقسیم کرتی ہوں اور خوشی خوشی گھر آ جاتی ہوں۔

میں اب بھی آزمائشوں میں گھری رہتی ہوں مگر میں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتی وہ ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے اللہ سے ہاتھ پھیلا کر مانگو تو وہ تمہاری جھولی بھر دے گا میرا کچھ سال پہلے پتے کا آپریشن ہوا میرا پتہ پتھروں کی وجہ سے پھول گیا تھا اور ز ہر مہرہ کے ذریعے خارج ہو رہا تھا کوئی ڈاکٹر آپریشن کے لیے تیار نہ تھا پھر میں نے اپنے رب اور پنجتن پاک سے جھولی پھیلا کر فریاد کی۔

''اے اللہ میری بچی یتیم تو ہے تو اُسے مجھ سے جدا نہ کرائے مالک اس کا میرے اور میرے سوا کوئی نہیں زندگی تیری امانت ہے مگر مجھے اس بچی کے لیے بخشش دے اللہ اور پنجتن پاک اور قلندر نے میری سن لی اور میرا آپریشن احمد میڈیکل کے سرجن نے کیا وہ خود حیران تھا وہ بھی یہی کہنے پر مجبور ہو گیا۔

''یہ اللہ کا کرم ہے بے شک وہ غفور و رحیم ہے میری بچی کے آنسو اور اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ اللہ نے تھام لیے ورنہ میں نہ زندہ رہتی میں بہت گناہ گار ہوں وہ گناہوں کو بخشنے والا ہے میں اس کہانی سے ان لوگوں کو سبق دینا چاہتی ہوں جو خدا کو بھول بیٹھے ہیں۔ بس صرف اللہ کے سوا کسی سے مت مانگو۔

اللہ ہمارا رب ہے وہ ہمارا مالک ہے مگر وہ اُن سے پیار کرتے ہیں وہ میرے نبی پاک ﷺ کا گھرانہ ہے اللہ سے ان کا واسطے دے کر ان سے ہر مراد مانگو اللہ کریم بھی خوش ہوتے ہیں اور میرے نبی ﷺ بھی پنجتن نبی کے نواسے بیٹی داماد ہیں جب وہ اللہ کے اتنے قریب ہیں تو ہم کیوں نہ اُن سے مانگیں قلندر جیسی ہستیاں بھی اللہ اور رسول ﷺ اور ان کی اولاد کے چاہنے والے ہیں ہم تو اُن کی خاک بھی نہیں ہر مسلمان کا اپنا عقیدہ ہے میرا عقیدہ میرا رب اس کے بعد پنجتن کا گھرانا پنجتن کا گلدستہ شہباز قلندر عبداللہ شاہ غازی میں ان سب کی فقیرنی ہوں ان کی غلام ہوں میں ہر مشکل میں ان کو پکارتی ہوں یہ کہہ کر نعرہ بلند کرتی ہوں یا اللہ مدد یا علی مدد، حق حیدر۔

□□.....❁.....□□

لاہور سے ارسال کردہ بے مثال تحریر

درویش لوگ

سر حرام ہے‘ یہ بات ہمارے بڑے خوب جانتے تھے اسی لیے وہ واقعی میں بڑے تھے......

چوہدری محمد امین

لاہور سے ساہیوال کو جاتے ہوئے کوئی 100 کلومیٹر پر حبیب آباد نام کی آبادی واقع ہے جو ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ بس اسٹاپ بھی ہے اور مقامی منڈی بھی...... ارد گرد کے کاشتکار اپنی اجناس اسی منڈی میں لاتے ہیں اور اسی طرح سے حبیب آباد اس علاقے میں تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ حاکم علی بھی انہیں مضافات میں کاشتکاری کے پیشے سے منسلک تھے۔ عمر کے لحاظ سے سب لوگ عزت سے بابا حاکم کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بہت زیادہ عرصے کی بات نہیں 70 کی دہائی میں اس منڈی میں حبیب بینک کی ایک برانچ کھل گئی۔

کچھ کاشتکار ڈکیتی‘ چوری چکاری کے خوف سے اپنی اجناس کی رقم بعد از فروخت منڈی کے بڑے آڑھتیوں کے پاس ہی جمع کرواجاتے تھے۔ بابا حاکم بھی اپنی فروخت شدہ اجناس کی حاصل رقم منڈی آڑھتیوں کے پاس ہی جمع کراتے جاتے تھے لیکن چوری چکاری کے خوف سے نہیں بلکہ ایک جگہ پر رقم جمع کرنے کے خیال سے......

سہ ماہی ششماہی بعد اکٹھی رقم وصول کر لیتے...... اعتماد کا بڑا دخل تھا نہ ہیرا پھیری کا حساب کتاب میں بے اعتباری...... ویسے تو بابا حاکم اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں پورا حساب یاد رکھتے تھے کہ کب کپا اور کتنی خیس بیچی تھی اور اس وقت تک کتنی رقم جمع ہوگئی ہے۔ قمری مہینوں کی تاریخ سے یا دیسی مہینوں کی تاریخیں تک یاد رکھتے تھے لیکن اعتماد اعتبار کا خاصہ تھا کہ بابا حاکم نے ترسیل کی تفصیل یاد رکھنے کے لیے ذہن پر زور دینا چھوڑ دیا تھا بس پوچھ لیتے تھے کہ کتنے پیسے جمع ہوگئے ہیں۔ نہ آڑھتی لوگ کوئی ڈنڈی مارتے تھے نہ ہی بابا حاکم کسی قسم کی ہیرا پھیری پر یقین رکھتے تھے۔

بلکہ اگر کسی کی مرغی بکری ان کے ہاں غلطی سے آجاتی تو اپنے بیٹوں پوتوں کو اس مشن پر لگا دیتے کہ مالک کا پتہ کر کے واپس پہنچا کر آؤ خود اس مشن کی نگرانی کرتے تھے کہ لڑکے شرارت سے کوئی دوسرا کام ہی نہ دکھا دیں۔ ہمیشہ خوفزدہ رہتے کہ کسی کی کوئی بھولی بھٹکی مرغی بکری اگر واپس نہ کی تو بروز قیامت 70 بکریاں کہاں سے لاؤں گا۔

70 کی دہائی میں حبیب آباد میں حبیب بینک کی شاخ کھل گئی تو بینک والوں کی کاوشوں سے اور کئی اور مصلحتوں کی بنا پر بابا حاکم نے بھی بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا اور رقم وہیں جمع کروادیتے۔ ایک دفعہ بابا حاکم کو کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو اپنی چیک بک لے کر بینک پہنچے اور یوں ہی پوچھ لیا کہ ان کے کھاتے میں کتنی رقم ہے۔ بینک آفیسر نے اکاؤنٹ چیک کر کے بتایا کہ آپ کی رقم اتنی ہے۔ بابا حاکم حیران ہوئے کہ رقم تو تھوڑی ہونی چاہیے لیکن بینک والے بابا حاکم کے حساب سے زیادہ بتا رہے تھے۔ بابا حاکم نے ان صاحب سے کہا۔

’’بیٹا تم بھول تو نہیں رہے؟ میری رقم تو اتنی نہیں ہے۔‘‘ بابا جی نے تمام Transcctions مہینوں کی تاریخ کے ساتھ بتا دیں اور کہا۔

’’بیٹا آپ کسی اور کا کھاتہ تو نہیں بتا رہے غلطی سے؟ دوبارہ دیکھو۔‘‘ بینک آفیسر نے تفصیل بتا دی۔

’’بابا جی آپ کی اصل رقم اتنی ہی بنتی ہے جتنی آپ نے بتائی لیکن سود کی رقم ملا کر آپ کی رقم میں اضافہ ہوگیا ہے۔‘‘ بینک آفیسر نے بابا جی سے تحسین آمیز جملے کی توقع سے بتایا کہ بابا جی خوش ہوجائیں گے کہ رقم میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بابا جی ٹکٹکی باندھے متعلقہ صاحب کو دیکھتے جا رہے تھے۔ بینک آفیسر نے سمجھا کہ بابا جی کو بات کی سمجھ نہیں آئی۔ حالانکہ بابا جی تو بحر حیرت میں غرق‘ اس نوجوان آفیسر کو یک ٹک دیکھے جا رہے تھے کہ یہ نوجوان نے کیا کہہ دیا ہے۔

میرا اپنا مشاہدہ رہا ہے کہ وہاں لوگوں میں یہ احساس بہت شدت سے ہوتا تھا کہ ان کی اولاد کی کہیں سے شکایت نہ لے آئیں۔ خاندانی اور نسلی

لوگ تو اپنے بچوں کو اس حد تک تلقین کرتے ہیں کہ ''اولاے نالوں موت چنگی'' یعنی شکایت سے بہتر ہے کہ موت آ جائے۔

بابا جی تو لگاتار ٹکٹکی باندھے اس بینک آفیسر کو دیکھے جا رہے تھے۔ بینک آفیسر نے بڑے ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کو بہت واضح کر کے دو دفعہ دہرایا۔

''سود لگنے سے آپ کی رقم زیادہ ہو گئی ہے۔'' بابا جی نے اچانک پوچھا۔

''کس کے بیٹے ہو؟'' بینک آفیسر حیران ہوا کہ ان کے والد اور والدین کا پوچھ لیا ہے۔ لیکن وہ جوان بھی سمجھدار تھا سمجھ گیا کہ بابا جی شکایت (اولامہ) لگانے کے لیے پوچھ رہے ہیں۔ اس نے والد یا والدین کا بتانے کی بجائے نہایت حلیمی سے بتایا کہ بابا جی بینک میں جو رقم ہوتی ہے اس پر سود بھی لگتا ہے نا اور اس طرح آپ کی رقم زیادہ ہو گئی ہے۔ اب یہ سود کا ذکر بابا حاکم نے چوتھی بار سن لیا تھا۔ بابا حاکم کے دماغ میں اچھلنے والا طلاطم ایک دم سے بحر دماغ سے باہر آ گیا۔

بابا حاکم یوں تو بغیر سہارے کے بھی چل سکتے تھے لیکن یونہی 3/4 فٹ کی لاٹھی نما چھڑی کے سہارے چلا کرتے تھے یہ چھڑی ساتھ رکھنے کے لیے بابا جی کے دل میں چلنے کے سہارے سے زیادہ ہلکے پھلکے دفاع کا زیادہ عنصر ہوتا تھا۔ بابا جی نے جو چوتھی دفعہ سود کا لفظ سنا تو انہوں نے بڑھاپے سے پہلے والی جوانی کی پٹاری کھولی' کرسی پر بیٹھے بیٹھے فرش سے اپنی چھڑی اٹھائی اور تراخ سے جڑ دی اس نوجوان بینک آفیسر کو......

یہ تو بھلا ہوا کہ وہ جوان چوکنا تھا اور ایک طرف کو ہٹ جانے سے بابا جی کی سوٹی (چھڑی) کے وار سے محفوظ رہا۔ اب بابا جی اٹھ کھڑے ہوئے جوان بینک آفیسر آگے آگے اور بابا حاکم اب چھڑی کی نوک چبھونے کے انداز میں سیدھے وار جوان پر اور گرج بھی رہے تھے۔

''اوے مینوں سود کھوانا ایں؟'' یعنی او مجھے سود کھلاتے ہو؟ بینک میں شور مچ گیا۔ ہٹو' بچو' پکڑو پکڑو کا غوغا' بینک میں ایک طوفان آ گیا۔ بینک کے دروازے کے باہر بیٹھا پولیس کا سپاہی اپنی بندوق سنبھال کر لپکا۔ دیکھا تو سمجھ گیا کہ بابا حاکم کوئی ڈاکو نہیں ہے لہٰذا اپنی گن کندھے پر ڈال کر بابا جی کو سنبھالنے لگا تو ایک دو ہاتھ بابا جی نے اسے بھی جڑ دیے۔ بس ایک ہی مطالبہ تھا بابا حاکم کا کہ یہ پتر کس کا ہے۔

اب تو بابا حاکم کی کوشش یہ تھی کہ اس جوان کے والد کا پتہ چل جائے اور جا کر اس سے شکایت لگائے اور اپنا غصہ ٹھنڈا کر لے۔ بینک عملہ' بینک منیجر' اور موجود باقی معززین نے پکڑ دھکڑ کر کے بابا جی کو بٹھایا لیکن بابا جی کا ایک ہی جملہ تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا کہ اس بندے نے سود کے پیسے میری رقم میں ملا کر مجھے سود کھلانے کی کوشش کی ہے۔ میں اس کے والدین کو شکایت ضرور کروں گا۔ بینک والوں سے دوسری غلطی یہ ہو گئی کہ سیون اپ کی بوتل لا کر بابا جی کو ٹھنڈا کرنے کی جسارت کر لی۔ بابا حاکم پھر بھڑک اٹھے۔

''یہ بوتل بھی سود کے ہی پیسوں سے منگوائی ہو گی میں نہیں پیوں گا۔'' بمشکل بابا جی کو ٹھنڈا کیا گیا۔ تب بابا جی نے اپنی اصل رقم لی اور جاتے جاتے کہہ گئے۔

''میں نے اپنی رقم لے لی ہے باقی رقم کو آگ لگا دو اور میرے کھاتے پر لکیر پھیر دو یعنی اکائنٹ بند کر دو۔''

□□......❁......□□

چیچہ وطنی سے ارسال کردہ ایمان افروز تحریر

آسمانی مصیبتیں زمینی آفتیں

اسی کے واسطے ثنا' اسی کے سامنے دعا
اسی کے پاس ہے دوا' اسی سے عرضِ حال ہے

اقراء جبار

خلیفہ ہارون رشید عباسی خاندان کے پانچویں خلیفہ تھے۔ عباسیوں نے طویل عرصے تک اسلامی دنیا پر حکومت کی لیکن ان میں سے شہرت صرف ہارون رشید کو نصیب ہوئی۔

ہارون رشید کے دور میں ایک بار قحط پڑ گیا اس قحط کے اثرات ثمرقند سے لے کر بغداد اور کوفہ سے لے کر مراکش تک ظاہر ہونے لگے ہارون رشید نے اس قحط سے نمٹنے کے لیے تمام تدبیریں آزما لیں۔ خلیفہ ہارون رشید نے اپنی بادشاہی میں جتنے غلے کے گودام تھے سب کے دروازے کھول دیے ٹیکس معاف کر دیے پوری سلطنت میں سرکاری لنگر خانے قائم کر دیے اور تمام امراء اور تاجروں کو متاثرین کی مدد کے لیے آمادہ کر لیا لیکن اس کے باوجود عوام کے حالات ٹھیک نہ ہو سکے۔

خلیفہ ہارون رشید کی پریشانی دن بدن بڑھتی گئی اور ایک رات جب ہارون رشید شدید پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے آپ کو نیند نہیں آ رہی تھی پریشانی کے اس عالم میں آپ نے اپنے وزیر یحییٰ بن خالد کو طلب کیا۔ یحییٰ بن خالد ہارون رشید کا وزیر اور استاد بھی تھا۔ یحییٰ بن خالد نے بچپن سے بادشاہ کی تربیت کی تھی۔

ہارون رشید کسی بھی مشکل وقت میں اپنے اس وزیر خاص سے مشورہ کرتے ہارون رشید نے اپنے استاد محترم سے کہا۔

''مجھے کوئی ایسی داستان سنائیے جسے سن کر مجھے قرار آ جائے۔'' یحییٰ بن خالد مسکرایا اور عرض کیا۔

''بادشاہ سلامت میں نے اللہ کے کسی نبی کی حیات طیبہ میں سے ایک داستان پڑھی تھی یہ داستان میں دیوبیت کی تشریح بہت شاندار طریقے سے کی تھی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں وہ داستان آپ کے سامنے دہراؤں مجھے امید ہے آپ سن کر خوش ہو جائیں گے۔'' بادشاہ سلامت نے بے چینی سے فرمایا۔

''یا استاد محترم فوراً شروع کیجیے میری جان حلق میں اٹک رہی ہے تکلیف کا یہ عالم ہے کہ ایک سیکنڈ بھی سکون و قرار ہیں تھا۔ استاد یحییٰ بن خالد سے

ہارون رشید کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور بولے۔

''خلیفہ اطمینان رکھیے اور گھبرایئے نہیں۔'' اور بولے۔

''بادشاہ سلامت کسی جنگ میں ایک بندریا سفر کے لیے روانہ ہونے لگی اس کا ایک بچہ تھا وہ اپنے بچے کو ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی چنانچہ وہ شیر کے پاس گئی اور عرض کیا جناب آپ جنگل کے بے تاج بادشاہ ہیں میں سفر پر روانہ ہونے لگی ہوں میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے بچے کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں۔'' شیر نے بندریا کی بات سن کر حامی بھرلی' بندریا نے اپنا بچہ شیر کے حوالے کردیا۔''

''شیر نے اس کا بچہ کندھے پر بٹھالیا اور بندریا اپنے سفر پر روانہ ہوگئی اب شیر روانہ بندریا کے بچے کو کندھے پر بٹھاتا اور جنگل میں اپنے روزمرہ کے کام بھی کرتا تھا ایک دن وہ جنگل میں گھوم رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک چیل آئی شیر کے کندھے سے بندریا کا بچہ اٹھا کر آسمان میں گم ہوگئی شیر جنگل میں اِدھر اُدھر بھاگا وہ چیل کو نہ پکڑ سکا۔ یحییٰ بن خالد کا اس نے سانس لیا اور خلیفہ ہارون رشید سے عرض کیا۔

''بادشاہ سلامت چند دن کے بعد بندریا واپس آئی اور شیر سے اپنے بچے کا مطالبہ کردیا۔'' شیر نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''تمہارا بچہ تو چیل لے گئی۔'' بندریا کو غصہ آیا تو اس نے چلا کر کہا۔

''تم کیسے بادشاہ ہو تم ایک چھوٹی سی امانت کی حفاظت نہیں کرسکے تم سارے جنگل کا نظام کیسے چلاؤ گے۔'' شیر نے افسوس سے سر ہلا دیا اور بولا۔

''میں زمین کا بادشاہ ہوں اگر زمین سے کوئی آفت تمہارے بچے کی جانب بڑھتی تو میں اسے روک لیتا لیکن یہ آفت آسمان سے اتری تھی اور آسمان کی آفت صرف اور صرف آسمان والا ہی روک سکتا ہے۔'' یہ کہانی سنانے کے بعد یحییٰ بن خالد نے ہارون رشید سے عرض کیا۔

''اے بادشاہ سلامت قحط کی یہ آفت بھی اگر زمین سے نکلی ہوتی تو آپ اسے روک لیتے لیکن یہ آفت آسمان سے آئی ہوئی ہے یہاں آپ بادشاہ نہیں فقیر بن جایئے یہ آفت خود بخود رک جائے گی۔''

دنیا میں دو قسم کی آفتیں ہوتی ہیں آسمانی آفتیں اور زمینی آفتیں آسمانی آفت سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا انسان پر راضی ہونا ضروری ہوتا ہے اپنے آپ کو اللہ کے در پے جھکانا بہت ضروری ہوتا ہے اللہ کے سامنے حاضر ہوکر خلوص نیت کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی مانگنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے جتنے بھی نبی اس دنیا میں بھیجے سب کا یہی پیغام تھا لوگوں اللہ سے ڈر جاؤ آسمان والی ذات کو راضی کرلو جن لوگوں نے پیغمبروں اور اللہ کے نیک بندوں کے بتائے ہوئے راستے کا انتخاب کیا وہ کامیاب ہوگئے جو لوگ اس دنیا میں آنے کا مقصد بھول گئے آسمانی آفتوں نے ان کو پریشان کیا وہ پریشانی جس کا حل وقت کے بادشاہوں کے پاس بھی نہیں تھا۔ زمینی آفت سے بچاؤ کے لیے انسانوں کا متحد ہونا وسائل کا بھرپور استعمال اور حکمرانوں کا اخلاق درکار ہوتا ہے۔

یحییٰ بن خالد نے ہارون رشید سے کہا تھا کہ بادشاہ سلامت آسمانی آفتیں اس وقت تک ختم نہیں ہوتیں جب تک انسان اپنے رب کو راضی نہیں کرلیتا۔ آپ اس آفت کا مقابلہ بادشاہ بن کر نہیں کرسکیں گے چنانچہ آپ فقیر بن جایئے اللہ کے سامنے جھک جایئے اس سے توبہ کیجیے اور اس سے مدد مانگیں دنیا کے تمام مسائل اور ان کا حل کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہوتا ہے جتنا ماتھے اور جائے نماز کے درمیان ہوتا ہے لیکن افسوس ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے سات سمندر پار تو جاسکتے ہیں لیکن ماتھے اور جائے نماز کے درمیان موجود چند انچ کا فاصلہ طے نہیں کرسکتے۔

❑❑.....❁.....❑❑

بیچ مٹی میں مل نہ جائے کہیں
اس قدر دیکھ بھال ٹھیک نہیں

زندگی تو خیالِ خانہ ہے
آپ کا یہ خیال ٹھیک نہیں

گرنے والے نے سر اٹھا کے کہا
اِن ستاروں کی چال ٹھیک نہیں

غم غلط کیجیے مگر کم کم
یہ زیادہ ملال ٹھیک نہیں

آئنہ ساز ٹھیک کہتا ہے
شیشہ گر کی مثال ٹھیک نہیں

ساتھ چلتے رہو مگر خاموش
اِس سفر میں سوال ٹھیک نہیں

آپ کے ناخنوں سے یاد آیا
میرے زخموں کا حال ٹھیک نہیں

عمران شمشاد نرمی

ڈسکہ سے ارسال کردہ تحریر

لوحِ محفوظ کی برکت

گلے میں موجودہ سورۃ یٰسین
اس کی زندگی کی ضامن تھی ورنہ.....

ڈاکٹر طارق محمود آکاش

آج شام سے ہی بادلوں نے ہر طرف پانی ہی پانی کردیا تھا۔ ہر ذی روح اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ گرج چمک ایک عجیب سا خوف پیدا کردیتی تھی۔

زارا اور اس کا بوڑھا بابا فیروز اپنے کچے مکان کی چھت جس میں سے کئی جگہوں سے پانی ٹپکنا شروع ہوچکا تھا۔ ایک کونے میں بیٹھے بارش کے بند ہونے کا انتظار کررہے تھے اور دعا کررہے تھے کہ بارش رک جائے کہ اچانک دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔

''بابا..... دروازہ مت کھولو..... مجھے ڈر لگ رہا ہے پتہ نہیں باہر کون ہے؟'' زارا نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو اس کا باپ مسکرا کر بولا۔

''نی جھلیے..... اپنے بابا کے ہوتے ہوئے کیوں ڈرتی ہے..... مجھے دیکھ لینے دو..... باہر کون ہے بے چارہ کوئی مسافر ہوگا۔''

یہ کہہ کر بابا فیروز کمرے سے نکلا اور ایک بوسیدہ سی بوری اوڑھ کر کچے صحن میں جمع شدہ برساتی پانی میں شپ شپ کرتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور بہ آواز بلند پوچھا۔

''کون ہے؟'' اس کی آواز شاید شرابے دار بارش اور بادلوں کی گرج چمک میں دب گئی۔ کیونکہ باہر سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو میں ایک مسافر ہوں..... رات گزارلوں گا..... صبح تڑکے چلا جاؤں گا۔'' دوسری طرف سے آواز ابھری۔

بابا کو اپنا اندازہ درست محسوس ہوا اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک شخص سیاہ کھدر کی چادر کی بکل مارے کھڑا تھا۔

بابا نے لالٹین اوپر کرکے اُسے دیکھا۔ اس نے اپنا پورا وجود حتیٰ کہ چہرہ تک چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ البتہ چہرے والی جگہ سے دیکھنے کے لیے کونا ذرا ہٹا ہوا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ غڑاپ سے اندر آ گیا۔

بابا نے جلدی سے دروازہ بند کردیا اور اُسے دوسری کوٹھڑی میں لے آیا۔ یہاں کچے فرش پر صرف ایک بوسیدہ سی دری بچھی تھی۔ مسافر نے اپنے کندھے پر اٹھائی گٹھڑی اس کے اوپر رکھی اور بیٹھ گیا بابا اسے دیکھ کر بولا۔

''کچھ کھایا پیا بھی ہے یا لاکر دوں..... کچھ روٹی اور ساگ پڑا ہوگا۔''

''لادے پھر..... بھوک تو لگی ہے مجھے.....'' مسافر نے کہا۔ بابا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بابا حیران تھا کہ اندر آجانے کے باوجود اس نے چہرے سے چادر ہٹانے کی ذرا کوشش نہ کی۔ مسافر اتنی سردی کے باوجود ذرا بھی کپکپا نہیں رہا تھا۔ جبکہ خود بابا کو اپنا خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

بہرطور وہ اسے وہاں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا زارا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کون تھا بابا.....؟'' اس نے قدرے تفکر سے پوچھا۔

''کوئی مسافر ہے بے چارہ..... مگر ہے بڑا عجیب.....''

''دھیے تو ایسا کر..... ایک چراغ اور جلادے..... بے چارہ اندھیرے میں بیٹھا ہوگا۔ اور ہاں..... وہ رات والی جوکی روٹی اور ساگ رکھ کر مجھے لادے تو میں اسے دے آؤں۔''

''تو بابا کیا وہ اب روٹی بھی کھائے گا؟'' زارا نے بولا۔

''نادھیے گھر آئے مہمان کے بارے میں ایسا نہیں بولتے..... جا شاباش پتر.....'' بابا نے اسے پیار سے کہتے ہوئے نصیحت کی اور زارا فرمانبرداری سے سر ہلاتے ہوئے کوٹھڑی سے نکل آئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ روٹی کا چھابہ لے کر آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کا باپ چارپائی پر لیٹا خراٹے لے رہا ہے۔

''اب کیا کروں..... بابا کو جگا دوں یا خود ہی مسافر کو روٹی دے آؤں۔'' زارا نے کھڑے کھڑے سوچا اور اس نے یہی فیصلہ کیا کہ بابا کو نہ جگائے اس نے صبح تڑکے بھیڑوں میں بھی جانا ہوتا ہے۔ چنانچہ زارا نے روٹی کا چھابہ اور لالٹین لی اور دوسری کوٹھڑی کا رخ کیا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھٹک سی گئی۔ اسے کمرے سے روشنی سی آتی نظر آئی اسے حیرت ہوئی لالٹین تو اس کے پاس موجود تھی۔ اور بابا نے اُسے چراغ لانے کو بھی کہا تھا۔ اور تیل نہ ہونے کی وجہ سے زارا لالٹین ہی لے آئی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ مسافر کے پاس کس قسم کی روشنی ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے موم بتی ہو اس کے سامان میں۔

زارا اندر داخل ہوئی اس نے مسافر کو منہ دوسری طرف کر کے اپنے سامان میں سے کچھ تلاش کرتے پایا۔

آہٹ پا کر اس مسافر نے یکدم چادر کی بکل چہرے پر سرکالی اور زارا کی طرف مڑا۔

''روٹی لائی ہے..... رکھ دے..... ٹُو جا..... میں کھالوں گا..... تیری مہربانی۔'' زارا کو اس کے لہجے سے حیرت ہوئی۔ اس نے عورتوں کی طرح اپنا چہرہ کھدر کی سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ زارا کو نجانے کیوں اپنے وجود میں سرد لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی اور وہ جلدی سے روٹی کا چھابہ اس کے پاس رکھ کر اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

اس نے لالٹین کی لو مدہم کر دی وہ سوئی تو نہیں مگر اس نے سونے کی کوشش کی۔ وہ بہت بے چین سی ہو گئی۔

باہر بجلی کی خوفناک کڑک اور بادلوں کی دل دہلا دینے والی گرج چمک جاری تھی۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ اُس پُراسرار مسافر کے بارے میں سوچے جا رہی تھی کہ کہ آخر وہ کون ہے اور اس نے کوٹھڑی کے اندر داخل ہو جانے کے بعد بھی اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔

☆.....☆.....☆

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ بارش کا زور ماند پڑ چکا تھا۔ چہار سو سناٹا تھا۔ مگر زارا ابھی تک جاگ رہی تھی۔ بابا فیروز پاس چارپائی پر لیٹا خراٹے مار رہا تھا۔

دفعتاً زارا کو باہر صحن میں آہٹ سنائی دی۔ یہ آواز اس کوٹھڑی کے دروازہ کے کھلنے کی چرچراہٹ تھی۔ جس میں پُراسرار مسافر تھا۔ زارا نے سوچا شاید وہ کسی ضرورت وغیرہ کی غرض سے باہر آیا تھا۔

مگر پھر بھی زارا کی آنکھیں بند کوٹھڑی کے دروازے کی باریک درزوں کے پار ہونے والی مدھم روشنی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ معاً زارا نے دیکھا قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ کوٹھڑی کے دروازے کے قریب آ رہی ہے۔ اب تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ سوچنے لگی کہ مسافر اس کی کوٹھڑی کے پاس کیوں آ رہا ہے۔ پھر اچانک کسی نے دروازے کو اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی۔

دروازہ اندر سے بند ہونے کی وجہ سے ہولے سے چرچرا کر رہ گیا۔ زارا بری طرح خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز دی۔

''ک..... ک..... کون ہے؟'' زارا کو جاڑے میں بھی پسینہ آ گیا۔ پھر اس نے کسی کے واپس جاتے قدموں کی آواز سنی اور پھر روشنی بھی غائب ہو گئی۔

اب باہر گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آیا کہ وہ کوٹھڑی سے باہر جا کر حالات کا جائزہ لے۔ وہ تھوڑی دیر چارپائی پر بیٹھی سوچتی رہی اور پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ صحن تاریک سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

دبے پاؤں چلتے ہوئے وہ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے آنگن کی ایک پتلی دروازے سے چپکا دی۔ جس کوٹھڑی میں وہ مسافر مقیم تھا۔ اندر کا ماحول واضح تھا۔ اس نے مسافر کو مندر دوسری طرف کیے بیٹھا ہوا دیکھا اس نے اوپر سے سیاہ چادر اتار دی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔

قریب ہی اس کی گٹھڑی کھلی پڑی تھی۔ جو سامان اس بوسیدہ سی دری پر بکھرا پڑا تھا وہ اسے دیکھ کر زارا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر سائیں سائیں ہونے لگی۔

دری پر ایک انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی ایک اُلو کا مردہ جسم اور کچھ ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ زارا کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

دروازہ یکدم کھل گیا۔ مسافر غیر ارادی طور پر پلٹا تو زارا کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا مسافر کی ایک آنکھ تھی جو پیشانی پر تھی۔ زارا نے اُس کی ڈراؤنی شکل دیکھی تو اس کی ایک اور

غزل

اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے؟
رسوائی سے ڈرنے والو بات تبھی پھیلاؤ گے

اُس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو تم تنہا رہ جاؤ گے

زخمِ تمنا کا بھر جانا گویا جان سے جانا ہے
اس کا بھلانا سہل نہیں ہے' خود کو بھی یاد آؤ گے

چھوڑو عہد وفا کی باتیں' کیوں جھوٹے اقرار کریں
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا' کل تم بھی پچھتاؤ گے

رہنے دو یہ پند و نصیحت' ہم بھی فرازؔ سے واقف ہیں
جس نے خود سوزِ غم سہے ہوں' اس کو کیا سمجھاؤ گے

احمد فرازؔ

چیخ نکل گئی اور پھر وہ بے ہوش ہوگئی۔

☆......☆......☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو اس نے ایک آنکھ والے کو اپنے اوپر جھکے پایا۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مسافر نے یکدم اپنے ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔

زارا اس خوفناک چہرے والے مسافر کی کوٹھڑی میں دری پر پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی اور دہشت سے اس کا پورا وجود کپکپا رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس پُراسرار شخص کو دیکھ رہی تھی۔ جس کا پورا چہرہ سیاہ تھا ناک کی جگہ صرف دو نتھنے تھے۔ وہ نوکیلے دانت باچھوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

"خبردار...... بے وقوف لڑکی...... اب آواز مت نکالنا...... ورنہ میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے آہستہ آہستہ لڑکی کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ زارا کو اس کی اکلوتی آنکھ سے عجیب مقناطیسی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس دہشت ناک چہرے والے شخص کو دیکھنے کی سکت نہ رکھ پا رہی تھی۔ فوراً اٹھ بیٹھی۔

"ٹھہرو...... کہاں جا رہی ہو؟"

"مم...... مم...... میں...... مجھے جانے دو۔" زارا لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

"ٹھہرو...... پہلے میری بات غور سے سنو۔"

"تم نے میرے بارے میں اگر کسی کو بتایا تو یاد رکھنا ساری عمر پچھتاؤ گی، جاؤ اور اب کسی کو بتانے کی بے وقوفی مت کرنا۔" زارا اٹھ کر بھاگی اور گرتی پڑتی اپنے بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کا من چاہا کہ بابا کو جگا کر سب کچھ بتا دے مگر پھر اسے اُس کی دھمکی یاد آ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے روز اس کا بابا اٹھا تو اس نے برابر والی چارپائی پر زارا کو عجیب حالت میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ کانپ رہی تھی۔

"سوہنی دھیے...... کیا ہوا؟" بابا پُرتشویش لہجے میں اُسے پکارتے ہوئے یکدم اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور دھیرے سے زارا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس کی پیشانی بری طرح تپ رہی تھی۔ اس نے بولا۔

"دھیے تجھے تو بہت تیز بخار ہے، ٹھہرو میں حکیم جی سے دوا لے کر آتا ہوں۔"

"ٹھ...... ٹھ...... ٹھہرو بابا مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جانا۔"

"مگر پتری تجھے تو بڑا تیز تاپ چڑھا ہوا ہے۔"

"نہیں بابا یہ ایسے ہی ہے اتر جائے گا تو پہلے میری بات سن لے۔ بابا اللہ کے واسطے اس مسافر کو ابھی فوراً چلتا کر دے۔ پھر میرا بخار خود ہی اتر جائے گا۔"

"کیوں دھیے کیا ہوا ہے...... کیا کیا ہے اُس نے...... وہ تو...... اچھا ٹھہر میں اسے ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔" وہ زارا کا جواب سنے بغیر باہر نکلا تو اسے مسافر کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔

وہ قریب گیا تو اس نے دیکھا مسافر نے بدستور سیاہ موٹی چادر کی بکل مار رکھی ہے اور وہ اپنی گٹھڑی باندھ رہا ہے۔

"میری بچی کو بہت تیز بخار ہوگیا ہے وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے تُو ذرا اس کا خیال رکھنا میں ابھی جا کر حکیم جی کو بلا کر لاتا ہوں۔"

"ٹھہرو...... میرے پاس دوا موجود ہے...... آؤ......" وہ اندر کوٹھڑی میں آ گئے۔ زارا اُس مسافر کو دیکھ کر دہشت سے کانپنے لگی۔

مسافر نے اُس کی پیشانی کو چھونا چاہا تو زارا خوف سے چلائی۔

"نن...... نن...... نہیں مم...... مم...... مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔"

"لگتا ہے اس نے رات میں کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے۔" اس کے بعد اُس پُراسرار مسافر نے نجانے زیرِ لب کیا پڑھ کر پھونک ماری کہ زارا کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اگلے ہی لمحے وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

"یہ سو گئی ہے...... اسے آرام کرنے دو...... اٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو چکی ہوگی۔"

☆......☆......☆

"تمہارا نام کیا ہے؟ اور تم نے اس گاؤں میں کس سے ملنا تھا۔" بابا فیروز نے پوچھا۔

"تم نام جان کر کیا کرو گے؟"

"ویسے بھی میں نے جہاں جانا تھا میں وہاں پہنچ چکا ہوں۔"

"ہاں میں ابھی آتا ہوں۔" پُراسرار مسافر وہاں سے چلا گیا۔ بابا فیروز اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے کو عورتوں کی طرح کیوں چھپا رکھا ہے۔

☆......☆......☆

لگ بھگ گھنٹہ گزرنے کے بعد بابا نے گہری نیند میں سوئی زارا کی پیشانی چھو کر دیکھی تو اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا وہ تو سرد تھی۔ بالکل نارمل...... بابا دل ہی دل میں اس مسافر کو دعائیں دینے لگا۔

بابا صحن میں آیا تو یونہی ایک نظر اس نے دوسری کوٹھڑی کی طرف دیکھا۔ جہاں مسافر مقیم تھا۔ مگر وہ باہر جا چکا تھا۔ البتہ اس کا سامان وہیں تھا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔

دن کے دس بج چکے تھے بارش کے بعد دن نکھر آیا تھا مگر راستے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ گلیاں کچی ہونے کے باعث گزرنا مشکل ہوگیا تھا۔ کاروبارِ زندگی رُکا ہوا تھا۔

گلی میں سے آواز آئی۔

"اللہ کے نام پر بھوکے کو کھانا کھلا دو۔" فقیر کی صدا سن کر بابا فیروز باہر نکلا۔ تو باہر دیکھتا ہے کہ ایک سفید داڑھی، سفید لباس اور چاندی جیسی دودھیا رنگت والا خدا کا بزرگ ہاتھ میں تسبیح پکڑے کھڑا ہے۔

بابا فیروز حیران تھا کہ باہر گلی میں ذرا برابر بھی جگہ سوکھی نہیں ہے مگر بابا جی تو جیسے قالین پر چل کر آئے ہوں۔ ان کے کپڑوں یا پاؤں سے بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسی گلی میں سے آ رہے ہیں۔

"کیا دیکھتا ہے بچہ......؟ اگر گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے تو ہمارے رستے سے ہٹ جا ہم آگے چلے جاتے ہیں۔" بابا کی آواز سن کر بابا فیروز ہوش میں آیا۔

"ارے نہیں نہیں بابا آپ اندر آ جائیں جو کچھ قسمت میں ہوگا حاضر کروں گا۔" بابا اندر داخل ہوئے تو زارا بھی اٹھ کر باہر آ رہی تھی۔

اس نے مودب انداز میں بابا کو سلام کیا۔ تو بابا نے زارا کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا خدا کا شکر ہے کہ اُس نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اور یہ سب تمہارے گلے میں لٹکی یٰسین شریف کی وجہ سے ہوا ہے۔ وگرنہ رات وہ بدروح تمہیں بھسم کر دیتی۔"

"چلو اب جلدی سے کمرے کی صفائی کرو تا کہ ہم تمہارے کمرے میں بیٹھ کر نوافل ادا کریں تا کہ وہ بدروح دوبارہ تمہاری جانب نہ آ سکے۔"

تو زارا ڈرتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھ گئی...... جبکہ بابا فیروز حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

□□......❁......□□

کراچی سے بھیجی گئی دور حاضر کے ولیوں کی داستان

روشن وجود

''جنید..... تمہارے اوپر بڑی آزمائش پڑی ہے۔ لیکن یاد رکھو جتنی بڑی آزمائش اور امتحان ہوتا ہے اتنی ہی بڑی جزا ہوتی ہے اور یہ دنیا ہے..... دیکھنا گزر جائے گی۔ اور دیکھنا رب کی رضا پر راضی رہنے والوں کی اللہ کیسے پشت پناہی کرتا ہے۔''

اُمِ ایمان

''بھلا کوئی ہمیشہ زندہ رہا ہے' حالانکہ یہ خواہش ہر ایک کی ہوتی ہے۔'' اُس نے رُک کر گہری سانس لی۔

''ہاں زندہ رہ سکتا ہے..... اور زندہ رہا ہے..... ہاں ہم میں سے بھی وہی زندہ رہے گا..... جو دلوں میں زندہ ہے..... اور دلوں میں وہ ہی زندہ رہتے ہیں جو خیر بانٹتے ہیں..... اور آسانیاں فراہم کرتے ہیں..... خواہ زندگی انہیں کیسے ہی امتحان میں ڈالے.....'' جنید کے چہرے پر جوش کے مارے ہلکی سی سرخی آ گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میری لوئیس نے اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر اُس کو غور سے دیکھا۔ جنید کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی۔ میری کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں جیسے اُس چمک کی تاب نہ لا پائی ہوں۔

میری لوئیس نیویارک کے ایک اسپتال میں استقبالیہ میں کام کرتی تھی۔ جنید کا جب بھی اسپتال کا چکر لگتا کاؤنٹر پر میری ہی بیٹھی ہوتی تھی۔ میری اس کے لیے اسپتال کی سلپ بناتے وقت لکھتے ہوئے تاکید کرتی کہ اس کے لیے وقت سے پہلے پہنچنا لازم ہے۔

''دیکھو سستی نہ کرنا..... نہ اِدھر اُدھر بیٹھ کر وقت ضائع کرنا' تم تو جانتے ہی ہو کہ ٹھیک ٹائم پر تمہارا ڈاکٹر سے ملنا اور دواؤں کا شیڈول طے کرنا کتنا ضروری ہے۔''

میری نے اس دفعہ جنید سے یہ بات مسکرا کر کی۔ ورنہ ہر دفعہ ایک مشینی انداز میں دہراتی تھی۔

جنید نے اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا کر پوچھا۔

''کیوں؟ آخر یہ ہدایت ہر دفعہ کیوں دیتی ہو؟''

''یہ بات ویسے تو میں ہر ایک سے کہتی ہوں جو اپنے ڈاکٹر سے وزٹ کے لیے وقت لینے آتا ہے لیکن تمہارے لیے یہ زیادہ اہم اور زیادہ ضروری ہے' اور یہ بات تم خود اچھی طرح جانتے ہو۔'' میری کی اسی بات کے جواب میں جنید نے وہ بات کی جس کو کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر جوش کے مارے ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی۔ آنکھیں چمکنے لگیں تھیں اور میری کی آنکھیں جیسے اُس چمک کی تاب نہ لا سکیں تھیں۔

جنید کاؤنٹر سے مڑ کر راہ داری کی طرف چلا گیا..... میری اس کو جاتا ہوا دیکھتی رہی جب تک کسی دوسرے نے اپنی سلپ بنوانے کے لیے اس کو متوجہ نہ کیا۔

جنید نے امریکہ آنے سے پہلے کراچی کی انجینئرنگ یونیورسٹی سے کیمیکل میں ڈگری لی تھی۔ کس قدر خوش تھے امی پاپا سونیا سجاد اور فاروق بھائی سب نے اسے کامیابی کی بڑی پُر جوش مبارکباد دی تھی۔ پاپا نے گلے لگایا امی نے ماتھا چوما اور زندگی میں ہمیشہ کامیابی کی دعائیں دیں وہ خود بہت خوش تھا۔

یونیورسٹی میں اس کا سرکل بہت وسیع تھا ایک طرف وہ دینی مزاج رکھنے والی طلبہ تنظیم کا پُر جوش ممبر تھا۔ دوسری طرف آزاد خیال برگر مزاج کے طالب علم بھی اُس کے پکے دوست تھے۔ تعلیم سے متعلق ہر مشکل میں انہیں جنید یاد آتا جو بغیر کسی تکبر کے بہت سہولت کے ساتھ ان کے مسائل حل کرنے میں جیسے پیش پیش رہتا۔

اسائنمنٹ جمع کرانا ہے ریسرچ کے لیے بکس کے لنکس درکار ہیں یا لائبریری جائے بغیر نوٹس چاہیں پروفیسر سے نمبر کے بارے میں بات کرنی ہے یا ٹیسٹ کا دن آگے بڑھوانا ہے۔ ہر ایک کے لیے جیسے وہ حاضر ہوتا اور ان کے لیے امرت دھارے کا کام کرتا تھا۔

بغیر کسی تخصیص کے ہر ایک کے کام آنا اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ بات اس نے اپنے ان دوستوں سے سیکھی تھی جو دینی مزاج کی تنظیم سے تعلق رکھتے تھے۔ وقت کم ہو یا زیادہ..... مقابلہ ہلکا ہو یا سخت انہیں کسی چیز سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

بس جو بات ٹھیک ہوتی، سچ ہوتی، مناسب اخلاق اور اقدار کی ہوتی وہی انہیں پسند ہوتی۔ ورنہ یہ عمر تو ایسی ہوتی ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا دکھتی ہے۔ جھلملاتے رنگ شوخ و شنگ رنگین مزاج کلاس فیلوز لہراتے بل کھاتے روپے اور بھی وہ بھی ندارد تنگ لباس کے باعث نظروں کو مقناطیسی انداز میں اپنی طرف کھینچتے قوس اور دائروں کے مختلف زاویے..... انجینئرنگ کی یونیورسٹی میں بھی لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ لیکن یہ جیسے کوئی لکھا ہوا اصول یا قانون تھا جس کو انہیں لازمی طور پر ماننا تھا کہ لڑکیوں سے صرف انتہائی ضرورت کے وقت ہی بات کی جائے گی۔ البتہ اُن کے مسائل کے حل کے لیے کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔

لوگوں کے کام آنا اور بدلے میں کسی قسم کی توقع نہ رکھنا آسان نہیں..... یہ اُسی صورت میں عادت بنتی ہے جب دلوں میں خلوص ہوتا ہے اور یہ سوچ کہ آپ کا عمل لوگوں کے لیے نہیں اللہ کے لیے ہے۔ کسی بھی فرد سے کی جانے والی نیکی کی بنیاد یہ سوچ بن جائے کہ میں یہ کام تو اللہ کے لیے کر رہا ہوں اور اس کا بدلہ مجھے اللہ کے پاس اللہ سے چاہیے بس پھر دیکھو مشکل سے مشکل وقت میں بھی دل کیسے آمادہ رہتا ہے..... ہر ایک کے لیے اچھا سوچنے اور اچھا کرنے کے لیے.....

یہ سبق جنید نے ابھی کی ہفتہ وار میٹنگ میں سیکھے تھے۔ فرحان جو کہ اگرچہ ایک سال جونیئر تھا لیکن ہمیشہ کچھ نئی بات کرتا جو سب کو چونکا دیتی۔ اُس دن اُس نے سوال کیا۔

''سب سے مہنگا اور گہرا رشتہ کون سا ہے؟''

سب یہی سوچ میں پڑ گئے۔ فرحان کا کہنا تھا کہ جواب تو ہر ایک نے دینا ہے اکثریت نے ماں کا بتایا کسی نے بیوی کا اور کسی نے دوست کا..... فرحان مسکرایا اور بولا۔

''آپ سب کے جوابات بھی ایک لحاظ سے ٹھیک ہیں لیکن یہ رشتے سب سے گہرے اور مہنگے اُس صورت میں ہوں گے اگر اُن میں خلوص ہوگا لہٰذا دنیا کا سب سے مہنگا اور گہرا رشتہ خلوص کا ہوتا ہے..... اور اگر یہ رشتہ آپ کو جان دے کر بھی حاصل ہو جائے تو مہنگا نہیں۔''

''بات ٹھیک ہے۔'' سب نے سر ہلایا۔

خلوص کو شعوری کوشش کے ساتھ دلوں میں بونا چاہیے اور اس کے لیے اللہ کی محبت پہلے کاشت کرنا ہوگی۔ انسان آخر کار وہ ہی بن جاتا ہے جو وہ لاشعوری طور پر بننا چاہتا ہے۔ وہ شخص کتنا بے وقوف اور اناڑی ہے جو گلاب سے اس لیے دور بھاگے کہ اُس میں کانٹے ہیں۔

انجینئرنگ کی ڈگری کے ساتھ ہی اُس کو ایک اور خوشی بھی ملی تھی اور وہ اسکالرشپ کی منظوری تھی۔ اس کے لیے اُس نے امریکہ کی یونیورسٹی میں کوئی چھ ماہ پہلے اپلائی کیا تھا۔ اس کے سارے کلاس فیلوز اس کو خوب مبارکباد دے رہے تھے۔ وہ بھی خوب خوش تھا۔ اُس کا خواب تھا ہائی اسٹینڈرز حاصل کرنے کا جو اُسے حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ابھی اس کی اطلاع اُس نے گھر میں نہیں دی تھی۔

گھر میں جب اس کی کامیابی پر سب نے خوب ساری مبارکباد دے دی ابا فاروق بھائی سجاد بہت پُرجوش تھے۔ سونیا نے اگلے دن پارٹی کا اعلان کر دیا کہ اپنے پیارے بھائی کو اپنے ہاتھوں سے بنائی چیزوں سے پارٹی دے گی۔''

''میں کیک بھی خود بناؤں گی۔'' سونیا جوش سے بولی۔

''دیکھ لو بھئی سونیا..... امی ابا کے پیٹ تمہارا کیک برداشت کر پائیں گے؟'' سجاد نے دبی دبی مسکراہٹ سے کہا۔

''بھیا آ آ آ..... میرا کیک بازار کے کیک سے زیادہ صاف ستھرا ہوگا اور مزے کا بھی..... میں نے کل ہی نیٹ سے ایک زبردست ترکیب نکالی تھی..... یوں بھی میں پہلے بھی بناتی رہی ہوں۔'' سونیا نے لاڈ سے بھائی کو جتایا۔

''ٹھیک ہے بھئی کل کی پارٹی سونیا کی طرف سے کل چھٹی کا دن ہے مسرور کو بھی بلا لو..... اُسے بھی تو اپنے بھتیجے کی خوشخبری ملنی چاہیے۔'' ابا نے اماں سے کہا۔

سونیا اور سجاد دونوں نے ایک ساتھ جنید کی طرف دیکھا اور بولے۔

''اور رابعہ کو بھی نا.....؟'' سونیا اور سجاد کی شرارت آمیز دبی دبی مسکراہٹ پر جنید جھینپ گیا۔

رابعہ مسرور چچا کی بیٹی تھی جنید سے چند سال چھوٹی تھی امی اور ابا دونوں کا جنید کے لیے رابعہ کا رشتہ لینے کا ارادہ تھا۔ جنید کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اُس نے اپنے روزگار سے پہلے کوئی قدم اٹھانے سے روک رکھا تھا۔

اگلے دن گھر میں خوب ہنگامہ تھا خوشیوں کی جگمگاہٹ سب کے چہروں کو روشن کر رہی تھی۔ مسرور چچا بھی آ گئے تھے۔ رابعہ سادہ سے کپڑوں میں تھی لیکن چہرے پر بچی خوبصورت مسکراہٹ تھی اُسے بڑا خاص بنا دیا تھا اس کے دونوں چھوٹے بہن بھائی جواد اور ثمرہ بھی بڑے خوش تھے۔ ہاتھوں میں تحائف لیے مسرور چچا پورے خاندان کے ساتھ بڑے پُرجوش انداز میں جنید سے ملے۔

سونیا اور رابعہ کھانا لگانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں لڑکوں نے شطرنج کی بساط بچھائی اور بڑے ڈرائنگ روم میں سنجیدہ سی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

کھانے کے دوران جنید نے اپنے اسکالر شپ کی خبر بھی بریک کر دی امی ابا کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر جنید کو احساس ہوا کہ اس نے خبر کے لیے ٹھیک وقت کا انتخاب نہیں کیا بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا خبر تو کھل ہی گئی تھی۔

امی ابا اور مسرور چچا اور چاچی نے پھر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھک لگائی تھی۔ سونیا نے دروازے پر کھڑے ہو کر چپکے چپکے کن سوئیاں لے لیں۔ معاملہ یہ تھا کہ جنید کا جانے سے پہلے نکاح کرنے کا خیال مشترکہ خیال بنتا جا رہا تھا۔ مسرور چچا اور چاچی ابھی خاموش تھے۔ بھائی کی بات پر انہوں نے سوچنے کا وقت مانگا تھا۔ جو بڑی خوشی سے دے دیا گیا تھا۔

اسکالرشپ کی تفصیلات آئیں تو پتہ چلا کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت..... روانگی کی تاریخ دو ہفتے کے بعد کی تھی۔ مسرور چچا نے ہاں کر دی تھی۔ لہٰذا جلد سے جلد نکاح کی تاریخ طے کر دی گئی جمعہ کا مبارک دن طے ہوا اور یوں جنید اور رابعہ کا نکاح کر دیا گیا نکاح اور امریکہ روانگی کے درمیان مشکل سے پانچ دن تھے۔

لہٰذا ان دونوں میں بات چیت تو ہوئی لیکن بہت زیادہ نہیں۔ امی نے ایک دن جنید کو اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ سونیا اور سجاد کے ساتھ رابعہ جواد اور ثمرہ کو کھانے پر لے جائے..... اور چاہے تو سمندر کنارے گھوم بھی لے..... جنید نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جلدی سے ایک شام سمندر کے نام کر پروگرام بنا لیا۔

سونیا نے موبائل پر ایک پیارا سا دعوت نامہ

بنایا جس کے کنارے کنارے ننھے ننھے رنگ برنگے جہاز خط غبارے اور دل لہرا رہے تھے۔ چمکیلے ستارے جگمگ کررہے تھے۔ رابعہ کو دعوت نامہ دیکھ کر بڑا مزہ آیا۔

سمندر کے کنارے باقی سب کو غیر محسوس انداز میں رنگین چھتری کے نیچے لگی کرسیوں پر بیٹھا چھوڑ کر وہ دونوں سمندر کے کنارے ساتھ ساتھ چلتے ذرا دور نکل گئے۔ گیلی ریت پر قدموں کے نشان بنتے جارہے تھے۔ ذرا بڑی لہر آتی تو انہیں لمحوں میں مٹا دیتی اونٹ اور گھوڑے رنگین لگاموں، نشتوں اور رنگین جھالروں والی سجاوٹوں کے ساتھ ساحل میں رنگ سا بھر رہے تھے۔ اونٹ کے کجاؤں کی شان بھی بڑی نرالی تھی۔ چمکیلی ساٹن کی شالین رنگین لٹکتی جھالریں کجاؤں کے آگے پیچھے آئینے کی گول قطاریں جو کبھی کبھی سورج کو بھی آنکھیں دکھاتی تھیں۔

چھوٹے بڑے بچے فٹبال سے کھیلتے ہوئے جن کے سامنے کی ٹیم سمندر کی لہریں تھیں۔ بچے ہر بار زور لگا کر فٹبال دور پھینکتے لیکن لہریں دوسرے ہی لمحے اُسے واپس ساحل پر ڈال دیتیں۔

جنید اور رابعہ زیادہ تر خاموش تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم مستقبل کے بارے میں متفکر لیکن پریشان نہیں تھے۔ جنید اور رابعہ کو جیسے ایک دوسرے پر ایسا اعتماد تھا کہ الفاظ کی اہمیت وہاں کچھ خاص نہیں رہتی۔

پھر بھی سونیا نے نقطہ سے بنے جنید اور رابعہ کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چند لمحے ایک ہی مقام پر پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑے دیکھ لیا...... اور اپنے موبائل پر زوم کر کے ایک دو تین چار تصاویر جلدی جلدی کھینچ لیں...... اللہ کرے کوئی تو اچھی سی آجائے۔

سونیا تصاویر دیکھ کر مسکرا دی ڈوبتے سورج کی سرخ اور سنہری کرنوں کے پس منظر میں جنید اور رابعہ ننھے منے مجسموں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نظر آرہے تھے۔ دوسرے دن یہ تصاویر سونیا نے دونوں کو یہ لکھ کر بھیج دیں۔

''سورج آپ کے وعدوں کا گواہ ہے۔''

تصویریں دیکھ کر دونوں کو مزہ آیا رابعہ کو تو جنید کے اس جملے نے زیادہ مزہ دیا۔

''ہمارے رشتے کا گواہ ہمارا رب ہے سورج کی جس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔''

جنید کو گئے پورا مہینہ ہوگیا۔ رابعہ نے اس دن حساب لگایا ابھی تو صرف مہینہ ہوا ہے جنید کی تعلیم کم از کم دو سال کی تو ہے ہی جنید اپنی یونیورسٹی کی مصروفیات میں مشغول تھا اس درمیان دونوں کے درمیان ایک آدھ میسجز کے سواء کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔

رابعہ نے بھی اپنی پڑھائی پر توجہ مرکوز کرلی تھی۔ رمضان کی آمد میں ابھی پورا مہینہ تھا۔ جب اُس دن رابعہ کو جنید کا پیغام ملا۔

''اے اللہ...... رمضان سے ایمان اور صحت کی سلامتی کے ساتھ ملائیے گا۔'' جواب میں رابعہ نے بھی میسج کیا۔

''اور پیارے رب ہم دونوں کو بھی ایمان اور صحت کی سلامتی کے ساتھ ملائیے گا۔'' فوراً ہی جنید کا آمین ثم آمین کا میسج آگیا۔

نیویارک میں جنید کے کئی کالج اور یونیورسٹی کے دوست تھے۔ انہوں نے وہاں باقاعدہ ایک حلقہ بنالیا تھا۔ جنید بھی اب ان میں شامل ہوگیا تھا۔ کسی مسجد میں جمعہ کی نماز یا کسی بھی چھٹی کے دن کی نماز میں وہ لوگ کوشش کر کے ملتے تھے۔

سب تو نہیں البتہ جس کو آسانی اور سہولت ہوتی وہ ضرور آتا چھوٹا سا تذکیر کا پروگرام بھی رکھ لیتے...... ایک آدھ پروگرام میں جنید نے کچھ بات کی تو سب نے اُس کے انداز بیان کو پسند کیا۔ اب تو جیسے یہ ذمہ داری مستقل جنید پر ڈال دی گئی تھی۔ پندرہ منٹ جنید کے لازمی ہوتے تھے۔ جنید نے خوشی سے حامی بھرلی تھی کہ اس کے لیے وہ روز قرآن حدیث کے ساتھ کچھ وقت گزارتا...... تاکہ ہفتہ بھر بعد اُس کے پاس کچھ کہنے کے لیے اچھے نکات موجود ہوں۔

رمضان گزر گئے جنید کو اپنے شہر کی تراویح کے اجتماعات بڑے یاد آئے پھر خاص طور سے تراویح کے بعد دوستوں کے ساتھ گپ شپ کیفے پیالہ کی لذیذ چائے پراٹھے کی محفلیں اس کے دو ساتھی حافظ نذیر اور حافظ طارق محمود جو مسجد میں سامع بھی تھے۔ انہیں تو بہت بھوک لگا کرتی تھی۔ لازمی ہر ایک کے پراٹھے سے دو دو نوالے ان کے لیے خاص طور سے ہوتے تھے۔

نیویارک یونیورسٹی کے ہوسٹل میں اس کا روم میٹ 'پیٹر اسمتھ' تھا۔ ماں یہودی اور باپ کرسچن تھا۔ بہت بولنے والا تھا۔ جنید اس کے لیے ایک اچھا سامع ثابت ہوا تھا۔ وہ جنید کے ساتھ خوش تھا۔ ایک دن کہنے لگا۔

''یار جونی...... تم جیسی میری ٹیک کیئر کرتے ہو ایسی تو کبھی میری ماں نے بھی نہیں کی۔''

اسمتھ جذباتی ہوگیا آنکھیں بھر آئیں۔ جنید اُسے چند لمحے غور سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے شفقت بھرا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ کر ہلکے سے دبایا۔

''نہیں یار کچھ ایسا بھی خاص نہیں کرتا میں۔''

''نہیں جونی...... میرا ناشتہ بنانا لانڈری پھر استری یہ کچھ خاص نہیں بہت خاص ہے...... امریکن تو بغیر مطلب کے کوئی کام کسی کے لیے نہیں کرتے۔''

''یار کبھی کبھی تو چلتا ہے میں کون سا روز تمہاری خدمت کے لیے کھڑا ہوتا ہوں۔'' جنید نے بات ختم کرنا چاہی لیکن اسمتھ نے آگے بڑھ کر پہلے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر گلے ہی لگ گیا۔

اسمتھ جنید سے متاثر تو تھا اس کے احسان تلے دب کر شکر گزار سا رہتا تھا۔

ایک دن جنید نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کرسکا۔ یوں جنید ایک دفعہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا پھر تو اسمتھ کو گویا ایک راستہ مل گیا۔ خلوص محبت بغیر کسی واپسی کے تقاضے کے...... اُسے جنید کے دوست جنید جیسے ہی لگے۔ ہر کلاس میں اُس کے پاس ایک ایک آدھ سوال ہوتا دین اسلام یا محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں...... سیکھنے کے لیے سوال جواب کا سلسلہ ہونا ضروری ہے...... یونیورسٹی کا پہلا سال مکمل ہوتے ہوتے اسمتھ کے دل میں مسلمان ہونے کا خیال پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن جنید اُس کے اس خیال کو عمل میں لانے پر کوئی سنجیدہ نہیں تھا۔

اُس کے مشاغل تو وہ ہی ہیں نام کا مسلمان ہونے سے کیا فائدہ؟ جنید صاف صاف کبھی کلاس کے آخر میں بول دیتا لیکن لگن سچی تھی۔ اسمتھ نہ صرف مسلمان ہوگیا بلکہ باقاعدہ اسلام اور قرآن کا علم حاصل کرنے لگا اور جلد ہی امریکن دوستوں کے لیے ایک باقاعدہ کلاس کا اہتمام کرنے لگا۔ جنید اور اُس کے سارے دوست بھی اُس کے ساتھ تھے۔

یونیورسٹی کی پڑھائی اور امتحانات کے ساتھ

ساتھ وہ ان کاموں کے لیے ہفتے میں دو گھنٹے نکال لیتے تھے۔ جنید کے لیے یہ اس لیے بھی ممکن ہوسکا کہ وہ اسکالرشپ پر تھا۔ اپنے اخراجات کے لیے اضافی رقم ہفتے میں تین دن شام کو کام کر کے اکٹھا کر لیتا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے اسمتھ کا اپنے والدین کے پاس جانے کا پروگرام تھا تا کہ انہیں اسلام کی دعوت دے اُس کے والدین فلوریڈا میں رہتے تھے۔

رابعہ کے میسجز آتے رہتے تھے۔ جنید کبھی کبھی کال بھی کر لیتا امی ابا سونیا اور سجاد بھائی سب ہی سے باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ سب کو اُس کی واپسی کا شدت سے انتظار تھا۔

یونیورسٹی کے فائنل ایگزام کے فوراً بعد اسمتھ فلوریڈا اپنی مما پپا کے پاس چلا گیا۔ اُسے انہیں اسلام کی طرف بلانے کی بڑی جلدی تھی۔ ریزلٹ کا بھی انتظار نہ کیا کہنے لگا۔

''بعد میں آ کر یا آن لائن ڈگری منگوا لے گا......'' جنید کا ڈگری مل جانے کے بعد چند ماہ نوکری کرنے کا ارادہ تھا تا کہ شادی کے لیے کچھ پیسے جمع ہو جائیں۔

چند ماہ چھ ماہ میں بدل گئے تھے۔ جنید نے اب سوچ لیا تھا کہ بس بہت ہو گیا۔ اس ماہ کے آخر تک پاکستان چلا جائے گا۔ جانے کی ساری تیاریوں میں فلوریڈا کا چکر بھی شامل تھا اسمتھ نے دھمکی دی تھی کہ ملے بغیر پاکستان گئے تو سخت ناراضی ہو جائے گی۔ سو ویک اینڈ پر اُس نے فلوریڈا کا پروگرام بنا لیا۔

بہت کامیاب اور خوشی سے بھرپور ملاقات رہی اسمتھ میں ایسی کوئی تبدیلی جو واپسی کی طرف لگے جنید کو نہیں لگی بلکہ زیادہ اسلامی اور مذہبی محسوس ہوا ماں اور باپ دونوں اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اسمتھ پُر امید تھا۔

''یار یہاں تم اور تمہارے دوستوں کا جیسا حلقہ نہیں ہے نا...... اور میرے اندر وہ خلوص نہیں ہے۔'' اسمتھ جذباتی سا ہو گیا۔

اسمتھ کی بات سن کر جنید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ظاہر ہے اچھی صحبت چاہیے ہوتی ہے اور فلوریڈا میں بھی ایسے مسلم موجود ہیں پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ جنید نے اُسی وقت اپنے دوستوں کو فون کر کے معلومات دینے کے لیے کہا...... یوں جنید رخصت ہونے سے قبل کچھ فون نمبر اسمتھ کو دے آیا۔

واپسی میں فلوریڈا سے نکلتے نکلتے ایک پیٹرول پمپ پر جنید نے گاڑی روکی۔ ٹنکی فل کرانے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کے لیے بھی لینا تھا۔

پیٹرول بھروا کر وہ ساتھ کی دکان میں داخل ہوا شیشے کا دروازہ اُس کے پیچھے بڑے زور سے کھولا گیا۔ جنید نے مڑ کر دیکھا ایک نیگرو اپنی ہاف پینٹ کی جیب سے پستول نکال رہا تھا۔

سخت طیش میں لگ رہا تھا۔ سرخ آنکھوں سے اس نے یہاں وہاں بکھرے لوگوں کو پکارا۔

''ہیے گائز کم ہیئر......'' مختلف چیزوں کو دیکھنے اور خریدنے والے کل چار ہی تھے اُن میں ایک جنید بھی تھا۔

نیگرو نے سب سے والٹ اور پرس حوالے کرنے کے لیے کہا ایک لڑکی نے اپنا پرس اُس کو دینے کے بجائے کاؤنٹر پر رکھا دیگر دونوں لڑکوں نے بھی اپنے اپنے والٹ رکھ دیے جنید نے پیچھے کی جیب سے والٹ نکالا تو وہ فرش پر گر گیا جنید نے جھک کر والٹ اٹھایا۔ یہ چند سیکنڈ تھے لیکن نیگرو کچھ خطرہ سمجھ کر انتہائی غصے میں آ چکا تھا۔ جنید کو لگا وہ پستول چلا دے گا۔ لیکن اس نے ایک لمحے جنید کو غور سے دیکھا اور اس کا بازو سختی سے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے دانت اُس میں گاڑ دیے۔

جنید ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا لیکن اتنی دیر میں اُس کے بازو پر دانتوں کا نشان اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ خون کی سرخی باہر نظر آ رہی تھی۔ نیگرو نے جنید کو بے نیازی سے دیکھا اور والٹ اور پرس سے ڈالر نکال نکال کر جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔

بس یہ کل دس منٹ کی بات ہو گی۔ وہ چلا گیا تھا۔ سب جلدی جلدی پریشانی میں بھاگنے کے چکر میں تھے۔ جنید اپنے بازو پر دانتوں کے نشان کو دیکھ کر شکر ادا کر رہا تھا کہ نیگرو نے پستول نہیں چلایا...... ورنہ وہاں یوں جان لے لینا معمولی سی بات تھی۔

چند منٹ میں سب بکھر چکے تھے۔ جنید نے زخم پر اسٹکی پیپر لگایا۔ کھانے کی چند چیزیں اٹھائیں اور دکان سے باہر آ گیا پیسے نہ ہونے کے باوجود دکاندار نے ہر ایک کو اُس کی ضروری اشیاء یوں ہی لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ دو تین منٹ کے اندر پولیس آ گئی تھی انہوں نے ضروری کارروائی کے بعد سب کو جانے دیا۔

واپسی میں گاڑی چلاتا ہوا بھی جنید شکر ادا کر رہا تھا کہ وہ پستول کی گولی سے بچ نکلا...... اسے کیا معلوم تھا کہ پستول سے زخمی ہونا زیادہ بہتر تھا...... بہ نسبت دانتوں کے اس زخم سے...... جس کے باعث اُس کی پوری زندگی مکمل طور پر بدل کر رہ گئی۔ نیویارک واپس پہنچ کر جنید اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلے مہینے یا زیادہ سے زیادہ اس کے اگلے مہینے وہ واپسی کا ٹکٹ خریدے گا۔ اگرچہ بہت زیادہ بچت تو نہیں ہوئی ہے لیکن پھر بھی اتنی ضرور ہے کہ وہ کچھ تحائف خریدے اور پاکستان میں اپنی شادی کے اخراجات خود اٹھائے۔ باقی ان دو مہینوں میں ٹکٹ کے پیسے جمع ہو جائیں گے۔

واپسی کے خوشیوں میں مگن سا تھا۔ اس نے اپنے بازو کے زخم کی طرف بھی توجہ نہ کی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ سوکھنے کے بجائے جیسے کچھ پھیل سا رہا تھا بلکہ اب تو پورے بازو میں ایک عجیب سا درد ہونے لگا تھا۔ اس کی انشورنس تو تھی نہیں لہٰذا ہاسپٹل جانے کے بجائے...... اس نے سوچا کہ اپنے دوستوں کے جاننے والے کسی پاکستانی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ یونیورسٹی کے ایک دوست نے ڈاکٹر ہمایوں سعید کا نمبر دیا دوسرے ہی دن جنید ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔

سادہ اور چھوٹا سا کلینک تھا۔ دو چار مریض تھے جو ٹائم لے کر آئے تھے۔ نرس نے جنید کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ وقت گزارنے کے لیے جنید نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا۔ رابعہ کی میل آئی ہوئی تھی۔

''کب آ رہے ہیں؟ ہم سب آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ میرے امتحان ختم ہو گئے ہیں سوچ رہی ہوں کوئی جاب کر لوں۔''

لمبی چوڑی میل میں بہت باتیں تھیں گھر کے روزمرہ کے واقعات یونیورسٹی کی مصروفیات اور ساتھ ساتھ جنید کی یادیں اور باتیں...... میل کے آخر میں سمندر کنارے والی تصویر بھی دی ہوئی تھی۔

جنید میل پڑھتا جا رہا تھا اور جیسے ذہنی طور پر وہیں پہنچ گیا تھا...... اتنا انہماک تھا کہ نرس کو دو دفعہ اس کو کہنا پڑا۔

''ڈاکٹر ہمایوں آپ کو بلا رہے ہیں۔'' جنید نے چونک کر دیکھا۔ کلینک خاموش سا تھا۔ مریض جا چکے تھے۔ جلدی سے جنید نے لیپ ٹاپ بند کر کے رکھا اور ڈاکٹر ہمایوں کے کمرے کی طرف چل دیا۔ جہاں نرس نے اشارہ کیا تھا۔

جنید کی ساری کہانی بازو کے زخم کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے ڈاکٹر ہمایوں نے غور سے سنی..... زخم کا معائنہ کیا۔

''آپ نے بہت بے احتیاطی کی ہے..... فلوریڈا میں نیگرو ایڈز کے مریضوں سے بھرا پڑا ہے۔ آپ کو فوری طور پر ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے تھا۔ میں آپ کے لیے ایڈز کا ٹیسٹ کر رہا ہوں کل اس کی رپورٹ آجائے آپ کل شام پانچ بجے تک آجائیے گا۔'' ڈاکٹر ہمایوں نے زخم پر دوا لگا کر ہلکی سی بینڈ یج کر دی۔ جنید ڈاکٹر ہمایوں کی بات سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے فق چہرے کو دیکھ کر ڈاکٹر نے جنید کا کاندھا تھپتھپایا۔

''دعاؤں پر یقین ہے نا..... تو پھر بس گھر جا کر خوب دعائیں کیجیے..... ہمارا رب بڑا مہربان ہے وہ دعائیں سنتا ہے۔'' اگلے دن جنید پانچ بجے کلینک میں تھا۔ ڈاکٹر ہمایوں خاموش تھے۔ اُس کی رپورٹ کا لفافہ ہاتھ میں لے کر انہوں نے جنید کو وہ تکلیف دہ خبر سنا دی۔

''سوری بوائے..... تمہارا ٹیسٹ مثبت آیا ہے۔''

''یعنی.....؟'' جنید نے ناسمجھی کے انداز میں سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''یعنی یہ کہ اب تم ایڈز کے مریض بن چکے ہو..... لیکن گھبراؤ نہیں یہاں امریکہ میں اس مریض پر بہت کام ہوا ہے لہٰذا تم ایک لحاظ سے نارمل زندگی گزار سکتے ہو۔'' ڈاکٹر ہمایوں نے جنید کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''لیکن تم کو مستقل اپنے ڈاکٹر اور ہسپتال کو رپورٹ کرتے رہنا ہوگا۔''

''میری انشورنس نہیں.....'' جنید کے منہ سے یہ جملہ ہکلاتا ہوا نکلا اور پورا بھی نہیں ہوا۔ یونیورسٹی کے ایڈمیشن کے ساتھ اُس کی انشورنس ہوئی تھی اور اسکالرشپ کے خاتمے اور ڈگری کے بعد ختم ہو گئی تھی جس کو دوبارہ شروع کرنے کا اُس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اب واپس جانا ہے۔

''گھبراؤ نہیں..... میں نے تمہاری انشورنس کی اپیلی کیشن سمیٹ کر دی ہے..... دیکھو ہو سکتا ہے میں ضرور کروں گا۔'' انہوں نے ایک انجکشن لگوانے کا اشارہ کیا۔ فون پر نرس ان کی ہدایت کے مطابق انجکشن تیار کر کے لے آئی تھی۔ روبوٹک انداز میں ہاتھ آگے کر دیا۔

جنید کو انجکشن کی سوئی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ نرس کے انجکشن لگانے کے بعد بھی اُس نے بازو نیچے نہیں کیا وہ ابھی تک شاک میں تھا۔

ڈاکٹر ہمایوں نے اُسے دیکھا..... تاسف کے ساتھ رکھ رکھاؤ اور افسوس کے ساتھ لیکن اس سلسلے میں جو وہ کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا اب معاملہ اُن کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

جنید نے نرس کو دیکھا جو نرمی سے اُس کے بازو کو نیچے کر رہی تھی۔

''یا اللہ..... مجھ پر رحم فرمایئے گا.....'' اس کے دل سے نکلا..... آنکھوں کے کونے سے ایک آنسو ٹپکا جنید نے زور سے آنکھیں جھپکائیں چاروں طرف دیکھا..... سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اُس خبر کو سننے سے پہلے تھا۔ بس اُس کے لیے اس کی دنیا اندھیری ہو گئی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟ میں کیا کروں گا؟ کیا میں

واپس پاکستان جا سکتا ہوں..... رابعہ کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار سکتا ہوں امی ابا..... جو اس کی راہ تک رہے ہیں' فاروق بھائی سجاد سونیا میرے پیارے بھائی' بہن اب میں اُن سے کیسے ملوں گا؟''

ایسے کتنے سوالات تھے جو پورے ہفتے صبح شام رات ہر لمحے ہر وقت اُسے پریشان کرتے..... جن کے جواب اُسے سمجھ میں نہیں آتے..... بس پورے ہفتے اس نے ایسے کمرے میں گزار دیا کہ زیادہ وقت قرآن نماز اور دعا..... رب سے رو رو کر دعائیں کرتا.....

''میرے رب میری غلطیوں پر مجھ کو نہ پکڑ..... میرے رحیم و کریم رب میں تو بڑی کوششیں کر کے دامن بچا بچا کر چلا ہوں میرے رب..... مجھے معاف کر دیجیے مجھے آزمائش میں مت ڈالیے میرے لیے راستے کھول دیجیے دیکھیے..... میں یہاں اکیلا ہوں مجھے کوئی تسلی دینے والا نہیں..... میرا حوصلہ بڑھانے والا نہیں..... بس تو ہی میرا سہارا ہے..... اور سب سہاروں سے بڑھ کر سہارا ہے میں بس تیرا دامن تھامتا ہوں مجھے اس امتحان سے سرخرو کر دیجیے مجھے اس آزمائش سے نکال دیجیے۔''

دعائیں کر کر کے تھک جاتا تو جاء نماز پر کھڑا ہو جاتا پتہ نہیں کتنی نمازیں پڑھیں..... کتنا قرآن پڑھا..... کیا کھایا..... کیا پیا..... کب سویا..... کب جاگا؟

ہاں یہ ضرور ہوا کہ ایک دن کے بعد دوسرا دن اُس کی ہمت کو بڑھا دیتا..... امید اور آس مضبوط ہو جاتی..... یہاں تک ساتویں دن جب چھٹی کا دن شروع ہوا اس کی بیل بجنا شروع ہوئی اُس نے مضبوط قدموں سے دروازہ کھولا۔ صد' قاسم' عبدالرحمان' نعمان' عبداللہ سب کے سب دوست مل کر آئے تھے۔ انہیں اطلاع مل گئی تھی۔

ڈاکٹر ہمایوں سعید اور ان کے مشترکہ دوست کے ذریعے سب نے کچھ نہ کچھ حوصلہ افزائی کی..... ہاتھ ملایا کندھے تھپتھپائے لیکن گلے نہیں لگایا۔

جنید نے اس بات کو محسوس کیا لیکن دل پر نہیں لیا۔ ظاہر ہے اپنی اپنی صحت کا معاملہ ہے..... حالانکہ ڈاکٹر نے اس طرح کی کوئی احتیاط نہیں بتائی تھی۔

''بس مجھے کسی کا کاندھا نہیں چاہیے میرے لیے میرے رب کا دامن کافی ہے۔'' اُس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

''یہ بات اپنی جگہ اہم تھی دل پر لگی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ جنید کے دوستوں نے حقیقت میں دوستی نبھائی اسپتال کے بہت سارے وزٹ کے لیے کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا..... اس کے کھانے پینے کے لیے فکر مندی کے ساتھ ہر چیز لا کر رکھی جاتی۔ قرآن کے تذکیر کے لیے اُسے ساتھ لے جایا جاتا۔ اس کے لیے سب مل کر شدومد سے دعائیں کرتے..... آنسوؤں کے ساتھ رب سے اُس کی پشت پناہی کے لیے دعائیں کرتے۔

یقیناً یہ ایسی مخلصانہ کوششیں تھیں کہ انہوں نے اپنا اثر ڈالا..... جنید سنبھل گیا..... اب اس نے خود اپنی دواؤں اور اسپتال کے وزٹ کا دھیان رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے روزمرہ کے معمولات میں واپس آ گیا تھا۔ اپنی جاب کے ساتھ اپنے آپ کو کیسے سنبھالنا ہے..... اب اپنی بیماری کا خیال بھی ہر لحہ سر پر سوار نہیں رہتا تھا..... کبھی کبھی پارک میں بیٹھ کر پھولوں سے باتیں کرنا بھی اچھا

لگتا تھا..... سب سے بڑی بات ابھی باقی تھی کہ پاکستان میں سب سے کیا کہنا ہے؟

کیا سچ سچ سب بتا دیا ہے یا چھپانا ہے واپس پاکستان جانا ہے یا نہیں ساری زندگی یہاں ہی گزارنی ہے۔

اس دن اسپتال سے واپسی پر میری لوئیس سے کیے گئے مکالمے پر اس نے خود بھی بہت سوچا۔

نرس میری لوئیس ہمیشہ ہی اس سے بہت خوش مزاجی سے باتیں کرتی تھی۔ ایسے خوبصورت نوجوان کو ایسی بیماری..... میری کی ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں اسی لیے وقت پر اسپتال کے لیے آنے دواؤں کے استعمال اور دیگر احتیاط بتاتی رہتی تھی۔

اس کی انہی باتوں کے جواب میں جنید نے کہا تھا۔

''میری اتنی فکر نہ کیا کرو..... بھلا کوئی ہمیشہ زندہ رہا ہے حالانکہ یہ خواہش ہر ایک کی ہوتی ہے کہ وہ زندہ رہ سکے ہاں زندہ رہ سکتا ہے اور زندہ رہا ہے..... وہ جو دلوں میں زندہ ہے..... اور دلوں میں وہ ہی زندہ رہتے ہیں جو خیر بانٹتے ہیں اور آسانیاں فراہم کرتے ہیں..... خواہ زندگی انہیں کیسے ہی امتحان میں ڈالے.....''

میری کو اس نے دوسری دفعہ ہی قرآن کا انگلش ترجمہ تحفے میں دیا تھا۔ بعد میں بھی ہر ملاقات پر وہ اُس کے لیے کوئی نہ کوئی مختصر پمفلٹ ضرور لے جاتا تھا۔ میری کو جنید کے امید بھرے جملے اور لہجے کے اخلاص نے ہی متاثر کیا تھا کہ وہ پھر اُس کی دی ہوئی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ قرآن کا ترجمہ پڑھا تو اسلام کی طرف جیسے کھنچی چلی گئی۔

جنید سے سوال کرنا شروع کیے تو جنید نے اپنے دوستوں کی مدد سے خواتین کے دینی حلقے سے متعارف کرا دیا ایک دن پھر بھی اُس نے پوچھ لیا۔

''تمہارے دین میں عورت کے احساسات کا دھیان نہیں رکھا گیا؟''

''کیا مطلب؟'' جنید نے کاؤنٹر کے پیچھے سے اس کے چمکیلے سنہرے بالوں والے سر کو دیکھا جو اب قلم ہاتھ میں لیے رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔

''بھئی تمہارے ہاں ایک مرد چار چار شادیاں کر سکتا ہے بھلا بتاؤ عورت یہ کیسے برداشت کر سکتی ہے؟'' میری اپنی سبز کانچ جیسی آنکھوں کو پورا پورا کھول کر جنید کو دیکھ رہی تھی۔ جنید نے نظریں جھکا لیں۔

''تو کیا ہر دوسرے دن گرل فرینڈ بن کر تبدیلی برداشت کر لینا آسان ہے؟ اور یہ تو بتاؤ کہ یہاں ایک لڑکے کی کتنی گرل فرینڈ ہوتی ہیں بھلا؟''

اسلام ایک مرد کو چار عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی اجازت دیتا ہے چار عورتوں کی کفالت کی ذمہ داری دیتا ہے کیا یہ بہتر نہیں ہے؟'' جنید نے مسکرا کر پوچھا تو میری نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔ جنید نے اپنے لیے دواؤں کے شیشے اُس کے ہاتھ سے لیے اور طویل راہ داری کے آخری سرے پر بنے شیشے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ میری کی نظریں آخر تک اس پر جمی تھیں یہاں تک کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

رابعہ کے ہر نتیجے اور ہر میل میں بے تابی کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ امی ابا سے جنید کی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ جب بھی اس سے واپسی کا پوچھتے وہ کہتا ابھی کچھ دن ہیں۔ اس کے لہجے

میں چھپی اداسی کی کیفیت کو امی نے محسوس کر لیا تھا' بار بار پوچھتی تھیں۔

''بیٹا کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ'' لیکن جنید کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ انہیں کچھ بتائے ہر دفعہ وہ انہیں ٹال دیتا ابا کو بھی پریشانی تھی کہ کہاں تو آنے والا تھا بس ایک دو ماہ کے اندر اندر اور اب کہاں آٹھ ماہ ہونے والے ہیں لیکن کوئی یقینی بات نہیں بتاتا ہے کہ کب آ رہا ہے۔

جنید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پاکستان میں امی ابا سے رابعہ سے کیا بات کہے؟ کیسے کہے؟ کہ اُس کے خواب کرچی کرچی ہو گئے ہیں جن کی چبھن اُسے چین لینے نہیں دیتی راتوں کو امی ابا کو خواب میں دیکھتا پریشان ہیں بلا رہے ہیں رابعہ آواز دے رہی ہے۔ صبح آنکھ کھلتی تو ذہن میں اضمحلال چھایا ہوتا..... سب طرف تاریکی چھائی محسوس ہوتی کیا کروں کیسے بتاؤ سوچتا اور اُلجھتا رہتا۔

ایک دن دوستوں سے اس معاملے میں مشورے کا سوچا۔ قرآن کے طے شدہ کلاس کے بعد جب زیادہ تر لوگ جا چکے تھے تو جنید نے اپنے دوستوں کو رُکنے کا اشارہ کیا صرف انیس تھا قاسم عبداللہ بھی پہلے بھی نکل گئے تھے۔ نعمان اور عبدالرحمان اس کے اشارے پر ٹھہر گئے۔

''یار تم لوگوں سے ایک مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔'' جنید نے دھیرے سے کہا۔

''ہوں..... بولو جنید کیا بات ہے؟''

''یار میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پاکستان میں سب کو کیا بتاؤں وہ لوگ آنے کے لیے زور ڈال رہے ہیں۔''

''تمہارا کیا ارادہ ہے جنید؟'' نعمان نے جنید کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''مجھے تو کچھ سوجھ نہیں رہا کیا کروں؟ تم کو تو پتہ ہے کہ یہاں اس مرض کی دوا ہیں اور انجکشن میرے لیے حاصل کرنا مشکل نہیں پھر چونکہ میرا مرض ابتدائی اسٹیج پر ہے تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ احتیاط اور دواؤں کے ساتھ آپ اپنی زندگی نارمل انداز میں گزار سکتے ہیں۔ یہاں اس کی ہر طرح اسٹڈی کی جا رہی ہے لہٰذا میرے لیے آسانی سے سب کچھ قابل حوصلہ ہے لیکن دوسری طرف میرے ماں باپ ہیں میری بیوی ہے جس سے میرا نکاح ہوا تھا۔ ان سے ملنے کی تڑپ تو مجھ کو بھی بے چین رکھتی ہے لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ بیماری کا علم ہونے پر میری قبولیت ہونا مشکل ہے۔ لیکن میں کسی کو بھی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔''

''تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے بتانا تو ہوگا امی ابا کے لیے بڑی شوکنگ نیوز ہوگی لیکن دینی بھی ضروری ہے۔ تم یوں کرو استخارہ کی دعا پڑھو اور ایک دن تہجد میں اٹھ کر اللہ سے اپنے لیے اور اپنے امی ابا اور دوسروں کے لیے ہمت کی دعا مانگو اور پھر بات کر لو.....'' عبدالرحمن نے جنید کو غور سے دیکھا اور آہستہ آہستہ بات مکمل کر لی۔

''دیکھو ہم بھی بات کر سکتے ہیں لیکن ان کو تمہارے الفاظ پر ہی یقین آئے گا۔'' نعمان بولا۔

''ٹھیک ہے میں اس ہفتے میں یہ کر لیتا ہوں تم لوگ بھی میرے لیے دعا کرنا۔'' جنید نے بھیگے لہجے میں کہا آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ آنسو اس کے دوستوں کے لیے بھی ایک آزمائش ہوں گے۔

اگرچہ ڈاکٹر نے اس کو یہ بتا دیا تھا کہ اُس کا

مرض ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ گلے ملنے ہاتھ ملانے وغیرہ سے یہ منتقل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی تم دوائیں لے رہے ہو لیکن جنید اپنے دوستوں کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ لہٰذا انتہائی ضبط کے ساتھ دوستوں سے رخصت ہوا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ نیگرو اگر تم کو ہاتھ لگاتا تو مرض منتقل نہیں ہوتا اُس نے جان بوجھ کر تم کو بازو میں کاٹا تھا کہ اس کا تھوک تمہارے خون میں لگے اور جراثیم منتقل ہوں۔

سارے راستے وہ یہ ہی سوچتا رہا کتنا شدید ظلم کیا اُس نے اس سے تو بہتر تھا کہ وہ گولی چلا دیتا۔

بہرحال اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے یہ ہی سوچ کر وہ آنسو پیتا رہا اور دعائیں کرتا رہا۔ خوب دعاؤں کے بعد اس نے اس دن ابا کو فون ملایا اور دھیرے دھیرے ساری بات بتا دی۔ ابا تو جیسے سن سے ہو گئے۔ انہوں نے فون فاروق بھائی کو دیا۔ جنید نے پھر اپنی بات دہرا دی۔ پریشان فاروق بھائی سوال پر سوال کر رہے تھے۔ جنید انہیں سمجھا رہا تھا اور پھر بیلنس ختم ہو گیا۔ جنید نے ایک گہری سانس لے کر فون کر دیا۔

اُس دن اس کو رابعہ کی میل ملی جس میں اُس نے منیر نیازی کی ایک نظم بھیجی تھی۔

نظم پڑھ کر جنید نے دل میں کہا۔

''رابعہ تم جان ہی جاؤ گی کہ بہت لوگوں نے اسے اکیلا بہت اکیلا کر دیا ہے...... شاید اُسے اب ساری زندگی اکیلا ہی رہنا ہے۔''

جنید کا فون ایک بم ہی تھا جس نے جنید کے گھر میں تباہی مچا دی۔

جنید کا چھوٹا بھائی سجاد جس کا ارادہ تھا کہ اپنی تعلیم مکمل کر کے باہر کی یونیورسٹی میں داخلہ لے گا۔ سونیا جو اپنے بھائی کے انتظار میں ایک ایک دن گن رہی تھی پھر اُس کی شادی کی تیاریوں کے منصوبے بنا رہی تھی۔ سب سے بڑا غم کا پہاڑ تو امی پر پڑا اُن کا لاڈلہ چہیتا نیک بیٹا جس کی پاکیزہ زندگی کی قسمیں کھائی جا سکتی تھیں ایسے امتحان میں پڑ گیا جس سے نکلنے کی کوئی سبیل ہی نہیں نظر آتی۔

سب کے فون پر فون آ رہے تھے۔ جنید باتیں کر کر کے تھک سا جاتا لیکن امید اور آس کا کوئی جگنو اس کے خود پاس نہ تھا کہ وہ لوگوں کو تھماتا۔

مسرور چچا کا فون بھی آیا۔ تصدیق کرنے کا سا انداز تھا۔ جنید نے ان کو پھر پوری کہانی دہرا دی۔

''ٹھیک ہے بیٹا ہم سب سوچتے ہیں تم بھی غور کرو اور اپنا خیال رکھو۔'' مسرور چچا نے دھیرے سے کہا اور فون بند کر دیا۔

بس اب تو اُن لوگوں کو فیصلہ کرنا ہو گا...... پتہ نہیں کیا فیصلہ کریں گے' بہرحال جو بھی کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ میرا دل مطمئن ہے میں نے کسی سے کوئی غلط بیانی کی نہ دھوکا دیا...... حالانکہ یہ سب اگر شادی کے بعد ہوتا تو کوئی کیا کرتا؟'' جنید نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔

صبح اُس کو نئی جاب پر جانا تھا۔ یہ اچھی جاب تھی اُس کی ڈگری کے لحاظ سے تنخواہ تھی۔ انشورنس کے پیسوں کی ادائیگی اب ذرا آسان ہو جائے گی۔ ساتھ باقی اخراجات بھی ہیں۔ یونیورسٹی کا ہوسٹل تو اُس نے چھوڑ دیا تھا۔ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرایہ پر لے لیا تھا...... باقی پیسے بچا کر ابا کو بھیج دیا کروں گا۔ اس نے دل میں ارادہ کیا۔

''پتہ نہیں کتنی اور کیسی زندگی باقی ہے؟'' یہ سوال تو بہت دفعہ اس کے دل میں اٹھا تھا اور ہر

دفعہ جواب دل سے ہی آتا...... یہ تو کسی کو بھی پتہ نہیں کہ کتنی اور کیسی زندگی باقی ہے۔ کم از کم چار ہفتے لگے...... اور پھر فیصلہ آ گیا۔

''ابا کا فون آیا کہ مسرور کہہ رہا ہے کہ رابعہ کو طلاق دے دو۔'' فیصلہ اس کے لیے تیر کی طرح تھا جو ٹھیک نشانے پر لگا تھا لیکن جنید کو فیصلہ سن کر زیادہ حیرانی نہیں ہوئی اس کو تو پہلے ہی اس کی توقع تھی۔ بھلا کون اپنی بیٹی کے ساتھ ظلم کر سکتا ہے۔ اس نے انتہائی ضبط کے ساتھ فیصلہ سنا۔

''ٹھیک ہے ابا کاغذات بھیج دیجیے میں دستخط کر دوں گا۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

لیکن آواز میں سکون سا تھا۔ ابا پریشان تھے ان کا لاڈلہ بیٹا پردیس میں اتنی بڑی آزمائش میں پڑ گیا ہے' ایسی آزمائش جس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔

''پھر بیٹا مستقبل کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟''

''ابا کسی کا کوئی مستقبل ہوتا اس کے بارے میں سوچے میرا تو کوئی مستقبل ہی نہیں ہے میں کیا سوچوں گا۔'' لہجے کا سکون ارتعاش میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ٹوٹے دل کی کرچیاں آنکھوں میں گھپ گئیں تھیں لیکن آنسوؤں کے ریلے میں آواز پُرسکون رہنا کمال ہے جو اس سے نہ ہو سکا۔ ہچکیوں کی ہلکی سی آواز ابا تک پہنچ ہی گئی۔ کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے دونوں طرف کوشش تھی کہ اپنے آپ کو سنبھال لیا جائے ایک دوسرے کو تسلی دی جائے لیکن تسلی کے آواز زبان پر نہیں چڑھ رہے تھے۔

ابا نے ہمت کر کے بیٹے کو پکارا۔

''جنید بیٹا...... مایوس نہ ہو...... مایوسی تو کفر ہے دنیا تو ہے ہی آزمائش کا گھر' نیک بندوں پر آزمائش آیا کرتی ہیں۔ ہمت اور حوصلے سے کام لو' اللہ کو پکارو وہ ہی ہے جو ہر مشکل اور آزمائش سے نکالنے والا ہے...... اور انشاء اللہ نکالے گا۔''

''جی ابا...... میں نے رب کا دامن ہی تھام رکھا ہے...... ورنہ شاید پاگل ہو چکا ہوتا...... اپنوں میں ہر مشکل آسان ہوتی ہے۔'' جنید کی سسکی نکل گئی۔ ماں باپ بہن بھائیوں کی یاد نے اسے پھر رُلا دیا۔

''بیٹا حضرت ایوب کی مشکل کو یاد کرو اُن کو بھی بڑی بیماری کی آزمائش نے گھیرا تھا۔ اُن کی دعا مانگو...... قرآن سے ڈھونڈو اور دیکھو قرآن کو تھام لو...... اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کو شفا کہا ہے اور شہد کو بھی اپنے استعمال میں خوب رکھو۔''

ابا سے بات کر کے جنید کو بہت حوصلہ ملا اپنوں کے الفاظ بھی بہت تاثیر رکھتے ہیں۔ حوصلہ اور ہمت افزائی کے ہوں تو بیٹھا بندہ کھڑا ہو جاتا ہے اور غصے نفرت اور طنز کے ہوں تو کھڑا بندہ لیٹ جاتا ہے۔ اس نے قرآن کھول کر حضرت ایوب کی دعا نکالی۔ سورۃ انبیاء کی آیت نمبر 83۔(میرے رب مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الرحمین ہے) جنید نے اس دعا کو وظیفہ بنا لیا۔

اس کا نیا آفس اسپتال کے قریب تھا۔ اس کا اسپتال کا وزٹ ڈیو ہوئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد وہ اسپتال آیا۔ ریسپشن پر کوئی اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلے رنگ کا اسکارف اُسے دور سے نظر آ گیا تھا۔ قریب پہنچ کر جنید نے اپنا کارڈ کاؤنٹر پر رکھا اور چابی سے کاؤنٹر ہلکا سا بجایا۔

نیلے اسکارف والا سر اوپر ہوا وہ ہی سبز کانچ

آنکھیں غور سے جنید کو دیکھنے لگیں۔

''یس مسٹر جنید.....'' ترشے ہوئے گلابی ہونٹ کھلے۔ جنید گڑبڑا گیا۔

''تم میری ہو؟'' نیلے اسکارف میں لپٹے چہرے نے مسکرا کر سر ہلایا۔

''یا اللہ میری تم مسلمان ہوگئی ہو؟'' خوشی سے جنید نے پوچھا۔

''جی ہاں الحمدللہ.....'' جنید نے زور و شور سے مبارکباد دی۔

واقعی جنید کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اگرچہ قرآن کے حلقے میں نومسلم ہونے کی ہر ہفتے کوئی نہ کوئی خبر ہوتی تھی۔ لیکن میری کے مسلم ہونے کی خوشی جنید کو اس لیے بھی زیادہ ہوئی کہ اس نے ہی میری کا تعارف خواتین کے دینی حلقے میں کرایا تھا۔

ایک لمحے کو اُسے پیٹر اسمتھ یاد آ گیا۔ اُسے تو کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ جنید کے ساتھ کیا قیامت گزر گئی ہے۔

جنید نے گھر آ کر اسمتھ کو فون کیا۔ اُس کے لیے بھی یہ خبر بہت شاکنگ تھی۔ لیکن اُس نے ضبط کے ساتھ جنید کو حوصلہ دیا اور اگلے ماہ تک اپنے آنے کے بارے میں بتایا۔

تھوڑا سا غصہ بھی ہوا کہ اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے خبر نہیں دی پھر یہ کہ اگر فوری حادثے کے بعد ڈاکٹر کے پاس جاتے تو یہ شاید معاملہ ایسا نہ بگڑتا۔

جنید اُس کے غصے پر خاموش رہا۔ اُسے اسمتھ کی محبت پر پیار آ رہا تھا۔ پھر بولا۔

''یار جو کچھ ہوا ہو گیا رب کی رضا پر میں راضی ہوں..... اب اگر مگر کرنے سے کیا فائدہ؟'' اسمتھ جنید کے اطمینان پر دل ہی دل میں حیران ہوا۔ یہ سکون اور اطمینان رب پر بھروسے کے بغیر حاصل ہونے والی چیز نہیں۔

اسمتھ کے آنے میں پندرہ دن تھے کہ جنید کو دو خبریں ایک ساتھ ملیں ایک رابعہ کی طرف سے میل جس میں سمندر کے کنارے والی تصویر میں دو ننھے مجسمے ایک دوسرے سے علیحدہ دور دور کر دیے گئے تھے اور درمیان میں سیاہ تاریک اندھیرا تھا۔

بات واضح تھی رابعہ بھی علیحدگی کے لیے تیار تھی۔

اور دوسری اطلاع اسلامک سینٹر کی خاتون منتظمہ مسز شریں حق کی طرف سے ملی تھی۔ میری اسی سینٹر میں کلاسوں میں شرکت کر رہی تھی۔ مسز حق نے فون پر جنید کو بتایا۔

''میری کا کہنا ہے کہ اگر جنید پسند کرے تو وہ جنید سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔'' بات ہی ایسی تھی جنید بہت حیران ہوا۔ پھر ذرا رک کر بولا۔

''مسز حق میں اس سلسلے میں سوچ کر بتاؤں گا لیکن کیا میری کو میری بیماری کا مکمل علم ہے؟'' حالانکہ جنید جانتا تھا کہ یقیناً علم ہے اسپتال میں وہ ہی تو اس کے لیے ڈاکٹر کی وزٹ اور رپورٹس وغیرہ فائنل کرتی ہے۔ جنید کو اس کے سارے جملے بھی یاد آ گئے جن میں وہ اُس کے ریگولر وزٹ کے لیے ضروری ہدایت دیتی تھی پھر بھی.....؟

''اور کیا یہ ممکن بھی ہے؟'' مسز حق نے اطمینان دلایا۔

''میری کو معلوم ہے اس معاملے میں اس کی کافی ریسرچ ہے۔'' جنید پھر حیران ہوا۔

''ریسرچ ہے..... آخر اُس نے ریسرچ کی ہی کیوں ہے؟'' تقریباً سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ میری کیا جب سے اُس میں دلچسپی رکھتی تھی اور کیا اسی لیے اسلام کی طرف متوجہ ہوئی ہے؟

جنید اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑا۔

''میں کہاں کا شہزادہ گلفام پھر جسے ایڈز جیسی بیماری ہو اسے کون قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے اور جس کی اپنی بیوی اپنی منکوحہ علیحدہ ہونا چاہتی ہو۔'' ہنسی کے ساتھ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔ وہ ہنسے یا روئے.....

دل نے کہا جو غم ماضی کا حصہ بن گئے ان پر رنجیدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک نئے غم کو دعوت دے رہے ہیں اور دیکھو غموں کی مثال بچے کی مانند ہے یہ پرورش سے بڑھتے ہیں۔

حقیقت کا سامنا کرو وقت کے ساتھ ساتھ اللہ ہر مسئلے کا حل نکال دیتا ہے۔ میری کی بات پر غور کرو سوچو استخارہ کرو پھر فیصلہ کرو..... یہاں تعلیم کے لیے آتے ہوئے تمہارا دوسرا مقصد دیار کفر میں اسلام کی تبلیغ تھا۔ کیا پتہ یہ رستے اسی کے لیے بن رہے ہوں اپنی مثبت سوچ پر وہ کھل کر مسکرایا۔

آج اُس نے بہت عرصے بعد سوچا تھا کہ وہ پورا دن تفریح کرے گا اپنے لیے..... اپنے آپ کو غم اور اندوہ سے نکالنے کی شعوری کوششیں کرے گا' پہلے اُس نے سوچا کہ دوستوں کو بھی لے لے' ویک اینڈ ہے ان کی بھی چھٹی ہوگی۔ لیکن پھر خود ہی اپنے ارادے کو بدل دیا دوستوں کی مجبوریوں کا اسے علم تھا۔ کیا ضرورت ہے انہیں مشکل میں ڈالنے کی۔

بس اب غموں کو سر پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے پچھلی تذکیر کی تیاری میں پڑھی گئی حدیث یاد آ گئی۔

''جو شخص اپنے تمام غموں کو ایک غم (غم آخرت) بنا دے گا اللہ اس کے دنیا اور آخرت کے تمام کام بنا دے گا۔''

بس اول و آخر تمام کام بنانے والا رب ہے۔ بس اُسی کا دامن خوب مضبوطی سے تھام لو۔ اس کا ارادہ اسٹیچو آف لبرٹی وزٹ کرنے کا تھا۔ سمندر پانی کا سفر اور سبزہ پھول جو اس کی کمزوری تھے اُس نے فیری کے سفر کا انتخاب کیا مین ہیٹن مجسمہ آزادی پہنچ کر خوبصورت پھولوں سے بھرے باغ کے پُرسکون کنج میں بیٹھ کر نوکیلے کانٹوں کا تاج پہنے مجسمہ آزادی کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

لوگ بھاگ بھاگ کر لائن میں لگ رہے تھے۔ لفٹ سے اوپر جانے کا وقت مقرر تھا۔ لیکن اُسے اوپر نہیں جانا تھا۔ اول تو دل ہی نہیں تھا اتنی بھیڑ بھاڑ میں جانے کا..... اور دوسرے اسے اپنے ڈاکٹر کی نصیحت یاد تھی کہ مشقت والے کام اور بہت زیادہ لوگوں کے ہجوم سے دور رہنا۔

بس وہ لوگوں کو دیکھ رہا تھا دنیا کی گہما گہمی پھولوں کا حسن سبز دبیز گھاس..... اس کے ساتھ ہی اُسے میری کی سبز آنکھیں یاد آ گئیں۔ اُس کا غور سے دیکھنا یاد آ گیا..... اس پر بھی تو سوچنا ہے۔ سب سے پہلے اللہ سے مشورہ کرنا ہے دوستوں کے سامنے بھی بات رکھنی ہے۔

آخری زندگی کا کوئی تو راستہ اختیار کرنا ہی ہے۔ پھر وہ جو خود جانتے بوجھتے تم کو اپنانے کو تیار ہے اس کا انتخاب مناسب نہیں..... اس کے دل نے کہا۔

''امی ابا سے بھی پوچھنا ہے..... دیکھو وہ کیا کہتے ہیں؟'' اس نے سوچا۔

''سب سے پہلے مجھے میری سے خود مل کر تصدیق کرنی چاہیے۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنے لائحہ عمل کا پہلا نکتہ طے کیا۔

تین ہفتے گزر گئے سوچ بچار کرتے کرتے

اسپتال کی وزٹ کا دن آ گیا۔
''آج مجھے میری سے بات کرنی ہے۔''
کاؤنٹر پر آج وہ سبز اسکارف میں تھی۔ فائل نکلوانے کے بعد بھی کچھ دیر وہ کاؤنٹر پر کھڑا رہا۔
میری نے سر اٹھا کر دوبارہ اُسے دیکھا جنید نے اس سے کہیں بیٹھ کر بات کرنے کے بارے میں پوچھا۔
''ٹھیک ہے میں چار بجے فری ہو جاؤں گی۔'' جنید نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔
''ابھی ایک گھنٹہ ہے میں انتظار کروں گا...... باہر لابی میں......''
ٹھیک چار دس پر میری شیشے کا دروازہ کھول کر باہر آئی جنید ساتھ ساتھ چلتا ہوا کینٹین تک آیا۔
''یہاں بیٹھو میں کافی لاتا ہوں۔'' کھلی ہوا میں اُسے سبزے اور پھولوں کے درمیان ایک نشست پر بٹھا کر جنید کینٹین سے کافی لے آیا۔
کافی ہاتھ میں لیے دونوں خاموش تھے۔ آخر جنید نے پوچھا۔
''کیا واقعی تم سنجیدہ ہو؟'' میری نے اپنی سبز آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اثبات میں سر ہلایا۔
''تم میرے بارے میں جانتی ہو...... میرا مطلب ہے میری کیس ہسٹری وغیرہ......'' میری نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔
''تم میرے بارے میں جانتے ہو؟'' میری نے پوچھا۔ جنید نے نفی میں سر ہلایا۔
''جاننا چاہتے ہو؟'' میری نے دوبارہ پوچھا۔ جنید نے سر ہلایا۔
میری کی آنکھیں جنید سے ہٹ کر دور کہیں کچھ دیکھنے لگیں شاید ماضی میں......
''جونی...... میرے ماں باپ کون ہیں میں خود ان کے بارے میں نہیں جانتی اس لیے ان کے بارے میں، میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ میری زندگی یتیم خانے میں گزری ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے فوسٹر ہاؤس کی میڈم سنتھیا سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے یہ ہی بتایا کہ مجھے کوئی یہاں چھوڑ گیا تھا بنا نام پتہ بتائے۔
''خیر یہ معاملات تو یہاں بہت نارمل ہیں۔ لیکن تمہارے لیے حیران کن ہوں گے۔ پتہ نہیں میرے ماں باپ نے شادی کی ہوئی یا نہیں کیونکہ امریکہ میں آدھے سے زیادہ بچے ایسے ہیں جن کے ماں باپ نے شادی نہیں کی ہوتی بعض دفعہ بچے ہونے کے بعد شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں لیکن اب معاشرے میں میرا مطلب ہے امریکن معاشرے میں ان باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔''
میری کچھ دیر چپ ہو گئی اس نے گردن موڑ کر جنید کو گہری نظر سے دیکھا شاید ان باتوں پر وہ اس کے تاثرات جاننا چاہتی تھی۔ جنید خاموش تھا اس کی بات مکمل سننے کے لیے اس نے ہلکی سی ہوں کی...... یعنی پھر؟
''لیکن میرے لیے یہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں انسانی رشتے محبتیں پیار...... میں ان کی بڑی ترسی ہوئی ہوں...... شاید تمہاری طرف اور تمہارے توسط سے دینِ اسلام کی متوجہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہی ہے۔ یہاں تو بغیر رشتوں کے ہی اتنا پیار ہے...... پھر پتہ نہیں رشتے بننے کے بعد کتنا ہوگا؟'' میری کھل کر مسکرائی۔
''رہی تمہاری بیماری تو یہ ایک واقعی سیریس مسئلہ ہے۔ امریکہ میں یہ مرض بعض ریاستوں میں تو بہت عام ہے۔ دواؤں اور احتیاط کے ساتھ لوگ اس سے نمٹ ہی رہے ہیں ہم بھی نمٹ لیں گے۔'' اب کی دفعہ میری کی سبز آنکھیں بھی مسکرا اٹھیں۔
''تم بھی تو کچھ بولو......'' میری نے جنید کا بازو ہلایا۔ جنید سنبھل کر پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔
''میری...... یوں کرتے ہیں کہ میں بھی اس پر سوچتا ہوں اپنے ماں باپ سے مشورہ کرتا ہوں تم بھی سوچو......''
''تمہیں پتہ ہے یہاں آنے سے پہلے میری ایک طرح سے شادی ہوئی تھی۔ لیکن اب میری بیوی کو مجھ سے طلاق چاہیے...... اس بیماری کے بعد...... ایسا نہ ہو کہ تم بھی کچھ دنوں میں اپنا ارادہ بدل لو۔'' جنید کے لہجے میں دکھ کی کیفیت تھی۔
''نہیں نہیں...... میں تو یہ سوچتی ہوں کہ یہ پلس پوائنٹ ہے کہ جدائی کا سوچا نہیں جا سکتا خاص طور سے تمہاری طرف سے تو مجھے اطمینان ہے میری طرف تمہیں اطمینان ہی رکھنا چاہیے کہ میں رشتوں کو جوڑے رکھنے کے لیے آخری حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔''
کافی ختم ہو گئی تھی۔ جنید نے میری کو مزید سوچنے کا کہا اور کچھ دنوں بعد دوبارہ ملنے کا کہہ کر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔
دو ماہ میں طلاق کے پیپر مکمل ہو گئے اس درمیان جنید اور میری ہفتے میں ایک بار مسز حق کی موجودگی میں چند منٹ ملے جنید نے میری کو باقاعدہ دین کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی اور میری کا کہنا تھا کہ وہ اس کے لیے پہلے ہی کلاسز لے رہی ہے۔
جنید نے ابھی تک اس بارے میں امی ابا کو نہیں بتایا تھا...... طلاق کے بعد پھر ابا کو بتایا...... اور اجازت کے لیے کہا۔
''ابا...... دیکھیے میں نے کوئی بات آپ سے

جل پری کا عشق

لہروں کے دوش پر
ساکت جذبے بہہ رہے ہیں
اور...... مدوجذر کی سُندرتا
شفاف سینہ
بے کل مچلتا
بپھرتا پٹختا
یہ جلترنگ سا
میرے ظاہری ساکت سے...... لیکن
بے کل جذبوں سے کہہ رہا ہے
آؤ کہ لہریں پکارتی ہیں
اور پانیوں کی......
سُندرتا میں......
میں آنکھیں کھولے
تیری منتظر ہوں

رخسانہ نور

چھپائی نہیں ہے اب آپ مجھے بتائیے آپ اجازت دیں گے تو میں شادی کروں گا ورنہ ساری عمر ایسے ہی گزار دوں گا۔'' جنید نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

ابا نے ساری بات سنی پھر بولے۔

''بیٹا میں چند دن میں تم کو بتاتا ہوں۔'' یہ چند دن جلدی سے گزر گئے۔ جنید اس معاملے میں نہ کوئی ایکسائٹمنٹ تھی نہ انتظار نہ خوشی اسی لیے اس کو پتہ ہی نہیں چلا کہ چند دن نہیں چند ہفتے گزر گئے ہیں اور پھر ابا کا فون آ گیا۔ انہوں نے خوشی سے پوری آمادگی ظاہر کی۔

''بیٹا تمہارے لیے دعائیں کرتی نہ تمہاری ماں تھکتی ہے نہ میں..... اللہ تمہیں خوش رکھے اور زندگی کی ہر خوشی دکھائے.....'' ابا آبدیدہ ہو گئے۔

میری اور جنید کی شادی میں جنید کے دوستوں نے سارے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ اسلامک سینٹر میں سادہ سی تقریب کے بعد جنید میری کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا۔ جسے اُس کے دوستوں نے مل کر سجا سادیا تھا۔

ساری احتیاطوں' دواؤں انجکشن اور ڈاکٹر کے وزٹ کے ساتھ اُن کی شادی کو چھ ماہ گزر گئے جب میری نے جنید کو اپنی بچوں کی خواہش کا بتایا۔

''کیا یہ ممکن ہے؟'' جنید حیران تھا۔

''ہاں جونی آج کل آرٹیفشل طریقے موجود ہیں پھر ہم ٹیسٹ ٹیوب کے طریقے سے اپنے بچے حاصل کر سکتے ہیں۔''

بس پھر ایک سال کے بعد ابراہیم اُن کی گود میں تھا اور اگلے دو سالوں بعد اس طریقے سے وہ دو جڑواں' بیٹوں یونس اور یوسف کے ماں باپ بن گئے۔ ان کا گھرانہ بڑا مکمل تھا میری جو اب ماریہ کہلاتی تھی بے انتہا خوش تھی۔

اس کو مسز شیریں حق کا اسسٹنٹ بنا دیا گیا تھا۔ بچوں کے بعد جنید نے اسے فی الحال جاب چھوڑنے کے لیے کہا تو وہ خوشی سے مان گئی۔

بچوں کے ساتھ اب وہ اپنا زیادہ وقت اسلامک سینٹر کو دے رہی تھی۔

اس دن ماریہ نے مسز شیریں حق کو بتایا کہ جنید کا ارادہ ہے کہ بچوں کو مکہ اور مدینہ کی یونیورسٹیوں سے عالم کا کورس بھی کروائے گا اور امریکن یونیورسٹی کی بھی تعلیم دلائے گا تاکہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ امریکن معاشرے کو مخاطب کر سکیں اور دین اسلام کی دعوت دے سکیں۔

اور مسز شیریں نے کہا تھا کہ انہیں اس بات کا یقین ہے کیونکہ بچوں کے ماں باپ اس وقت اپنی زندگیوں میں یہ ہی کام کر رہے ہیں اور بچے سب سے زیادہ اپنے والدین سے سیکھتے ہیں۔

جنید نے خود پاکستان جانے کے بجائے امی ابا کو امریکہ بلوا لیا تھا۔ جو اپنی بہو اور پوتوں سے مل کر بے انتہا خوش ہوئے اُن کے ساتھ سجاد کو بھی بلایا تھا جس کو جنید نے نیویارک یونیورسٹی کے شعبہ میڈیا سائنسز میں داخلہ دلایا تھا۔

''اس وقت اسلام کو میڈیا کے میدانوں کے شہسوار درکار ہیں۔''

''میرے بھائی تم پوری محنت سے اس شعبے میں تعلیم حاصل کرو اور پھر میڈیا کے میدان میں اسلام کا مقدمہ پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ پیش کرنا..... ساری دنیا میں مسلمانوں کو دہشت گرد مشہور کیا گیا ہے حالانکہ مسلمانوں پر ظلم کی ساری حدیں آج پار کر لی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی نسلوں کو ختم کرنے کے لیے اب نشانہ معصوم بچوں کو بنایا گیا ہے۔'' سجاد نے بھائی کی بات غور سے سنی اور اثبات میں سر ہلایا۔

جنید نے ابا کی طرف دیکھا..... دونوں شاید ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ابا نے جب یہ کہا۔

''قسمت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر جدوجہد اور سعی تو ہمارے اختیار میں ہے۔'' تو جنید اور ابا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھے۔ اسمعہ جنید کی شادی سے پہلے وعدے کے مطابق ایک دفعہ ملنے آیا تو کہنے لگا۔

''جنید..... تمہارے اوپر بڑی آزمائش پڑی ہے۔ لیکن یاد رکھو جتنی بڑی آزمائش اور امتحان ہوتا ہے اتنی ہی بڑی جزا ہوتی ہے اور یہ دنیا ہے..... دیکھنا گزر جائے گی۔ اور دیکھنا رب کی رضا پر راضی رہنے والوں کی اللہ کیسے پشت پناہی کرتا ہے۔'' جنید اُس کے یقین کی کیفیت پر رشک کرتے ہوئے دل ہی دل میں متعجب تھا۔

اس کے منہ سے نکلا۔

''کیسے؟''

''ایسے جیسے انبیاء کی کرتا تھا اور اب ہر مومن اور یقین رکھنے والے کی کرتا ہے۔'' اسمعہ مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔

''جیسے مجھے یقین ہے کہ میری کرے گا اور میرے ماں باپ بالآخر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔'' جنید کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اس کا دل اسمعہ کی باتوں پر خوش تھا۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو تو خوشی کے تھے۔ اُس نے زیر لب آمین کہا۔

اسمعہ کی گمن کا میاب ہو گئی تھی۔ جب اسمعہ جنید کی شادی پر اپنے والدین کے ساتھ شریک ہوا تقریب میں اُس کے والدین نے جنید کو مبارکباد دی اور مائیک پر آ کر اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا۔

''اسمعہ نے اتنا پیارا اور فرمانبردار بیٹا بن کر دکھایا کہ ہمیں اسلام کی حقانیت کا یقین ہو گیا۔ واقعی مذہب اسلام میں تبدیل کر دینے کی حیران کن طاقت ہے۔''

جنید کے نکاح کا خطبہ اس کے دوست عبدالرحمن نے دیا تھا دولہا دلہن کے لیے برکت کی دعا کے بعد مختصر سی گفتگو میں حاضرین محفل کو مخاطب کر کے کہا۔

''آپ سب یہاں امریکہ میں اسلام کے سفیر ہیں۔ ہمارے قول و فعل ہی ہماری تبلیغ کا سب سے اہم ذریعہ ہیں جس کے ذریعے ہم لوگوں میں اسلام کی حقانیت کا سکہ بٹھا سکتے ہیں..... ایک اہم بات یاد رکھیں اللہ نے ہر قوم میں اُسی کی قوم کے فرد کو نبی بنا کر بھیجا کیونکہ ایک قوم کا فرد اپنی قوم کو جتنی اچھی طرح قائل کر سکتا ہے دوسرا نہیں کر سکتا لہٰذا ہم کو یہاں کے ہی لوگوں کو مبلغ بھی بنانا ہے..... جو اپنی قوم میں دین اسلام کو پہنچائیں..... مثالیں تو بہت ہیں۔ لیکن ابھی ایک مثال ہمارے سامنے اسمعہ کی ہے جس کی تبلیغ سے اُس کے ماں باپ سمیت اور کتنے ہی لوگ اسلام کے قریب آئیں گے۔''

''آیئے..... عہد کریں کہ ہم اپنا کام پوری جانفشانی اور ایمانداری سے زندگی کی آخری سانس تک کرتے رہیں گے کیونکہ دنیا میں نیک کام کرتے ہوئے مرجانا آب حیات پینے سے بہتر ہے۔

بلا سے شب ہے اندھیروں کا ناگ پالے ہوئے
میرا چراغ اجالوں کو ہے سنبھالے ہوئے
کوئی بھی موج بلا خیز کیا ڈبوئے گی
ہمارا عزم جواں ہے ہمیں اچھالے ہوئے
نکل گئے ہیں وہ ہی تیرگی کے جنگل سے
جو اپنی زیست کو ہیں روشنی میں ڈھالے ہوئے

سرگودھا سے ارسال کردہ بے مثال تحریر

مرشد کامل

شعاع مہر خود بے تاب ہے جذب محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شپرک کی

حافظہ مون بخاری

عبداللہ عراق کا مشہور ہلاکت خیز ڈاکو اور ستم پیشہ قاتل آج ایک مہم سے پلٹ کر گھر آیا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ ساتھیوں نے رخصت ہوتے وقت پوچھا۔

''سردار..... دوسری مہم کی تیاری کب تک ہوگی؟'' آج جانے کیا بات تھی کہ اس سوال پر عبداللہ خوش نہ ہوسکا۔ اس نے بے دلی سے کہا۔

''ابھی کہنا قبل از وقت ہے۔ جب بھی ارادہ ہوگا اطلاع کردی جائے گی۔''

جب وہ بستر پر لیٹا تو دل کسک سے بھر گیا۔ اسے لگا دل کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے وہ گھبرا کر اٹھا۔ پھر دوبارہ منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ لیکن دل کا دروازہ نیم باز ہو چکا تھا۔

ہاتف غیبی سے سرگوشیوں کے لیے گنجائش نکل آئی۔ بہت دھیمی آواز میں کوئی کہہ رہا تھا۔

''ظالم..... پیچھے پلٹ کر دیکھو تیری زندگی کا ہر ورق سیاہ ہو چکا ہے۔ مظلوموں کی آہ اور گناہوں کا بوجھ تیری گردن توڑ دے گا۔ اور تو مالک جبار وقہار کے سامنے لایا جائے گا تو دہشت وجلال سے تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ اٹھ اپنے خاکی جسم سے یہ شیطان کا پیراہن نوچ پھینک..... روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کرلے۔''

یہ آواز نشتر کی طرح عبداللہ کے جگر میں گڑ گئی۔ وہ گھائل ہوگیا۔ عمر بھر کی کثافتوں کا غبار سیلاب بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔ وہ عالم اضطراب میں اٹھا۔

اور اسی وقت اپنے قابل اعتماد دوست جعفر کے ہاں پہنچا۔ عبداللہ کی بے وقت آمد سے وہ گھبرا اٹھا۔

''کیا کسی فوری مہم کی تیاری ہے؟'' عبداللہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''ہاں آج کی رات بڑی مہم کی تیاری ہے زندگی کی سب سے بڑی مہم دوست.....''

''یہ اچانک تمہیں کیا ہوا سردار؟'' جعفر پریشان ہوگیا۔ عبداللہ ہچکیوں کے دوران بولا۔

''میں اس وقت ہولناک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوں انجام کے خوف سے لرزاں ہوں..... تمام زندگی باغی جرم کی طرح گزار کر نامہ اعمال کی سیاہی دھونا چاہتا ہوں۔ بولو یہ تلافی کس طرح ہوگی کیونکر..... آخر کیونکر.....؟''

''دل کی یہ کیفیت سوز وگداز تمہیں مبارک ہو..... یہ انقلاب مبارک ہو..... مگر افسوس کہ میں بھی اس کوچے سے ناآشنا ہوں..... گر سے ناواقف ہوں۔ ہاں اتنا سنتا ہوں کہ خدا کی تلاش میں نکلنے والے پہلے مرشد کامل کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

اسے پانے کے بعد خدا یابی کی منزل قریب ہوتی ہے یہی راہ نظر آتی ہو کسی مرشد کامل کا دامن تلاش کرو۔'' عبداللہ کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ پُرامید ہوگیا۔

''تمہاری رہنمائی کا شکریہ دوست..... بس اب مایوس نہیں ہوں..... مگر مرشد کامل کی تلاش تو کٹھن امر ہے تم کوئی نشان بتاؤ..... میں مرشد کی گلی میں سر کے بل جاؤں گا۔'' جعفر شریک غم کی طرح پھٹ پڑا۔

''میرے دوست تم شکریہ ادا کر کے شرمندہ نہ کرو۔ میرے خون جگر سے اگر تمہارے دل کی آگ بجھے تو خود کو اس کے لیے تیار پاتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ آگ پانی یا خون سے نہیں بجھے گی بلکہ اس کے لیے تجلیات کی خنکی چاہیے۔ میرا اور تمہارا ماحول ایک سا رہا ہے لہٰذا مجھے کبھی کوئی تجربہ نہیں ہے تاہم میرا خیال ہے کہ مرشد کامل کی تلاش بھی خدا کی تلاش کا نقطہ آغاز ہے۔ اس لیے خدا کا نام لے کر مہم کے لیے نکل پڑو خدا تمہاری مدد کرے گا' سردار یہ راہ طے کی نہیں بلکہ کرائی جاتی ہے۔'' جعفر کی بات سن کر عبداللہ گھر لوٹ آیا۔ رات ڈھل چکی تھی۔

رحمت یزدانی کے فرشتے آسمانوں کے دروازے کھول رہے تھے۔ عبداللہ اپنی کوٹھڑی کے گوشے میں چھپ کر رو رہا تھا۔ خدا تعالیٰ سے توبہ قبول کرنے کی دعا کر رہا تھا۔ عرض پرزور تھا کہ کسی مرشد کامل کو بھیج دے۔ پھر وہ گھر سے نکل

بڑا۔ حق کی تلاش میں اس کے سفر کا نقطہ آغاز تھا۔ گلیوں اور پر پیچ راستوں سے گزر کر وہ چوراہے پر جا کھڑا ہوا۔

نامعلوم طور پر دل کے یقین نے نشاندہی کی کہ جہاں وہ کھڑا ہے وہی مرشد کامل سے ملاقات کی جگہ ہے۔ امید و بیم کے اس چکر میں اسے کچھ فاصلے پر سایہ سا نظر آیا۔

''مرشد کامل آرہا ہے۔'' پابوسی کے لیے شوق کی نگاہ جھکی اس نے بے ساختہ پکارا۔

''مرشد کامل میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں آؤ میرے کشکول پر فرمانروائی کرو۔ مجھے مرید بے دام کرلو میں اپنے نصیب دشمن آزادی کو تمہارے قدموں پر نثار کرتا ہوں۔'' آنے والا حیرانی سے بولا۔

''میرے بھائی میں اندھیری راتوں کا مسافر ہوں، مجھے اجازت دو تمہاری امیدوں کا مرکز کوئی اور ہوگا۔'' عبداللہ نے اس کا دامن تھاما۔

''میری امیدوں کا مرکز کون ہے یہ جاننا میرا کام ہے۔ مرشد ایک بچھڑے ہوئے بندے کو خدا سے قریب کرنا تمہارا فریضہ ہے۔ مجھے مرید کرلو تاکہ تمہاری رہنمائی میں سفر کا دوسرا دور شروع ہو۔'' آنے والے نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''تم نے مجھے غلط سمجھا ہے اگر تم جان لو کہ میرا پیشہ کیا ہے تو تم میرے منہ پر تھوک دو گے ضد نہ کرو مجھے جانے دو۔ میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

ہزار انکار پر بھی عبداللہ بضد رہا۔ اجنبی نے تنگ آکر ہاتھ بڑھایا۔

''یہ لو میں نے تمہیں اپنا مرید کرلیا۔ اب تم میرے ہاتھ بک گئے اب تمہارے لیے ضروری ہے کہ اگر کامیاب ہونا ہے مرشد کی غیر مشروط اطاعت کرو۔ میں حکم دیتا ہوں میری واپسی تک یہیں کھڑے رہو پھر میں تمہیں وہ راستے طے کرادوں گا جو بارگاہ الٰہی تک لے جائیں۔ اچھا اب اجازت دو۔'' یہ کہتا ہوا وہ لوٹ گیا۔ صبح ہوگئی اور عبداللہ انتظار کرتا رہا۔

دن چڑھے تک شہر کے مشہور شخص کا کھڑے رہنا معمولی بات نہ تھی۔ لوگوں نے ہزار بار سمجھایا گھر واپس چلو۔ مگر وہ ایک بات کہتا۔

''مجھے کھڑے ہونے کا حکم مرشد کامل نے دیا ہے میں اُس کی واپسی تک نہیں ٹک سکتا۔'' لوگوں نے اصرار کیا۔

''اس کا انتظار بے سود ہے کافی وقت گزر چکا اس نے جھوٹا وعدہ کیا ہوگا۔'' عبداللہ نے یقین ہو کر لب کھولے۔

''تم اپنی زبان کو گناہ آلود نہ کرو مرشد کامل جھوٹا نہیں ہے ضرور آئے گا اور واپسی کی معیاد محشر تک ہے میں آخری لمحے تک انتظار کروں گا۔''

اب وہ علاقہ کا جرائم پیشہ قابل نفرت انسان نہ رہا بلکہ عقیدت کش نگاہوں کا تماشا بن چکا تھا۔ نہ جانے کتنی شامیں آئیں اور گزریں۔ مگر وہ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ دیوانوں کی بہت بڑی جماعت شریک حال ہوگئی۔

چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا آبادی خاموش تھی۔ عبداللہ بدستور کھڑا تھا۔

اچانک آہٹ پر پلٹا سامنے سفید پوش بزرگ لمبی عبا پہنے عصا لیے کھڑے تھے۔ یوں جیسے کوئی فرشتہ آسمان سے اترا ہو۔ عظمت خداوندی دمک سے عبداللہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ مرعوب ہوا۔ نووارد بزرگ نے بارعب انداز میں پوچھا۔

''یہاں کیوں کھڑے ہو؟'' عبداللہ نے

جواب دیا۔

''مرشد کامل کے انتظار میں.....'' پھر سوال کیا۔

''کون مرشد کامل؟''

''وہی جس کے ہاتھ پر میں بیعت کر چکا' اس نے مجھے انتظار کا کہا اور بولا میں واپس ہونے کے بعد تمہیں بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچادوں گا۔'' بزرگ نے فہمائشی انداز میں ارشاد فرمایا۔

''وہ مرشد کامل نہیں اندھیری راتوں کا سیاح ہے اسے راستہ خود نہیں معلوم' وہ نہیں پلٹے گا..... تم جان کو ہلکان نہ کرو۔'' عبداللہ ادب سے بولا۔

''میرا یقین غیر متزلزل ہے وہ ضرور آئے گا۔ اُسے حق کا راستہ معلوم ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''ایک غلط بات پر ضد نہ کرو تم جتلائے فریب ہو رہے ہو۔ تم نے ایک چور کو مرشد کامل سمجھ لیا ہے۔ سوتے ہوئے انسانوں کی آنکھ سے کاجل چرانے والا اگر مرشد کامل ہو سکتا ہے تو شامت کی ماری دنیا کو مرشد کامل کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔'' عبداللہ کا یہ انہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بولا۔

''ایک تو آپ کا ملکوتی اثر دلوں پر رعب ڈال رہا ہے' دوسری طرف آپ مرشد کامل کو غلط کہہ رہے ہیں یہ انداز میری سمجھ سے باہر ہے۔ گستاخی نہ ہو تو آپ کا اسم گرامی جان سکتا ہوں؟'' بزرگ نے تبسم فرما کر کہا۔

''میرا نام خضر ہے بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہِ راست پر لانا میرا کام ہے بلکہ میرے منصب کا فریضہ ہے۔'' اسی رشتے سے میں نے تمہیں تنبیہ کی ہے۔'' عبداللہ نے بزرگ کے قدموں کا بوسہ لیا اور کانپ کر گویا ہوا۔

''میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں اب یہ دریافت کرنے کی اجازت رحمت کریں کہ جس مرشد کامل کو چور کہا جا رہا ہے اس سے مرید ہونے کے بعد یہ شرف مجھے حاصل ہوا کیا چور کی نسبت کا یہ اعزاز میرے لیے قابل فخر نہیں ہے..... زہے نصیب کہ آپ کی تشریف ارزانی سے مرشد کامل پر میرا یقین پختہ ہو گیا؟''

حضرت خضر نے کریمانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔

''پھر تم غلطی کا اعادہ کر رہے ہو..... میں مرشد کامل کو چور نہیں بنا رہا بلکہ تم نے چور کو مرشد کامل بنالیا ہے..... تمہاری ضد پر کیوں نہ چور کو مرشد کامل بنا دیا جائے تو پھر بشارت سن لو اسی جگہ تمہاری ملاقات مرشد کامل سے ہوگی اور چند لمحوں بعد تم خلعت عرفان سے سرفراز کیے جاؤ گے..... انتظار کرو۔'' حضرت خضر یہ بشارت دے کر واپس پلٹے۔

عرصہ دراز کے بعد عبداللہ کو اطمینان حاصل ہوا وہ اونگھنے لگا۔ اس نے دیکھا۔

کارکنان قضا و قدر عرب الٰہی کے سائے میں کھڑے ہیں۔ ناگہاں صحاب عظمت سے آواز آئی اور فرشتے ہیبت جلال سے سجدہ ریز ہو گئے۔

اندھیری راتوں کا سیاح یا عبداللہ کا مرشد کامل جس کا نام یحییٰ تھا۔ آج بے حد مسرور تھا۔ بغداد عروس البلاد کے متعلق بہت ساری روایتیں اس نے سنی تھیں۔ اسے اشتیاق تھا اس دولت مند شہر میں قسمت آزمائی کی جائے۔ حوصلہ مند ساتھیوں کی مدد سے بغداد کی مہم کا پروگرام طے پا گیا۔

سویرے بغداد روانگی تھی تمام ساتھی پو پھٹتے

ہی چل پڑے۔

جونہی بغداد قریب آیا تھا یحییٰ کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اس نے بے چین ہو کر ساتھیوں سے ذکر کیا مگر انہوں نے توجہ نہ دی۔

کئی شب و روز کی مسافت پر معلوم ہوا بغداد صرف ایک منزل دور ہے۔ شام ہو چکی تھی۔ ایک وادی کے نشیب سے گزر کر وہ بلند پر چڑھے۔ سامنے بغداد کا حسین شہر دکھائی دینے لگا۔ وہ جھوم اٹھے۔

کیونکہ انہیں عالی شان عمارت نظر آتی جس پر سواریوں کا ہجوم گھوڑوں کی قطار اور اونٹوں کی بھیڑ تھی۔ (عبداللہ کا مرشد کامل) یحییٰ چلتے چلتے رک گیا اس نے راہ گیر سے پوچھا۔

''کیا یہ شہر کے بڑے رئیس کا گھر ہے؟'' راہ گیر نے جواباً کہا۔

''یہ روئے زمین کے سب سے بڑے رئیس کا گھر ہے ہر جگہ اس کی شوکت اقتدار کا پرچم گڑا ہے۔ اس کے قدموں تلے سونے اور جواہرات بچھے رہتے ہیں۔'' یحییٰ مرعوب ہو گیا۔ وہ بمشکل بولا۔

''اس رئیس کا نام کیا ہے؟''

''اس کے بے شمار نام ہیں...... دستگیر' کونین' الثقلین' خواجہ کائنات' سلطان الاقطاب' مخدوم الوریٰ' غوث الاعظم' امام اعظم' محبوب سبحانی' اس طرح کے ناموں کا زریں سلسلہ اس کی ذات سے منسوب ہے۔''

راہ گیر نے جلدی میں جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ یحییٰ نے فاتحانہ انداز میں ساتھیوں سے کہا۔

''اتنے بڑے دولت مند کے گھر کا غبار ہی ہاتھ آ گیا تو عمر بھر کے لیے کافی ہے۔'' آدھی رات تک غور فکر کے بعد تیاریاں مکمل ہوئیں۔ یحییٰ نے سب کے فرائض تقسیم کر دیے۔

آج جانے کیوں غوث الوریٰ کی خانقاہ کا عقبی دروازہ اب تک کھلا تھا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی۔ بغداد نیند میں شرابور تھا۔ کبھی کبھی راستے کے پاسبانوں کی آوازیں آتیں۔ یحییٰ دبے پاؤں خانقاہ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا اس کی آنکھیں چمکیں۔ کھلے دروازے سے وہ اندر داخل ہوا۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولتا رہا۔ کوئی چیز نہ ملی۔ وہ حیران ہوا۔ اتنے بڑے رئیس کا گھر اور خالی...... پھر اس نے سوچا کیوں نہ گھر کا غبار لے چلوں ممکن ہے سونے اور جواہرات کی راکھ ہو۔'' گرد و غبار جمع کر کے چھوٹی سی گٹھڑی بنائی اور جونہی قدم باہر رکھا آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اسے محسوس ہوا آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔ وہ گھبرا گیا گھر کے اندر پلٹا۔

کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا کونین کا دستگیر تہجد کی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ سامنے رجال الغیب ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ عرض کیا۔

''عالم پناہ فلاح شہر کے ابدال کا انتقال ہو گیا ہے۔'' سرکار غوث الوریٰ آگے بڑھ گئے۔ زیر لب مغفرت و رحمت کی دعا فرمائی۔ یحییٰ کانپ گیا بھاگنے کا ارادہ کرتے ہوئے دوبارہ کچھ سوچ کر وہیں بیٹھا۔

''آج میرے گھر کون مہمان ہے؟'' کشور دل کو فتح کرنے والی آواز کان میں پڑی۔ وہ اقبالی مجرم کی طرح بولا۔

''سرکار میں ہوں شامت نصیب اندھیری راتوں کا سیاح...... دولت خدا مدد کا شہر سن کر آیا تھا۔ مگر گرفتار مصیبت ہوا...... بینائی کھو بیٹھا...... جانے انجام کیا ہو گا؟'' وہ رونے لگا۔

''مت رو' کرم کا آبگینہ نازک ہے...... یہ مایوس امیدوں کی پناہ گاہ ہے۔ ناکافی کا افسوس نہ کرو تم خالی نہ جاؤ گے آنکھوں کی روشنی بھی پاؤ گے۔'' سرکار غوث الوریٰ قریب آئے۔

کرم کی نگاہ کرم ساز اٹھی اور بے نور آنکھوں کی راہ سے دل تک آئی ہر طرف تجلیات کا چہرہ تھا وہ ولایت کی تعلیم کا تاجدار بن گیا۔ غوث الوریٰ نے حکم صادر کیا۔

''فلاں شہر کے ابدال کا انتقال ہو گیا ہے تمہیں اس کی جگہ بحال کیا جاتا ہے۔ فوراً جا کر منصب کے فرائض سنبھالو۔''

یحییٰ نے انتہا جذبۂ عقیدت کے تحت سرکار کی بارگاہ کو بوسہ دیا اور لوٹا۔ رجال الغیب کے مجمع سے آواز آئی۔

''آخر ایک دیوانے کی ضد نے چور کو مرشد کامل بنا دیا۔ پھر اسی شاہراہ سے وہ گزر رہا تھا۔ جس راہ سے گزرتا گیا آنکھوں کے پیمانے سے قادری میکدے کی پاک شراب لٹاتی گئی۔ وہ ولایت کی لم رو میں داخل ہوا۔ شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔

آبادی کے چوراہے پر ہزاروں آدمیوں کا میلہ تھا۔ لوگوں نے اجنبی راہ گیر سمجھ کر رہنمائی کی۔

''اژدھام کے باعث آمد و رفت کا رستہ بند ہے آپ کسی اور طرف سے جائیے۔'' یحییٰ نے دریافت کیا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' لوگوں نے حیرت سے جواب دیا۔

''کئی ہفتے گزر گئے سارا علاقہ ہل گیا ہے اور آپ کو خبر نہیں ہے بڑے تعجب کی بات ہے۔'' یحییٰ نے کہا۔

''میں اس علاقے کا باشندہ نہیں ہوں مجھے آگاہ کریں۔'' لوگوں نے کہا۔

''ہمارے شہر کا اچھا خاصا آدمی دن رات یہاں کھڑا رہتا ہے وہ دیوانگی میں کہتا ہے میں مرشد کامل کے انتظار میں ہوں...... وہ مجھ سے وعدہ کر گیا ہے کہ تم انتظار کرو میں واپس آ کر بارگاہ یزدانی تک پہنچا دوں گا۔ اسے بڑا سمجھایا ہے مگر وہ نہیں مانتا...... دلوں کا میلان اس کی طرف اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے گرد ہزار دیوانوں کا گھیرا رہتا ہے۔ یحییٰ کا حافظہ تازہ ہو گیا وہ وارفتگی شوق میں دامن پھاڑتا مجمع کی طرف دوڑا۔

''میں آ گیا میرے مرشد...... میں اپنا وعدہ پورا کرنے آ گیا۔'' جانی پہچانی آواز سن کر عبداللہ چونکا اور چیخ پڑا۔

''مرشد کامل آ گیا...... آ گیا مرشد کامل...... میں نے کہا تھا وہ جھوٹ نہیں بولتا...... وہ ضرور آئے گا۔'' عبداللہ عالم بے خودی میں تڑپ کر مرشد کامل کے سینے سے لپٹ گیا۔ اس کی پیاسی روح چشمۂ عرفان سے سیراب ہونے لگی۔ تجلیات کا نیا عالم نگاہوں کے سامنے چمکا۔ مرشد کامل نے آواز دی۔

''عبداللہ آنکھیں کھولو تم بارگاہ یزدانی کی چوکھٹ کو پا چکے ہو۔'' آنکھ کھولتے ہی عبداللہ سجدے میں گر پڑا۔ ہاتف غیبی سے آواز آئی۔

''آخر ایک بندہ گناہ گار نے عشق کی آہ و زاری اور فریاد کے سوز سے اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کر ہی لیا۔

شعاع بہر خود بے تاب ہے جذب محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

□□......❁......□□

کراچی سے بھیجی گئی تحریر جو پڑھنے والوں کو جھنجوڑ کر رکھ دے گی

اُس کا خدا.....!

ہائے کیا سر ہے وہ، جس سر میں ہے سودا تیرا
اور وہ دل کہ ہے جس دل میں بسیرا تیرا

ثمینہ مشتاق

نیٹی جیٹی کے طویل پل پر یہ آخری بجلی کا کھمبا تھا جس کے نیچے سردی کی رات میں ٹھٹرتے ہوئے مہر بخش نے اپنی خالی جیب میں پڑی آخری بیڑی سلگائی گاؤں سے نکلتے وقت اس کے پاس کپڑوں کی گٹھڑی کے ساتھ ایک امید کی گٹھڑی بھی تھی جسے وہ کراچی جیسے بڑے شہر میں دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب کھو چکا تھا۔

آج برادن تھا اپنے بیٹے شیدے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ خود اس بڑے شہر کی ان دیکھی ویرانیوں میں کھو گیا تھا حسرت و یاس آج عروج پر تھی دماغ الجھا ہوا تھا بیڑی کے کش مزہ نہیں دے رہے تھے وہ سردی سے بچنے کے لیے اکڑوں بیٹھا تھا اپنی میلی سی چادر میں اس نے اپنا بایاں ہاتھ کچھ اور اپنے گرد لپیٹ لیا۔

اس کے پیچھے چند جھگی نما کیبن تھے صبح میں یہاں جو مقامی لوگ اپنا کچھ نہ کچھ کام دھندہ کرتے تھے وہ ان ہی کیبن میں سوئے پڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پل پر اکا دکا ہیوی ٹرک یا ٹرالر گزر رہے تھے کیونکہ کراچی کی سڑکوں پر رات میں ان ہی کا راج تھا۔

اچانک مہر بخش کی نظر ایک سیاہ ہیولے پڑی۔ اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا لیکن اتنا طے تھا ہیولہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا پل سے گزرتے ٹرک کی ہیڈ لائٹ میں مہر بخش نے دیکھا وہ کوئی نوجوان تھا اس نے اپنے گرد مٹیالی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ ٹرک گزر گیا اور پھر اندھیرا ہو گیا لیکن اب اس کا لڑکے سے فاصلہ گھٹ چکا تھا مہر بخش اسے بآسانی دیکھ سکتا تھا وہ لڑکا کچھ فاصلے پر اس کے سامنے پل کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل کو ایک بار منہ لگا کر خالی کیا اور اسے پل کی دیوار پر دے مارا اپنی قمیض کی آستین سے منہ صاف کیا اور پل کی دیوار چڑھنے لگا۔

مہر بخش کی آنکھیں پھٹ گئیں نجانے کون سی بجلی اس کے جسم میں بھر گئی اس نے اپنے گرد لپٹی چادر پھینکی اور لڑکے کی جانب لپکا۔

''اے..... یہ کیا کر رہے ہو۔'' مہر بخش نے قریب پہنچ کر مضبوطی سے لڑکے کا بازو تھام لیا جو تقریباً پل کی دیوار پر چڑھ چکا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' لڑکا نشے میں تھا لڑکھڑا کر مہر بخش کے سامنے گر پڑا۔

''میں جینا نہیں چاہتا۔'' لڑکے نے سسک کر کہا۔

''لیکن کیوں؟'' مہر بخش کے سوال پر لڑکے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم جان کر کیا کرو گے اور میں تم کو کیوں بتاؤں کون ہو تم؟''

''میرا نام مہر بخش ہے اور.....!''

''میں..... میں بس ایک انسان ہوں۔ میری بھی ایک کہانی ہے میں مٹی کا کورا پیالہ تھا جس پہ قدرت نے جو لکھا میں نے خود میں انڈیل لیا اس ہی میں اصل راحت تھی اور شاید یہی میرا نصیب تھا۔'' مہر بخش کی بات سن کر لڑکے نے اپنا سر جھٹکا۔

''جاؤ جا کر اپنا کام کرو اور مجھے میرا کام کرنے دو۔'' لڑکا لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا مہر بخش نے پھر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''یہی میرا کام ہے جو میں کر رہا ہوں تمہارا کیا مسئلہ ہے، مجھے بتاؤ میں دعا کروں گا خالص دعا۔''

''مجھے تمہاری بکواس نہیں سنی۔'' لڑکے نے مہر بخش کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا۔

''مجھے کسی دعا پہ اعتبار نہیں۔''

''ایسا نہیں کہتے۔'' مہر بخش تڑپ کر بولا۔

''خالص دعا بڑی پر اثر ہوتی ہے۔شاید تم نے گھڑے کا پانی پیا ہو اس کی تاثیر اور فریج کے ٹھنڈے پانی کی تاثیر جیسا ہی فرق مطمئن اور بے چین قلب کی دعا میں ہے ایک آرٹیفیشل اور دوسری خالص وقدرتی۔''

''مجھے تمہاری دعا کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں دنیا تیاگ چکا ہوں اپنا گھر بار، دوست احباب سب گنوا چکا ہوں اور ایسے میں اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے کسی اور کا ہوتے ہوئے دیکھنے سے بہتر ہے میں مر جاؤں۔ میرے پاس تو اب مانگنے کو بھی کچھ نہیں بچا۔'' لڑکا فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پھر بے بسی سے رونے لگا۔

مہر بخش ٹوٹے دل کی پیڑ یا اس نے تسلی کے لیے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''زندگی بہت قیمتی ہے تمہاری طرح میں بھی تھک گیا ہوں لیکن میں پھر بھی مرنا نہیں چاہتا سوچ کی نیلی دھوپ میں ہم نے زندگی ایک امید کی گٹھڑی میں ہی تو باندھ رکھی ہے۔ میں اس گٹھڑی کو دو سال سے اٹھائے پھر رہا ہوں کسی نے بتایا تھا میرا بیٹا شیدا مجھے یہاں ملے گا کراچی میں...... شیدا تو نہیں ملا' انسانوں کے اس جنگل میں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری امید کی گٹھڑی بھی کھو گئی۔'' لڑکا اب آنسو پونچھ کر مہر بخش کو دیکھ رہا تھا۔مہر بخش نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا لڑکے کا نشہ کچھ کچھ اتر گیا تھا۔مہر بخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا تم سوچ سکتے ہو میں ان دو سالوں میں زندگی کی کتنی پرتیں جی چکا ہوں تمہارے لیے زندگی اگر اتنی ارزاں ہے تو مجھے دے دو میں ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں ایک مثبت زندگی پھر سے غلطیوں کے بغیر۔'' لڑکے نے جھٹکے سے خود کو مہر بخش کی گرفت سے چھڑایا۔

''میں تمہیں زندگی دان کرنے والا کون ہوتا ہوں اس ہی سے مانگو جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا تمہارا خدا' وہی بانٹ رہا ہے سب کو زندگی اور موت مجھ سے کیوں مانگتے ہو''

''تم دینا چاہتے ہو اس لیے۔'' مہر بخش نے نرم لہجے میں کہا۔

''ہر کوئی دینا نہیں چاہتا اتنی قیمتی شے کوئی کسی کو مفت تو نہیں دیتا۔''

''میں تمہیں کیوں دوں گا۔'' لڑکے نے اکڑ کر کہا۔

''میں تو اپنی جان اپنے محبوب پر فدا کرنے جا رہا ہوں میری جان اتنی بھی بیکار نہیں کہ تم جیسے راہگیر پر نچھاور کر دوں۔'' مہر بخش نے لڑکے کو زور سے جھنجھوڑا۔

''میری بات غور سے سنو یہاں پر اب سیکورٹی سخت ہے اگر پولیس کی گاڑی نے ہمیں مشکوک حالت میں دیکھ لیا تو فوراً جیل کی ہوا کھانی پڑ سکتی ہے' لہٰذا اس وقت بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ چلو میرے گھر۔''

''مگر کیوں؟'' لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہیں نہیں جانتا میرا تم سے کیا رشتہ ہے جو میں منہ اٹھا کر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔'' مہر بخش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

کا ہے باقی رشتے تو فانی ہیں دنیا تو بس ایک رشتہ تو بشر اور اللہ کا مقام ہے ایک حد فاصل بندہ جہاں بھی ہو عرش یا فرش وہ محض اللہ کے لیے ہے سارے ڈر خوف اور مایوسی کے جذبات تو انسان اور اللہ نے تو ڈرنے کا حق بھی صرف اپنے لیے نے خود پیدا کیے ہیں اللہ رکھا ہے اس نے تو ہمت

اور امید پیدا کی ہے اس نے تو کہا ہے ہر سختی کے بعد آسانی ہے انسان بڑا جلد باز ہے اپنے رب سے مایوس ہو اپنے بندے سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ جاتا ہے لیکن اللہ......

لڑکا اب اپنے ہوش وحواس میں تھا اور مہر بخش کو غور سے سن رہا تھا۔رات کافی بیت چکی تھی اور زندگی بھی کافی تجربوں سے گزر چکی تھی اس بنجارہ سی زندگی میں مہر بخش محض ایک اور کردار ہی تو تھا لڑکے نے اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔مہر بخش کا گھر زیادہ دور نہ تھا کچھ بھول بھلیوں سے گزر کر مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔گھر صاف ستھرا تھا ایک چارپائی، پانی کا گھڑا، چند برتن، ایک صراحی کونے میں رکھی ایک بڑی سی پیٹی، پکا فرش اور ٹین کی چھت اس گھر کی کل کائنات تھی۔لڑکا کمرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' مہر بخش نے اسے مخاطب کیا اور کمرے میں رکھی پیٹی کی جانب بڑھ گیا۔

''میرا نام...... زبیر ہے' زبیر علی میں نے میتھس میں ماسٹرز کیا ہے باپ سر پر نہیں تھا۔ماں جب تک زندہ تھی محنت مزدوری کر کے مجھے پڑھاتی رہی میں دیہات کا رہنے والا ہوں جوان ہوا تو مجھے میرے گاؤں کے زمیندار کی بیٹی گلنار سے عشق ہو گیا وہ بھی مجھے چاہنے لگی لیکن ہمارے درمیان غربت کی آہنی دیوار حائل ہو گئی میں اس دیوار کو گرانے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دل وجان سے پڑھائی میں محنت کرنے لگا تاکہ اس کے قابل ہو سکوں میں نے اپنے تعلیمی ادارے میں ہر بار پوزیشن لی مجھے وظیفہ ملنے لگا میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا لیکن اتنی محنت اکارت گئی میری زندگی کا مقصد ہی ختم ہو گیا میری محبت مجھ سے جدا کر دی گئی اب کچھ عرصے میں اس کی شادی ہے۔زبیر نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''تم منہ ہاتھ دھو لو اور کچھ دیر آرام کرو ہم صبح اطمینان سے بات کرتے ہیں۔'' مہر بخش نے کمرے سے متصل غسل خانے کی جانب اشارہ کیا۔زبیر کے جانے کے بعد مہر بخش نے زمین پر اس کا بستر لگا دیا' وہ جب کمرے میں واپس آیا تو اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔

''اللہ والے بنتے ہیں آپ تو بڑے اللہ۔'' زبیر نے مہر بخش کو غور سے دیکھا۔

''گھر میں کا نام کیوں نہیں لگاتے اللہ اور قرآنی آیت کوئی دل کی تسلی کا سامان؟'' مہر بخش خود میں چور سا ہو گیا اور خود کو چارپائی کی چادر ٹھیک کرنے میں مصروف ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

زبیر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔وہ مہر بخش کے تاثرات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا مہر بخش کے لیے اس کی بے چینی واضطراب چھپانا مشکل تھا کافی دیر تک زبیر اسے دیکھتا رہا مگر کوئی ایک لفظ بھی مہر بخش کے منہ سے نہ نکلا۔لیکن اب زبیر کی نظریں اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔اس کی کنپٹی سے پسینے کی لکیریں بہہ نکلیں۔وہ کچھ دیر کھڑا لرزتا رہا پھر زبیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''تم سے ایک التجا ہے۔'' اس بار زبیر کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''کیسی التجا؟''

''تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔''

''مگر سوال کیے بنا میری تسلی کیسے ہو گی؟ کیا آپ چاہتے ہیں ہم اجنبی رہیں؟'' مہر بخش کی ٹانگوں سے جان نکل گئی وہ کسی بوسیدہ عمارت کی

طرح چارپائی پر ڈھے گیا۔

"اللہ کا نام دیواروں پہ ٹانگتے ہوئے شرم آتی ہے مجھے۔" اس کی خشک زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ جھڑے۔

"میں بہت گناہ گار ہوں...... تم جانتے ہو میرا بیٹا چور ہے لوگوں کے گلے کاٹتا ہے میں ایک بدمعاش کا باپ ہوں۔" اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گرے اور دامن میں جذب ہو گئے وہ بلکنے لگا۔

"مجھے لگتا ہے میں مستقل تقسیم در تقسیم ہو رہا ہوں اور اب اتنا بھی نہیں بچا کے آخرت کا کچھ سامان کر سکوں میں یہ خالی وجود لے کر کی بارگاہ میں کس منہ سے جاؤں گا۔ میں لوگوں کے سامنے پارسا بن کے کیا کروں گا میں تو اپنے رب سے نظریں ملانے کے قابل نہیں، دکھاوا نہیں کرتا وہ بس مجھے معاف کر رہا اس ہی لیے میں اپنے ہلا کر دے۔۔۔۔!! مجھے ڈر ہے شیدے کی وجہ سے کہیں میں وصل جنہم نہ ہو جاؤں اس نے دنیا مانگ لی ہے۔ دنیا کب کسی کی ہوئی ہے شیدے نے خسارے کا سودا کر لیا ہے۔ بے شک اولاد ہے ہی بڑے خسارے کا سودا۔"

زبیر کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا وہ چپ چاپ مہر بخش کے برابر بیٹھ گیا۔ مہر بخش ایک ٹک سامنے دیکھتا رہا اور بات جاری رکھی۔

"جب ہماری شخصیت کی تعمیر ہو رہی ہو تو ہم بہت سے اچھے برے تجربوں سے گزرتے ہیں یہ ہماری ذات کو توڑتے ہیں پھر جوڑتے ہیں پھر توڑتے ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے میرے پاس تو اب امید کا مال غنیمت بھی نہیں ہے۔" پھر سے خاموش آنسو آنکھوں سے ڈھلکنے لگے۔

"یہی میرا حال ہے بابا۔" زبیر نے ٹھنڈی آہ بھری سفر چل رہا ہے اور میرے قدم رک گئے ہیں خواہشیں دل سے رخصت ہوں تو چلتی پھرتی دنیا تماشہ نہیں رہتی قید خانہ بن جاتی ہے۔

مہر بخش نے غور سے اس کی آنکھوں کی ویرانی کو دیکھا

ایسا نہیں ہے تشکیل ذات سرمایہ ہے میں سچ کہہ رہا ہوں تمہیں شاید یقین نہ ہو خود کی گونج سنو۔ روح کی پکار!! جب تم ذات کی کہی سن لیتے ہو تو وجود بھی خوشی سے سرشار ہو کر مستی میں ناچنے لگتا ہے دنیا و مافیا سے بے خبر بے خودی کی حالت وجد کا عالم تم خود کو خود میں تحلیل کر دو جب تم خودی کی معراج کو پا جاؤ گے تو پھر سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔" مہر بخش کے چہرے سے شادمانی کی پھوار برس پڑی۔

مجھے یقین ہے یہ ہمارا اختتام نہیں ہے جب ہماری سوچ کے دروازے بند ہو جائیں تو قدرت ضرور بیچ میں آجاتی ہے اور کوئی راہ سجھاتی ہے ہمارا ملنا بالوجہ نہیں ہمیں راہ تلاشنی ہو گی ہم جب تک زندہ ہیں ہمارا مقصد باقی ہے۔" زبیر پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا مہر بخش کا چہرہ اب کسی سنہری صبح کی طرح روشن تھا۔

"لیکن...... میں خود سے بچھڑ چکا ہوں۔ میں نے تو جب بھی قدرت کو پکارا مجھے کبھی کسی پکار کا جواب نہیں ملا میرے لیے اتنی خاموشی کیوں؟ میری تو کوئی دعا قبول نہیں ہوئی ہر فریاد رد ہو گئی' یہ کیسا نظام ہستی ہے جہاں مظلوم کی کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔" زبیر نے گلہ کیا۔

صدیوں بعد مسجد قرطبہ میں دی گئی اذان جیسی گونج وسحر انگیز اور طاقتور ترین حق کی صدا بن جاؤ۔ جب تم سچے مانگنے والے بن جاؤ گے تو ہر صدا

کا جواب ملنے لگے گا۔ مہر بخش کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

خود کو ٹٹولو تم نے کتنے بھروسے سے اور بنا کسی شرط کے فریاد کی ہے میں اپنی سوچ کے تسلسل میں المکانی کا قائل ہوں امکان کی حد سے باہر تخیل اور وجدان کے بیچ گر کوئی راہ نکالی جا سکتی ہے تو حقیقت بذات خود ایک فیصلہ ہے جو ہماری قسمت پر مہر بن کر ثبت ہو چکا ہے۔ بات فقط اتنی ہے زبیر قدرت ہم سے غافل نہیں ہے ہم قدرت سے غافل ہیں۔" مہر بخش کی بات سن کر زبیر بستر پر دراز ہو گیا۔

"میرا دماغ تھک چکا ہے بابا مجھے لگتا ہے ہم اپنی زندگی میں ہی اپنی خواہشات خود میں دفنا دیتے ہیں کہ ہمیں کبھی اپنا بھی پرسا کر لینا چاہیے۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔

"صبح تمہارے گاؤں چلیں گے تمہارے گھر۔" مہر بخش چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا۔

"لیکن کیوں؟" زبیر نے سوالیہ نظروں سے مہر بخش کو دیکھا۔

"میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے میرا رب ڈھونڈنا ہے۔" مہر بخش کا لہجہ سپاٹ تھا اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں موندھ لیں۔ صبح ناشتے کے بعد مہر بخش اور زبیر نے گاؤں کا رخ کیا اندرون سندھ کا یہ گاؤں 'مٹھل' زبیر کے ارمانوں، خوابوں اور امیدوں کا قبرستان تھا۔

"اس سال بھی بارش کی امید نہیں ہے۔" لال محمد کی بوڑھی آنکھیں جو جھری زدہ ہاتھ کے چھجے تلے آسمان جھانک رہی تھیں بہت تلاش کی بعد مایوس ہو کر لوٹ آئیں۔ غربت کی چکی میں پستا یہ گاؤں اب اناج کو بھی ترسنے والا تھا۔ کنوئیں بھی بخیل ہو گئے تھے سارا پانی خود میں سمیٹ لیا تھا۔ کچھ حصہ ہمارا نہیں رکھا نجانے خدائی زمین تو اپنی تمام تر وسعت کے ساتھ ہم پر تنگ کیوں ہو گئی ہے؟"

لال محمد کی بات سن کر پاس سے گزرتے مہر بخش کے قدم رک گئے۔

"مایوسی کفر ہے سائیں۔" اس نے محبت گندھے لہجے میں لال محمد کو مخاطب کیا اس نے چونک کر مہر بخش کو دیکھا اس کی آنکھوں میں ناگواری تھی۔

میں اپنے اندر کی بے چینی کو کہاں لے جاؤں؟ پانی برسنے کے لیے مزید کتنی دعائیں اور مانگنی ہوں گی؟ میرے بچے بھوک پیاس سے مر جائیں گے تمہارا خدا دیکھتا رہے گا' کب تک یہ تماشا چلے گا دعائیں آخر رب العزت تک جاتی کیوں نہیں' اپنی مخلوق پر اتنا ظلم کیوں کرتا ہے تمہارا خدا۔" مہر بخش لال محمد کی باتیں سن کر لرز گیا۔

"آہ! تم کتنے نادان ہو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟"

"ارے' تم پاگل ہو گیا' شکر کس بات کا اور کیسے کیا جا سکتا ہے' پروین کا خاوند مر گیا وہ بھی بھری جوانی میں لیکن خدا کو ترس نہ آیا اس بیچاری کے تو آگے پیچھے بھی کوئی نہیں تھا پھر۔" لال محمد نے اپنی بات کی توجیہی کی۔

"میں یہی کہوں گا ہم اس کی مصلحت کو نہیں جانتے وہ جانتا ہے' ہم بھی نہیں جان سکتے بس صبر کرو۔" مہر بخش نے تسلی دی۔

"ارے چل جا اپنا کام کر بڑا آیا صبر والا تیرے کون سے بچے بھوک کے پیاسے جل مر رہے ہیں؟" لال محمد نے اسے دھکا دے کر خود سے پرے کیا۔

"تم کچھ نہیں جانتے۔" مہر بخش کی آنکھیں نم

ہوگئیں۔

''میں ایک مسافر ہوں میرا نام مہر بخش ہے اور یہ..... یہ میرا بیٹا ہے زبیر' اس کا کہنا ہے کہ سفر چلتا رہا ہے اور قدم رک گئے ہیں خواہشیں دل سے رخصت ہوں تو چلتی پھرتی دنیا تماشہ نہیں رہتی قید خانہ بن جاتی ہے۔ مجھے اس کے بہت سے سوالوں کے جواب دینے ہیں ان کے جواب مجھے یہیں آس پاس ملیں گے میں بس انہیں ڈھونڈنے آیا ہوں۔''

لال محمد کی آنکھیں مہر بخش پر سورج کی طرح آگ برسا رہی تھیں' اسے ایک لمحہ کو لگا لال محمد کی روح بھی کسی صحرا کی طرح بنجر، سنسان و بے آب و گیاہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس احساس کے دکھ نے اسے مزید بوڑھا کر دیا۔ مہر بخش کے دل میں خیال کوندا۔

''آہ! تم کتنے نادان ہو آہ! تم کتنے معصوم ہو۔'' اسے لال محمد پر بے اختیار پیار آ گیا۔

''خدا بھی اپنی مخلوق پر ایسے ہی مہربان ہو جاتا ہوگا کسی نا کسی بات پر اسے بھی پیار آ جاتا ہوگا۔'' وہ مسکرا دیا۔

مجھے معراج محمد کا پتا تا دو گے؟ مہر بخش کا لہجہ شیریں تھا۔

''کون معراج محمد؟ تم بڑے زمیندار کی بات کر رہے ہو؟'' لال محمد نے تصدیق چاہی۔

''ہاں ہاں وہی جن کی بیٹی کی عنقریب شادی ہے۔'' زبیر جلدی سے بولا۔

''اچھا اچھا وہی..... لال حویلی کا پتا تو تمہیں کوئی بھی بتا دے گا زیادہ دور نہیں سامنے کے کھیت سے گزر کر سیدھا تنگ راستہ حویلی کو جاتا ہے۔''

لال محمد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ زبیر نے مہر بخش کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ مہر بخش کی آنکھوں میں تسلی تھی انہوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ کھیت پار کرنے کی بعد لال حویلی کی پر شکوہ عمارت نظر آنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

''تم کچھ بھی کر لو قربان علی تم پر وقت مہربان نہیں ہے تم خود ہی سوچو کسی کی برأت دروازے سے واپس جانا کیا اچھی بات ہے؟'' معراج محمد نے گہری نظروں سے قربان علی کو دیکھا۔

''جہیز تو میں پورا ہی لوں گا چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔''

''اللہ سے ڈرو تمہارے آگے بھی بیٹیاں ہیں "۔ ایسا مت کرو۔'' قربان علی نے التجا کی۔

اللہ ہی کو مانتا ہوں' اللہ ہی سے ڈرتا ہوں اور اگر تمہیں اللہ پر اعتبار ہے تو مانگ لو اللہ سے میری شرط' ورنہ تو یہ شادی کسی قیمت پہ نہیں ہوگی۔''

''یہ ظلم ہے معراج محمد، دھوکہ ہے تم میرے مالی حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ مجھ سے جتنا ہو سکتا تھا میں نے کیا لیکن۔'' قربان علی کے لہجے میں حسرت تھی۔

''ٹھیک ہے برأت واپس جائے گی۔'' معراج محمد نے فیصلہ سنایا۔

''معراج محمد.....'' قربان علی نے سر پر بندھی پگڑی اتار کر معراج محمد کے سامنے کر دی۔

''یہ پگڑی میری نہیں میری بیٹی کی شان ہے اس لیے اسے تمہارے قدموں میں نہیں رکھوں گا۔ تم نے میری آنکھوں میں زمانے کا خوف دیکھ کر میری بیٹی کی قیمت گرا دی اور اپنی بڑھالی۔ میں نے کسی غلام مخلوق کو جنم نہیں دیا۔ میری بیٹی بھی خدا کی مخلوق ہے یہ اپنا رزق، اپنا نصیب اور اپنے حقوق ساتھ لے کر آئی ہے میں یا تم اس کی نصیب کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں !! جاتے

جاتے میری ایک بات سنتے جاؤ معراج محمد

انسان جب فرعون بن جاتا ہے تب کوئی موسیٰ لیکن انسان فرعون کیسے اور کیوں بنتا ہے؟ فرشتوں نے کہا تھا یہ انسان دنیا میں فساد پھیلائے گا، تو پھر ہم کون ہیں؟ کیا ہمیں فساد زدہ ہونے کے لیے پیدا کیا گیا؟ کیا ہم ظالم کا تر نوالہ بننے کے لیے پیدا کیے گئے؟ مظلوم کو طاقت کیوں نہیں ملتی؟ دراصل مظلوم کی طاقت کیا ہے' اس کا ایمان، اس کی دعا، مظلوم کی دعا رد نہیں ہوتی اور کی مدد ہوتی ہے جو ہر حال میں آتی ہے آ کر رہتی ہے۔'' قربان علی نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور اپنی نم آنکھیں بند کر لیں برات واپس جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

لال حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ زبیر نے حویلی سے قریب ہی رہائش کا انتظام کر لیا تھا دونوں کے جسم تھکن سے چور تھے جلد ہی نیند کی آغوش میں جا پہنچے۔

کچھ باتیں بڑی جلدی زبان زد عام ہو جاتی ہیں۔ چاہے بڑی ہوں یا چھوٹی بس ان کو زبان کے چٹخارے کے لیے موضوع گفتگو بنایا جاتا ہے۔

معراج محمد کی لال حویلی گاؤں کا پسندیدہ موضوع تھی اب اس کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ دوسرے گاؤں کے بڑے زمیندار کی بیٹی کو اس نے ٹھکرا دیا تھا یہ اپنے آپ میں ایک بڑی خبر تھی اور اب اس نے دوسرے شہر اپنی بیٹی گلنار کی خوب دھوم دھڑکے سے رخصتی کر دی تھی۔

سب کہتے تھے خدا کی عجب تقسیم ہے کسی کی بیٹی کے ساتھ اتنے ظلم سے پہلے معراج محمد کا دل نہیں پسیجا نجانے اس غرور کا کیا انجام ہوگا، کوئی کہتا تھا جب معراج محمد نے اپنی بیٹی کو اتنا زیور اور جہیز دیا تو لینے کا بھی پورا حق بنتا تھا خیر جتنے منہ اتنی باتیں دونوں کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ گلنار جا چکی تھی۔ رات کے کھانے پر زبیر نے مایوں سے مہر بخش کو دیکھا۔

''میں نہیں سمجھتا اب ہمارا یہاں رہنے کا کوئی جواز ہے۔'' مہر بخش مسکرا دیا۔

''اپنی مرضی کی شرط پر عشق نہیں سودا کیا جاتا ہے۔ عشق تو قربانی مانگتا ہے، صدقہ مانگتا ہے، آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، ثابت قدمی ہوتا مانگتا ہے۔ محبوب کا ملنا کیا اتنا آسان ہے؟ لیکن محبوب گر اللہ ہو تو اپنے محب کی ہر ادا پر اس کے قرب سے قریب تر ہونا اس کی شان ہے اور ہر زخم دل جائے اس کے لیے تو آگ بھی گلزار ہو جایا کرتی ہے۔'' مہر بخش کی بات بن کر زبیر چڑ گیا۔

کیا آپ مجھے صبر کی تلقین کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جوگ لے لوں؟ سر میں گلنار کے نام کی خاک ڈالوں اور خدا کی تلاش میں نکل جاؤں کیا یہی میرا انجام ہے اور کیا اس لیے میں دنیا میں بھیجا گیا ہوں؟'' زبیر کی باتیں سن کر مہر بخش کے ماتھے پر کوئی شکن نہ ابھری اس نے اطمینان سے ہاتھ دھوئے اور انہیں پونچھتا ہوا زبیر کے سامنے آ بیٹھا جواب بھی سوالیہ نظروں سے مہر بخش کو دیکھ رہا تھا۔ زبیر مہر بخش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''جب ہم کھو جائیں تو خود کو کہاں تلاش کریں اس ٹوٹی ہوئی دل کی دیوڑھی پر جہاں ہم نے کبھی محبت کا پہلا بیج بویا تھا، جہاں محبت کی ننھی کونپل پھوٹی تھی، جو اب تناور درخت بن چکا ہے۔ سارے زمانے کی تھکن اس گم گشتہ محبت کے تنے سے لگ کر اتارلو وہ محبت جو زندگی میں فقط ایک بار ہوئی تھی اسے چاہے وہ محبت کسی بے وفا سے ہی کیوں نا ہوئی ہو۔ زبیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''ہاں یہ بہتر ہے کہ تم رولو۔'' مہر بخش نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''کیا تم جانتے ہو ایک جہنم ہمارے اپنے اندر بھی ہے، جو ہمیں رونے پر مجبور کرتی ہے، چلانے پر، جو ہمارے جسم و جان کی دیواریں گراتی ہے لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے سوائے دور بیٹھ کر اپنا تماشہ دیکھیں۔

کرب سے ہمارا گلا خشک ہو جائے، گردن کی رگیں تن جائیں لیکن آواز نہ نکلے، فریاد نہ ہو یہاں تک کے ہماری آنکھیں ان آنسوؤں سے جل جائیں جو ہم کبھی بہا نہ سکے۔

زبیر نے کھانے کے برتن سمیٹے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے اردگرد جتنے لوگ ہیں سب ہی اپنی ذات میں خدا ہیں مجھ میں اگر کچھ مختلف ہے تو بس اتنا کے میں خود کو خدا نہیں مانتا بشر مانتا ہوں۔ میں آپ کی طرح ولی نہیں ہوں جسے غیب کا علم ہو۔ میں تو شاید احسن التقویم پر بھی پورا نہیں اترتا تو مجھ پر اتنے بوجھ کیوں؟

میں نے کب کہا میں اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہوں۔ میں خود کو ولی نہیں کہتا۔'' مہر بخش نے تیزی سے جواب دیا۔

میں تو بہت گناہ گار ہوں، میں بحث نہیں کرتا میرا بس چلے تو میں یہ کہانی آج ہی ختم کر کے سب کا حساب چکتا کروں اور چلتا بنوں، مجھ میں نہ تو صبر ہے نہ برداشت لیکن وہ بس ایک ہی بات ہے جس سے ہر بات جڑی ہے جس سے ہر بات کی تشریح ہو جاتی ہے، میرے دکھی دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ کہانی تو کب کی ختم ہو جاتی لیکن یہ کہانی فقط میری کہانی نہیں میری ہی کہانی سے نجانے کتنی کہانیاں مشروط ہیں، کس کس کے اعمال نامے میرے اعمال نامے سے جڑے ہیں، نجانے میری کہانی ختم ہو بھی جائے تو کس کس کی کہانی میں کون کون سا کردار میرے کردار سے جڑا رہ جائے گا اور اپنی کہانی گزارتا رہے گا، پھر اس کی کہانی کا کردار، پھر کوئی اور کردار اور پھر نجانے کتنے کردار آپس میں جڑتے جائیں گے یہاں تک کہ روز محشر آجائے گا۔

سب کی کہانی تب ختم ہو جائے گی۔ زبیر مہر بخش کو حیرت سے تک رہا تھا زبان گنگ تھی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

تو کیا ہم سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں؟ کیا ہم سب ایک دوسرے کا اعمال نامہ ہیں؟ اس کے دماغ میں پھر کیا، کیا کی گردان شروع ہوگئی آنکھیں چھلک پڑیں دماغ سلجھن میں الجھ کر رہ گیا۔

''ہم چن لیے گئے ہیں زبیر۔'' مہر بخش نے اسے مضبوطی سے تھام لیا اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

''وہ دیکھو جو وجدان دیکھتا ہے۔ پڑھو کیا کہتا ہے خدا۔ ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا تو کوئی ہے جو سوچ اور سمجھے۔ کیا تم نے سمجھا ہے زبیر؟ کیا تم نے حکمت کو پا لیا ہے؟ کیا تم جان گئے ہو جو تمہیں جاننے کے لیے اس روئے زمین پر بھیجا گیا ہے؟

''خدارا بولو کیا تم اب بھی اندھے ہو اور محض وہی دیکھ سکتے ہو جو نظر آ رہا ہے جو دکھایا جا رہا ہے، کیا تم وہ نہیں دیکھ سکتے جسے چھپایا گیا ہے جو روشن ہے لیکن اس کے لیے دل کا منور ہونا ضروری ہے، کیا تم تک غیب کی صدا نہیں آتی؟''

مہر بخش نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا وہ کانپ رہا تھا لرز رہا تھا اور زبان پتھر کی ہوگئی تھی سارے

سوال اس پتھر تلے دب کر کچلے جا چکے تھے۔

میری تلاش تو ختم ہوئی لیکن آپ کی ابھی بھی جاری ہے آپ شیدے کو کہاں تلاش کریں گے؟ زبیر کا لہجہ نرم تھا۔

مجھے شیدے کو تلاش کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔'' مہر بخش نے زبیر کو شفقت سے دیکھا زبیر نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا۔

معراج محمد کے ساتھ گلنار کو رخصت کرنے کے لیے پورا گاؤں ہی امڈ آیا تھا اور دکھاوے کا یہ انداز بڑے شہر کی بزنس وومن زیب نصرت کو کچھ زیادہ پسند نہ آیا تھا زیور سونا اور دیگر دکھاوے میں تو انہوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی دونوں جانب ہی مقابلے کی فضا گرم رہی تھی۔ زیب نصرت بھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ دلہن رخصت ہو کر مذکورہ کمپارٹمنٹ میں پہنچ چکی تھی۔

سب سے رخصت ہو کر اپنے مختصر قافلے کے ساتھ گلنار سے ملنے بزنس ٹرین کے vip کمپارٹمنٹ میں آئیں۔

بھئی تمہیں مبارک ہو گلنار تم نے میرا سب سے قابل بیٹا اپنے نام کر لیا ہے تم اپنی قسمت پر جتنا رشک کرو کم ہے ہمارے اونچے خاندان سے رشتہ جوڑ کر تمہارا زمیندار باپ بھی کچھ کم خوش نہ تھا۔ گلنار زیب نصرت کی تقریر سر جھکائے سن رہی تھی لیکن ہونٹوں پر چپ کا پہرا تھا۔

میرے بیٹے کے بڑے رشتے تھے لیکن قرعہ تمہارے نام نکلا ابھی کچھ ہی دیر میں میرا بیٹا آجائے گا گھبرانا نہیں اور یہ جو زیور تم پہنی ہو حفاظت سے رکھنا سمجھ گئیں؟

نصرت زیب کے استفسار پر گلنار نے اثبات میں سر ہلایا کچھ دیر میں وہ کمپارٹمنٹ میں تنہا انتظار کی قید کاٹ رہی تھی۔

اور رات اپنے حصے کی سیاہی......

☆......☆......☆

استاد میں تو کہتا ہوں کسی انسان کا کسی خدا کا پالا نہ پڑے۔ بس جب ایسا ہوتا ہے تو بندہ تو پریشان ہوتا ہی ہے اسکا خدا بھی مشکوک ہو جاتا ہے خدا کی سنے بندے کی مانے یا...... نفس کی۔ اجو کی باتیں سن کر شیدا اچڑ گیا۔

ارے تیری باتیں میری سمجھ نہیں آتیں اٹھاو یہ سامان اور چلتے بنو۔ اس وقت اندھیرا ہے چلتی ٹرین میں کس نے کس کو دیکھا اور دلہن نے جو زیور پہنا ہے وہ۔ اجو نے سوالیہ نظروں سے شیدے کو دیکھا۔

وے تجھے دلہن پہ بھی ہاتھ صاف کرنے ہیں بد بخت...... ساری برات تو لوٹ چکا ہے۔ چل اس نمونے کے تو کپڑے اتار ریل اب پھاٹک عبور کر رہی تھی۔

''سوچ لے استاد اس بار یہ بڑی اسامی ہے پکڑے گئے تو زندہ نہیں بچیں گے۔'' اجو نے خدشہ ظاہر کیا۔

ابے فکر کیوں کرتا ہے ساری برات کو نیند کی گولیوں والی کولڈ رنک بلائی ہے صبح تک کوئی اٹھنے والا نہیں۔

دولہے کے کپڑوں میں جب شیدا گلنار کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو رات اپنے تیسرے پہر کی سیاہی سے منہ رنگ چکی تھی۔

صبح ٹرین میں قیامت مچی تھی گلنار کے ساتھ ساتھ معراج محمد کا غرور بھی لٹ چکا تھا۔ گلنار نے لاکھ صفائی دی کہ وہ اندھیرے میں شیدے کو پہچان نہ سکی لیکن زیب نصرت نے اگلی ٹرین ہی سے یہ کہہ کر گلنار کو طلاق کے طوق کے ساتھ معراج محمد کے پاس واپس بھجوا دیا کہ اس تمام لوٹ مار میں گلنار

نے اپنے آشنا کا ساتھ دیا اور وہ اس چوری میں برابر کی شریک ہے۔ شیدا اور اجو چند دن بعد شہر کے چوراہے پر پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

☆......☆......☆

"قربان علی ساتھ والے گاؤں سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"اندر لے آؤ......" قربان علی نے منشی کو نظر اٹھا کر دیکھا منشی حکم ملتے ہی الٹے قدموں لوٹ گیا۔

کچھ ہی دیر میں مہر بخش اور زبیر قربان علی کی بیٹھک میں موجود تھے۔

"میں آپ سے لمبی چوڑی باتیں کرنے نہیں آیا چودھری صاحب یہ میرا بیٹا ہے زبیر اچھا پڑھا لکھا اور برسر روزگار نوجوان ہے ہم ساتھ والے گاؤں کے ایک چھوٹے سے گھر میں پرسکون زندگی گزار رہے ہیں میں زبیر کے لیے زینت کا رشتہ مانگنے آیا ہوں اگر آپ ہاں کردیں تو ہم آپ کی بیٹی ہو سر آنکھوں پر رکھیں گے۔" قربان علی پھٹی آنکھوں سے مہر بخش کی سادگی اور صاف گوئی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

بزرگوار شاید آپ کے علم میں نہ ہو چند دن بیشتر ہی میری بیٹی کی برات دروازے سے واپس گئی ہے۔ میں خاطر خواہ جہیز دینے کی حالت میں نہیں ہوں۔

ہمیں کچھ نہیں چاہیے قربان علی مہر بخش تیزی سے بولا۔

میں نے مانگتے ہاتھوں کا دکھ دیکھا ہے ان کی تڑپ دیکھی ہے اگر ہم ان کی خاموشی ان کا کرب سن سکتے تو مر جاتے۔ لیکن میرا رب سب کی سنتا ہے۔

سب کچھ عطا کرنے والی ذات میرے خدا کی ہے قربان علی اور مانگنے کا تمام تر حق بھی اس لے محض اپنے لیے مختص کر رکھا ہے واللہ مجھے تم سے سوائے زینت کے کچھ نہیں چاہیے۔" قربان علی کی آنکھیں نم ہوگئیں اس نے آگے بڑھ کر مہر بخش کو مسرت سے تھام لیا۔

"میں جانتا تھا مجھے میرا خدا ضرور ملے گا میں جانتا تھا کسی نہ کسی صورت وہ مجھے واپس ضرور ملے گا میں جانتا تھا میرا رب مجھے ہر حال میں سن سکتا ہے۔ اس کے لیے مجھے مختلف حیلے بہانوں سے خود کو یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وجود کا میک اپ کرنے پر ہی وہ مجھے سنے گا وہ تو ہر عیب سے پاک ہے اس نے مانگنے کے لیے مجھ سے کوئی شرط نہیں باندھی ہوئی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں محض اپنے جی کی تسلی کے لیے ایسا حلیہ بناؤں کہ لوگ مجھے متقی و پرہیز گار سمجھیں میں بات بات پر نصیحت کروں تسبیح گھماؤں دعائیں بیچوں۔

میں اپنے رب کا کاروبار نہیں کرسکتا تھا۔ میں اپنے رب کا اشتہار نہیں لگا سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا میرے مانگنے پر میرا رب مجھے رسوا نہیں کرے گا وہ مجھے بڑھ کر تھام لے گا وہ میری عزت کی لاج رکھے گا۔" قربان علی مہر بخش کے ہاتھ تھام کر اس کی ہتھیلیوں پر تشکر بہا رہا تھا۔

گاؤں میں بارش نہیں ہوئی تھی لیکن اس سال ٹوٹ کر رحمت برسی زینت کو زبیر سے بیاہنا تھا معراج محمد کا غرور توڑنا تھا قربان علی کا خدا ڈھونڈنا تھا اور مہر بخش کو شیدے چور کی جگہ زبیر جیسا فرما بردار بیٹا دینا تھا سارے کام اب بندہ کہاں تک سمجھے سارے کام جو آسمانوں کے ہیں جو سمجھے اس کا خدا۔

□□......❁......□□

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 500/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کپن منی 500/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

دانتوں کی دوا

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکثیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

میرے بچو! اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ وبائی امراض سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان ہدایات پر عمل کیا جائے جو بتائی جارہی ہیں احتیاط لازم ہے۔ غیر ضروری لوگوں سے میل جول سے اجتناب برتنے میں ہی عقلمندی ہے۔ اس کے علاوہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کریں اور آیت الکرسی پڑھ کر ہر بار اپنے اوپر دم کرو۔ میں نے ان تمام بچوں کے لیے جو مستقل میرے رابطے میں رہتے ہیں خصوصی دعا کا اہتمام کیا ہے انشاء اللہ کسی کو کچھ نہیں ہوگا اور اللہ جلد تمام انسانوں کو اس مہلک وبا سے نجات دلائے گا۔

□ سائرہ رمضان۔ لاہور۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ کی عمر میں اضافہ کرے۔ میں نے آپ سے اپنی جلد شادی کے لیے براہ راست وظیفہ مانگا جو ایک مہینے کا تھا۔ وظیفہ پڑھنے سے اب میرے سسرال والے شادی کے لیے کہتے ہیں۔ پہلے تو اس موضوع پر کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ میری نندیں تو کہہ رہی ہیں جون میں شادی کے لیے مگر ساس' سسر نے میرے اماں' ابا سے خود بات نہیں کی۔ میں چاہتی ہوں کہ مئی میں شادی ہو جائے کیونکہ میری بہن کی شادی بھی اسی مہینے میں ہے۔ اب آپ کوئی چھوٹا سا وظیفہ بتا دیں۔ دوسرا مسئلہ میرے بالوں کا ہے جو بہت خراب ہیں' گرتے بھی ہیں اور دو منہ نکلے ہوئے ہیں' خشک بھی بہت ہیں۔

☆ بیٹی سائرہ! اللہ نے تم پر کرم کیا اور تم جو چاہتی تھیں' وہ ہوا۔ اللہ کا شکر کرو۔ پچھلے وظیفے کی زکوٰۃ ضرور نکال دینا۔ بالوں میں سرسوں کا تیل ہفتے میں دو دفعہ لگاؤ۔ بال نوکوں پر سے کاٹ لو تاکہ وہ بڑھ سکیں۔ اپنی خوراک پر توجہ دو۔ خوب پانی پیو اور نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ کہف پڑھو اور حاجات بیان کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ شہلا۔ کراچی۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں اپنا ایک مسئلہ لکھ رہی ہوں اس امید پر کہ بہت جلدی جواب دیں گے۔ میرے گھر کے مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ

اطلاع عام

قارئین بھائی' بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ اس نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C-II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7' کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893122-35893123

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے' جھائیاں ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے خالص جڑی بوٹیوں سے تیار دوا سچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

بتا نہیں سکتی۔ میں نے ایک جگہ انٹرویو دیا ہوا ہے' پانچ ماہ ہو گئے ہیں' کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کے لیے ضرور کوئی وظیفہ بتائیں کہ کام ہو جائے۔

☆ بیٹی شہلا! رزق میں برکت کے لیے ہر نماز کے بعد 3-3 مرتبہ "یَا مَالِکُ" کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجت بیان کرو۔

□ ریحانہ شاہ۔ لاڑکانہ۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھ میں خود اعتمادی نہیں ہے۔ میرے پاس ہر چیز اور ہر نعمت ہے۔ میں شکل' ذہانت' پڑھائی ہر چیز میں ٹھیک ہوں پھر بھی مجھ میں اعتماد کی بہت کمی ہے۔ کوئی ذرا سی سخت بات کر دے تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی رونے لگتی ہوں۔ کلاس کے دوران پروفیسر کو درست جواب بھی جھجک کر دیتی ہوں کہ کہیں غلط نہ ہو جائے۔ جب تک کسی سے فریک نہ ہو جاؤں' اس وقت تک اعتماد سے بات نہیں کر سکتی اور اگر منہ سے کوئی غلط بات نکل جائے تو بہت دن تک شرمندہ ہوتی رہتی ہوں کہ میرے ساتھ اس طرح کیوں ہوا؟ قوت فیصلہ کی کمی بھی ہے۔ اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے بھی کھل کر مطالبہ نہیں کر سکتی۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرا اعتماد بحال ہو جائے۔

☆ بیٹی ریحانہ! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز فجر کے بعد 41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو۔ لوگوں سے گھل مل کر بات کیا کرو۔ یہ یقین کر لو کہ تم ایک مکمل لڑکی ہو اور بیٹی.....! جب تک غلطیاں نہیں ہوں گی' اصلاح کیسے ہوگی؟ زندگی میں آگے کیسے بڑھو گی؟ وظیفہ ایک ماہ تک کرو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے اور صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو تمہاری ذات سے دکھ نہ پہنچے۔ ہلکی پھلکی ورزش کیا کرو۔

□ سرمد علی۔ کوٹ ادو

☆ بیٹے سرمد! تمہاری سوچ غلط ہے۔ بے فکر رہو' تم ایک مکمل انسان ہو۔ جس چیز کو تم کمزوری جان رہے وہ' وہ ایک فطری عمل ہے۔ تمہیں جواب صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ تمہارے دل سے وہم نکل جائے۔ تعلیم مکمل کر کے شادی کر لینا۔ یقین رکھو' تم ایک مکمل اور خوشگوار زندگی گزارو گے۔

□ ابراہیم۔ جام شورو۔

○ جناب بابا جی! میں رسالہ "سچی کہانیاں" پندرہ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اس عرصے میں "مسئلہ یہ ہے" بھی میری نظروں سے گزرتا رہا۔ اگرچہ میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر میں اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتا رہا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بے شمار لوگوں کے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ آپ ہر سوالی کو نماز ادا کرنے کی تاکید کرتے رہے اور کر رہے ہیں پھر مجھے خیال آیا کہ لوگوں کے مسائل اللہ کے کلام اور نماز کی برکت سے حل ہوتے ہیں لہٰذا میں نے بھی نماز شروع کر دی۔ بفضلِ خدا اب میں پنج وقتہ نمازی ہوں۔ نماز کی برکت سے مجھے سکونِ قلب کے ساتھ ساتھ مالی فائدے بھی ہوئے۔ یہ خط لکھنے کا مقصد

بے اولاد جوڑوں کے لیے شرطیہ علاج' بانجھ پن یا کسی اور وجہ سے اگر اولاد نہ ہوتی ہو تو فوری رابطہ کریں۔ اور چند ماہ کے علاج کے بعد اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلائیں۔

صرف اتنا ہے کہ آپ نے مجھے ہی نہیں بلکہ ہزاروں لوگوں کو نمازی بنا دیا ہے جس کا اجر آپ کو ضرور ملے گا۔ خدا آپ کو طویل عمر عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کو نمازی بنانے اور ان کے مسائل حل کرتے رہیں۔

☆ بیٹے محمد ابراہیم! میں تو خالقِ کائنات کا بہت ہی عاجز و ناچیز بندہ ہوں۔ مسائل حل کرنے والا تو وہی رَب رحیم و کریم ہے۔ انسان نماز میں اسی کے حضور میں سجدہ ریز ہوتا ہے اور وہ اپنے سامنے سر جھکانے والے کی دُعا ضرور قبول فرماتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم پنج وقتہ نمازی بن گئے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ فرض ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

□ زینب شیخ۔ لندن۔

○ محترم بابا جی! میں اپنی بچیوں کے رشتے کے لیے بے حد پریشان تھی اور اسی لیے میں نے براہ راست آپ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری دونوں بیٹیوں کے پاکستانی لڑکوں سے رشتے ہو گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم لوگ جو یہاں آ کے بس گئے ہیں، بچیوں کے رشتے کے لیے کس قدر پریشان رہتے ہیں۔ خدا آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح ضرورت مند لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ میں آپ کی بے حد مشکور ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں جب بھی پاکستان آئی، حاضری دوں گی۔

☆ بیٹی زینب! اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔ مشکلیں حل کرنے والی ذات اسی کی ہے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتی

بالوں کا گرنا، خشکی، بے جان بال ان سب کے لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو سال پرانا نسخہ...... اب آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ رابطہ 35893121-35893122

رہو۔ اس کے نام پر صدقہ اور خیرات کرتی رہنا اور نماز کی پابندی کبھی نہ بھولنا۔ بیٹیوں کو بھی نماز کی تاکید کرنا۔ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں کہ میں کسی سے نہیں ملتا۔

□ شاہانہ بیگم۔ پتوکی۔

○ بزرگوار بابا جی! میں نے دانتوں کی دوا کے لیے خط لکھا تھا مگر دفتر والوں نے بتایا کہ وہ دوا وی پی پارسل سے نہیں بھیجی جا سکتی اس لیے میں نے ایک عزیز کو دفتر بھیجا جو کراچی میں رہتا ہے۔ اس نے دوائی مجھ تک پہنچائی۔ میں نے اسے استعمال کیا تو مجھے بہت فائدہ ہوا۔ خدا آپ کو خوش رکھے کیا یہ دوا میں مستقل استعمال کر سکتی ہوں۔

☆ بیٹی شاہانہ! شفا دینے والا وہی مہربان آقا ہے۔ میں تو اس کا عاصی بندہ ہوں۔ دوا کے ساتھ دُعا بھی ضروری ہے۔ نماز کے بعد مانگی جانے والی دُعائیں قبول ہوتی ہیں اس لیے نماز پابندی سے پڑھتی رہنا اور حسب توفیق صدقہ وخیرات بھی دیا کرو۔ دوا روز کی بنیاد پر استعمال کرو بہت فائدہ ہوگا۔

□ کمال احمد۔ اسلام آباد۔

○ جناب محترم بابا جی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے براہ راست آپ سے مالی مشکلات اور مقدمے کے سلسلے میں جو وظیفہ منگوایا تھا، وہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں

وہ بچے اور بچیاں جو دبلے پن سے پریشان ہیں اور لوگوں کے ہتک آمیز جملوں کا نشانہ بنتے ہیں فوری طور پر رابطہ کریں 2 مہینے کے علاج سے اس مسئلے سے جان چھوٹ جائے گی۔

اندرونی اور بیرونی زخموں، آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچا رہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی، دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میری مشکلات بھی حل ہو گئیں۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا اس لیے یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ پاک آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆ بیٹے کمال! میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں تو عاجز و عاصی بندہ ہوں۔ کرم کرنے والی ذات پاک اللہ تعالیٰ کی ہے، اسی کا شکر ادا کرو جس کا سب سے بہتر طریقہ نماز کی ادائیگی ہے۔ حسب توفیق صدقہ اور خیرات بھی دینا۔

□ آمنہ۔ فیصل آباد۔

○ بزرگ بابا جی! السلام علیکم! میں نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں آپ سے براہ راست وظیفے کی درخواست کی تھی۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ مکمل ہونے کے بعد بھی مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں مایوس ہو گئی تھی مگر دو روز پہلے مجھے مطلوبہ ملازمت مل گئی ہے جس کے لیے میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔ جس طرح آپ ہم ضرورت مندوں کے کام آ رہے ہیں، اس کا اجر اللہ پاک آپ کو ضرور دے گا۔ ہم تو صرف دُعا دے سکتے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور لمبی عمر دے۔

☆ بیٹی آمنہ! اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ صدق دل سے دُعا کی جائے تو وہ ضرور سنتا ہے۔ میں تو اس کا ناچیز اور گناہ گار بندہ ہوں اس لیے میرا شکر ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی آقا کا شکر ادا کرو جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ نماز پابندی سے پڑھتی رہنا۔

□ مسز عیسیٰ، کراچی۔

○ بابا جی! سلام و دُعا! میں نے اپنے شوہر کے لیے براہ راست وظیفہ منگوایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں کینیڈا کا ویزہ مل گیا ہے اور ہم بہت جلد کینیڈا چلے جائیں گے۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا، سو دے رہی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆ بیٹی......! مجھے خوشی ہے کہ مہربان آقا نے تمہاری دُعا قبول فرمائی اور تمہاری مراد پوری کی۔ اب نماز کی پابندی برقرار رکھنا اور حسب توفیق صدقہ وخیرات بھی ضرور دینا۔

□ نیلوفر، ملتان۔

○ اچھے بابا جی! بعد از سلام عرض ہے کہ میں نے آپ سے اپنے رشتے کے لیے براہ راست جو وظیفہ منگوایا تھا، وہ کامیاب ثابت ہوا۔ ہمارے خاندان والوں میں صلح ہو گئی اور میں جس لڑکے کو دل و جان سے چاہتی تھی، اس کے والدین میرے لیے رشتے کا پیغام لے آئے۔ میری شادی بھی ہو گئی ہے۔ میں اور میرا شوہر دونوں آپ کے بے حد مشکور اور ممنون ہیں۔ اطلاع دینے میں کچھ دیر ہو گئی جس کے لیے معافی کی خواستگار ہوں۔ خدا آپ کو لمبی عمر دے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کو مشکلوں سے نجات دلاتے رہیں۔

☆ بیٹی نیلوفر......! اللہ تعالیٰ تمہیں شاد و آباد

بچیاں جن کی شادی میں رکاوٹ ہے اپنی والدہ کے نام کے ساتھ لکھیں کلام الٰہی سے شرطیہ علاج انشاءاللہ چند دنوں میں رکاوٹ دور ہوں گی اور من پسند شخص ملے گا۔

رکھے۔ میں تو پروردگار کا ناچیز اور عاصی بندہ ہوں۔ بگڑے کام تو وہ آقا بناتا ہے جو رحیم و کریم ہے۔ اس کا شکر ادا کرتی رہنا اور حسب توفیق خیرات اور صدقہ بھی دینا۔ نماز میں بھی غفلت نہ برتنا۔

□ بیٹی۔ ساہیوال۔

☆ بیٹی! تمہارا خط شائع کرنا تمہارے لیے مزید مشکلات پیدا کر سکتا ہے اس لیے شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ دونوں خواتین کے نام لے کر دُعا کیا کرو کہ ربُّ العزت! مجھے اور میرے شوہر کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھو۔ اذھب الباس لرب الناس اور شوہر پر تصور میں دم کردو۔ اپنے اور شوہر کے اوپر سے حسب استطاعت صدقہ ضرور نکالا کرو۔ کرم ہوگا۔ مجھے ایک ماہ کے بعد مطلع کرو۔

□ مریم، کراچی۔

☆ بیٹی مریم! رقم محفوظ کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس میں سے کچھ رقم ضرورت مندوں کو دے دی جائے جو جائز حقدار ہوں۔ تمہاری حاجت وظیفے کی بدولت پوری ہوئی ہے لہٰذا وظیفے کی زکوٰۃ ضرور نکال دو۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی کرم کرے گا۔ ہر دم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو کہ اس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

□ کشمالہ سحر۔ آزاد کشمیر۔

○ محترم بابا جی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کر دیئے، ان میں میرا بھی مسئلہ حل کریں۔ میں بہت پریشان ہوں، پریشانی کی وجہ میری نوکری ہے۔ بابا! میرے والد صاحب کو فوت ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ ہم دو بہنیں بڑی ہیں۔ بھائی چھوٹے ہیں جو کہ میٹرک میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ایف اے کر لیا تو مجھے اسکول ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ اس سے ہمارے مالی حالات میں کچھ بہتری ہوئی۔ اس تنخواہ سے میں اپنے بھائیوں کی اسکول کی فیس اور گھر کا تھوڑا بہت خرچ چل جاتا تھا لیکن اب میری نوکری ختم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی! میں نے کورٹ میں اپیل دائر کی ہے۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتا دیں جس سے مجھے نوکری پر بحال کر دیا جائے۔ میں آپ کی مشکور رہوں گی اور ساری عمر آپ کو دُعائیں دیتی رہوں گی۔ میں پانچ وقت پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہوں۔ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ ہمارے گھریلو حالات ہیں، ابو کی وفات کے بعد ہمارا کوئی کمانے والا بھی نہیں ہے۔ سارے رشتے دار بھی منہ موڑ گئے ہیں۔ ہماری ماں ہماری طرف سے بہت پریشان ہیں۔ آپ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ بتا دیں جس سے ہمارے مالی حالات اچھے ہو جائیں۔

☆ بیٹی کشمالہ! خوش رہو۔ اپنے حق کے لیے لڑنا بہادری ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ وہ سچائی کے راستے پر چلنے والوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ القصص آیت 24، 7-7 تسبیح پڑھ کر حاجات بیان کرو۔ بیٹی! ترجمہ بھی پڑھا کرو۔ انشاء اللہ، کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے یا اگر چاہو تو تعویذ منگوالو۔

□ بے نظیر۔ لاڑکانہ

☆ بیٹی بے نظیر! تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا حالانکہ میں چاہ رہا تھا کہ دیگر لوگ بھی پڑھیں کہ آج بھی بچیوں کے ساتھ زمانہ جہالت والا رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ مرد کو عورت کا محافظ بنایا ہے چاہیے وہ باپ ہو، بیٹا، بھائی یا شوہر حفاظت اس کے ذمے ہے۔ جانوروں کی طرح عورت کو قید کرنا مناسب نہیں تم لوگ یا سلام کا سوا لاکھ کا ختم کروا ایک ہی نشست میں انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ آمنہ خاتون۔ کراچی۔

○ بابا جی! گزارش یہ ہے کہ کافی عرصے سے ہمارے سر، آنکھ اور پیشانی میں شدید درد رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ سر میں نزلے کا پانی بہت زیادہ خشک ہو گیا ہے، جس طرح ہڈی سخت ہوتی ہے، بالکل اسی طرح نزلے کا پانی ہڈی کی طرح سخت اور خشک ہو گیا ہے۔ ہر وقت درد اور خشکی کی وجہ سے سر کے بال بہت زیادہ گر گئے، آنکھ کی روشنی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ طبیعت بہت پریشان رہتی ہے۔ بابا جی! میں نے بہت علاج کروایا، حکمت، ہومیو پیتھک اور ڈاکٹری لیکن علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سر میں خشکی کی وجہ سے رات کے وقت نیند بالکل نہیں آتی۔ بابا جی! میں شادی شدہ ہوں، گھر کے کام کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے۔ آپ دُعا یا دوا ہمیں ضرور بتائیں تاکہ اس پریشانی سے نجات ملے۔ بابا جی! ہمارا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ شوہر بہت غیر ذمے دار اور سخت انسان ہیں۔ گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے، میں جانتی ہوں کہ وہ اپنی ذمے داری کو سمجھیں اور ہمارے ساتھ نرم رویہ رکھیں۔ ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہوں۔ بابا جی! ڈیڑھ ماہ دن پہلے میری شادی تین بچوں کے باپ سے ہوئی۔ شادی سے پہلے انتہائی نیک، شریف بن کے آئے لیکن شادی کے بعد بیوی کے ساتھ نوکرانی جیسا سلوک کر رہے ہیں۔ گھر، بچوں اور شوہر کے تمام کام کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ بابا جی! اتنا زیادہ کام مجھ سے بالکل نہیں ہو سکتا ہے۔ میری صحت بہت کمزور ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہر وقت مجھ پر غصہ کرتے ہیں اور طلاق دینا چاہتے ہیں۔ وہ میرا ضروری خرچ بھی نہیں دیتے، مجھ پر کام کے علاوہ بھی بہت زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں۔ کوئی ایسی دُعا بتائیں کہ وہ مجھ سے محبت اور نرمی سے پیش آئیں۔ میری مجبوری اور مرض کو سمجھیں۔

☆ بیٹی آمنہ! میں بھی تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ ہمت اور صبر سے حالات کا سامنا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک دیگچی میں پانی خوب ابالو پھر سونے سے قبل اچھی طرح بھاپ لے لیا کرو۔ رات کو ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! خاموش رہا کرو اور ہر وقت یَا قَھارُ کا ورد کیا کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ مجھے 3 ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ مومو۔ سیالکوٹ۔

○ بابا جی! السلام علیکم! میرا پہلا مسئلہ میرے سر میں بے شمار دانے اور پھوڑے نکلنے کا ہے، یہ دانے اور پھوڑے تقریباً موسمِ گرما سے نکلنا شروع ہوئے تھے اور اب جبکہ موسمِ سرما ہے تو اب یہ اور بھی شدت کے ساتھ تکلیف دیتے ہیں۔ ان میں درد، خارش بے حد ہوتی ہے۔ ان کے لیے دیسی حل کے ساتھ ساتھ اللہ کے اسمِ مبارک کا ورد بھی بتائیے گا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے پچھلے حصے میں درد کا ہے، جس کے بارے میں آپ کو پہلے لکھا تھا۔ ابھی زیادہ فرق نہیں پڑا ہے۔ سر کے پچھلے حصے کا درد اب سر کے اردگرد کے اوپر کی جانب بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی دیسی حل بھی بتائیے گا۔

☆ بیٹی مومو! سب سے پہلے تو اپنا تولیہ الگ کر لو۔ نیم کے پتے توڑ کر اچھی طرح دھولو پھر انہیں خوب ابالو، اتنا ابالو کہ پانی آدھا رہ جائے پھر اس پانی سے جب بھی سر دھو، آخر میں بال نتھار لیا کرو۔ یہ بہت آسان سا علاج ہے۔ سر میں جب درد ہو تو کسی کپڑے میں برف کچل کر رکھ لو اور اس سے سر کی ٹکور کرو، بس 10 منٹ۔ انشاء اللہ، ضرور آرام ملے گا۔ یَارَحِیمُ کا ورد بہت کیا کرو۔

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

قارئین

فرمانِ الٰہی

جوکوئی اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے والا ہے اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔ جو شخص بھی اللہ کی راہ میں کوشش (اور محنت) کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا۔ بے شک اللہ دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ہم ان کے گناہ ان سے دور کردیں گے اور انہیں ان کے اعمال کا زیادہ اچھا بدلہ دیں گے۔ (العنکبوت:5 تا7)

نیکی اور گناہ کی تعریف

حضرت نواس بن سمعان الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بھلائی (نیکی) حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جس کی کھٹک تمہارے دل میں رہے اور دوسرے لوگوں کا اس کے بارے میں جاننا تمہیں ناگوار ہو۔''
(صحیح مسلم شریف: باب تفسیر البر والاثم)

ہم مدینے سے کیوں آ گئے

تقریباً 40' 42 سال پہلے ہم لوگ لیبیا کے شہر بنعازی تقریباً دو سال کے لیے گئے تھے بہت خوبصورت شہر' بہت اچھے لوگ پاکستانی لیبین پڑوسی سب کچھ اچھا تھا۔ میرے شوہر کی جاب تھی۔ آتے وقت حج کا مہینہ تھا۔ لہٰذا بلاوا آ گیا تھا تین بچے تھے دو بیٹیاں اور ایک صاحبزادے' ہم نے وہاں حج ادا کیا واپس پاکستان آ گئے اس وقت مدینہ منورہ کی ایک یا دو دفعہ حاضری دی اس کے بعد یاد آتی تھی مگر بلاوا نہیں تھا۔ 18 اکتوبر 2019ء کو دوبارہ آقا کے در کی حاضری ہوئی آقائے دو جہاں نے بلایا۔ سبحان اللہ اللہ کا کرم ہے۔ یہ حاضری یاد آتی ہے۔ مدینہ منورہ میں مکہ معظمہ میں ایسا لگتا تھا جیسے خواب دیکھ رہے ہیں یہاں آ کے دل کی تڑپ بیان نہیں کی جا رہی۔ ہم پہلے مدینہ منورہ بلائے گئے ہوٹل سے صبح صبح نہا کر نکلے تھوڑی دور سڑک پر چلنے کے بعد سیدھے ہاتھ کو گلی میں مڑے آنکھوں پر یقین نہیں آیا سامنے گنبد خضراء نظر آیا۔ دل کی کیفیت نہیں بتا سکتی اور مزید کچھ لکھا بھی نہیں جا رہا بس دعا ہے اللہ پاک بار بار حاضری نصیب فرمائے آمین۔

آیت الکرسی پڑھا کرو

یہ میں سچا واقعہ بیان کر رہی ہوں۔ 1971ء کی جنگ کا واقعہ ہے جب ہندوستان کی فوج نے چڑھائی کر دی تھی۔ میری شادی کو ایک سال ہوا تھا

اور میری 3 ماہ کی ایک بچی تھی۔ میرے شوہر ڈاکٹر تھے۔ اُن کو فوج میں جانا ہوا۔ وہ سرحد پر اپنا فرض ادا کر رہے تھے (کیپٹن تھے) میں اپنی والدہ کے گھر آ گئی تھی اس وقت حیدری سنسان تھا۔ والدہ ہر وقت آیت الکرسی پڑھنے کی ہدایت کرتی تھیں لہٰذا ہم سب بہن بھائیوں کو آیت الکرسی پڑھنے کی عادت ہوگئی۔ رات کو بلیک آؤٹ ہوتا تھا سب طرف اندھیرا بچی چھوٹی تھی لہٰذا گدا خراب بھی ہو جاتا تھا۔ دن میں دھو کر دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا شام تک اتار لیا جاتا تھا۔

ایک دن شام ہوئی تو تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے بھائی نے گدا لا کر بچھا دیا۔ میں نے بتایا تھا کہ حیدر اُس وقت سنسان تھا وہاں دیواروں پر (گوہ) ہوتی تھیں۔ چھپکلی کی شکل کی بہت بڑی...... بلیک آؤٹ تھا۔

خیر گدے پر سب سو گئے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کوئی جانور گدے کے نیچے ہے آیت الکرسی کا حصار بنا کر سو گئے۔ صبح ہونے کے بعد جب گدا اٹھایا گیا تو نیچے سے بہت بڑی گوہ مری ہوئی نکلی۔ اگر کسی کو کاٹ لیتی تو زندہ رہنا مشکل تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کی وجہ سے اللہ پاک نے سب کو بچا لیا' والدہ فرمان مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ہمیں آیت الکرسی کا ورد کرنے کی تاکید فرماتی تھیں ساتھ ہی یہ بھی کہ آیت الکرسی پڑھا کرو اللہ پاک تمہاری بھی حفاظت فرمائے گا اور تمہارے پڑوس کی بھی...... دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اقوال حضرت علیؓ

1) کسی کے تاج محل کو دیکھ کر خود کو کم تر مت سمجھو کیونکہ مرنے کے بعد سب کی قبریں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

2) جہاں تمہاری عزت نہ ہو وہاں کبھی بھول کر بھی مت جاؤ چاہے کیوں نہ تمہیں ہاں سونے کی پلیٹ اور چاندی کے چمچ میں کھانا دیا جائے۔

3) اس شخص میں ہرگز دلچسپی نہ لو جو تم سے دوری اختیار کرتا ہے۔

4) کسی کو معاف کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرو کہ وہ باغی ہو جائے اور نہ کہ اتنی جلدی کرو کہ اسے اپنا جرم جرم ہی نہ لگے۔

5) دوست ہو یا پرندہ دونوں کو آزاد چھوڑ دو لوٹ آیا تو تمہارا نہ لوٹ کر آیا تو وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔

6) کسی کا عیب تلاش کرنے والے کی مثال اس مکھی جیسی ہے جو سارا خوبصورت بدن چھوڑ کر صرف زخم پر جا بیٹھتی ہے۔

7) جس چیز کو پورا نہ کر سکو اس کا وعدہ نہ کرو اور جس چیز کو نبھا نہ سکو اس کی تم ہرگز ذمہ داری نہ اٹھاؤ۔

8) یقین کی حالت میں سونا شک کی حالت میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

9) زبان کا وزن بہت ہی ہلکا ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ اس کو سنبھال پاتے ہیں۔

10) زندگی کے ہر موڑ پر صلح کرنا سیکھو کیونکہ جھکتا وہی ہے جس میں جان ہوتی ہے اکڑنا تو مردے کی پہچان ہوتی ہے۔

11) جسم ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا جب تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکان سونے کی ہے یا لوہے کی۔

12) دوست کو دولت کی نگاہ سے مت دیکھو کیونکہ وفادار دوست اکثر غریب ہوتے ہیں۔

............*

علم اور دولت

دس آدمیوں کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا علم اور دولت میں

کسے برتری حاصل ہے براہ کرم ہم سب کو الگ الگ جواب مرحمت فرمائیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔

1) دولت فرعون کا ورثہ ہے اور علم انبیاء کا عطیہ ہے۔

2) دولت کی حفاظت تم کرتے ہو اور تمہاری حفاظت علم کرتا ہے۔

3) جس کے پاس دولت ہو اس کے بہت سے دشمن ہوتے ہیں اور جس کے پاس علم ہو اس کے بہت سے دوست ہوتے ہیں۔

4) دولت بانٹی جائے تو کم ہو جاتی ہے علم بانٹا جائے تو بڑھ جاتا ہے۔

5) دولت مند کنجوسی کی طرف مائل رہتا ہے اور عالم فیاضی کی طرف۔

6) دولت چرائی جاسکتی ہے اور علم چرایا نہیں جاسکتا۔

7) دولت وقت کے ساتھ کم ہوتی ہے علم کبھی نہیں گھٹتا۔

8) دولت محدود ہے اس کا حساب رکھا جاسکتا ہے علم لامحدود ہے اس کا کوئی حساب نہیں۔

9) دولت سے اکثر دل و دماغ پر سیاہی چھا جاتی ہے لیکن علم سے دل و دماغ جلا پاتے ہیں۔

10) دولت نے فرعون اور نمرود جیسے خدائی کا دعوے کرنے والے پیدا کیے اور علم نے انسان کو سچے معبود سے متعارف کروایا۔

محمد کمیل ساگر۔ گھنگوال شریف

ہم جسے ٹرک کہتے ہیں

یہ سڑکوں کا راجا بلکہ مہاراجہ ہوتا ہے۔ اس کا غصہ رعب اور دبدبہ دور ہی سے نظر آتا ہے۔ اس کی ایسی نرالی شان ہے کہ ببر شیر بھی ڈر کے بھاگ جائے اور انسان تو پہلے ہی بہت کمزور مخلوق ہے۔ کبھی آپ نے روڈ پر چلتے ہوئے ٹرک کو غور سے دیکھا ہے ایسا لگتا ہے کہ نا رکنے والا طوفان ہے۔ ایسی مستانی چال ہے کہ دیکھ کر مائیں اپنے جگر گوشوں کو سینے سے لگا لیتی ہیں۔ یہ سڑک پر چلنے والا وہ راجہ ہے کہ شاید ہی کبھی کسی کو راستہ دے دے۔ چھوٹی موٹی گاڑیاں اس کو دیکھ کر یوں سہم کر ہٹتی ہیں۔ مہاراجہ رحم رحم کی پکار جاری ہوتی ہے۔ جیسے اپیل کر رہی ہوں۔ خدارا بچ بچا کر مبادا جناب کا مزاج ٹھیک نہ ہو اور وہ قدموں تلے مسل کر نہ چل دے۔

ان کو چلانے والے بھی شاہکار ہوتے ہیں۔ راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں آپ مسلسل ہارن بجائیں مجال ہے وہ ٹس سے مس ہو جائیں۔ ٹرک میں بیٹھے کبھی کان کھجا رہے ہیں تو کبھی کنگھی کر رہے ہیں۔

ویسے بھی ٹرک کیا ہے؟ ایک آرٹ کا نہ سمجھنے والا نمونہ ہے اس پر جو تصاویر ہوتی ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ ایک سوکھا پتلا کانگڑی پہلوان ایک شیر کا جبڑا کھول رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے کون سا ایسا وٹامن سے بھرا عرق نوش فرما لیا ہے کہ شیر کا جبڑا کھول دیا ہے یا اس کی ہیبت کو دیکھ کر معصوم شیر نے خود ہی اپنا منہ کھول دیا ہے۔

............*

ستم ظریفی

اخباری نمائندوں کا ایک گروپ ملک کے مشہور پاگل خانے کا دورہ کرنے آیا تھا۔ ایک ڈاکٹر انہیں دورہ کراتے ہوئے گائیڈ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ گروپ کے ارکان ایک کوٹھڑی کے سامنے رُکے تو انہوں نے دیکھا کہ اس میں ایک پاگل ہاتھوں میں بڑی سی گڑیا لیے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی اس سے باتیں کرنے لگتا اور کبھی رونے لگتا۔ اسے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہ تھا۔

''اس شخص کی کہانی بڑی المناک ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''اسے ایک لڑکی سے شدید محبت تھی لیکن اس نے بے وفائی کی اور اسے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لی۔ اس غم میں یہ پاگل ہو گیا' اب یہ اس گڑیا کو وہی لڑکی سمجھ کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔''

اخباری نمائندوں نے مختلف انداز میں اس شخص کے بارے میں تاسف اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ آگے بڑھے تو ایک کوٹھڑی میں ایک شخص نظر آیا جو دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ اس کے سر کو چوٹ سے بچانے کے لیے دیواروں پر فوم کے گدے لگا دیے گئے تھے۔

''اور یہ وہ شخص ہے جس سے اس لڑکی نے شادی کی تھی۔'' ڈاکٹر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اراکین کو آگاہ کیا۔

آنسو

یہ آنسو کتنے عجیب ہوتے ہیں جب برستے ہیں تو بارش کی طرح لگتے ہیں اس کا پانی سمندر سے ملتا جلتا ہے۔ آنکھوں سے جب لہر کی طرح باہر آتا ہے تو ننھے منے موتی کے نشان چہرے پر چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی یہ غم میں برستے ہیں تو کبھی کسی کی یاد میں نکل آتے ہیں۔ کبھی جدائی میں بہتے ہیں اور کبھی یہی آنسو خوشی میں نکلتے ہیں تو کتنے عجیب لگتے ہیں۔

چوہدری یاسر وکی۔ دیپالپور

غزل

ہمارے شہر میں اک رسم شکریہ بھی ہے
سو شکریہ کہ محبت کو کچھ گلہ بھی ہے
سنا ہے ہجر کا موسم گزار لو گے تم
کہو کہ ہجر کا مطلب تمہیں پتہ بھی ہے
جنوں سہی یہ محبت مگر غنیمت ہے
کہ اس کے دم سے تعلق کا سلسلہ بھی ہے
چلو کہ لوٹ چلیں بے سبب ہی رستے سے
نگاہ دوست میں اک حرف التجا بھی ہے
گزر گ ء جو دل مضطرب پہ گزری ہے
تم ہی بتاؤ کبھی تم سے کچھ کہا بھی ہے

............*

eeeeeeeeeeee

محبتیں جتلائی نہیں جاتی جو جتلا دی جائے پھر وہ محبت تو نہیں ہوتی احسان ہوا کرتا ہے اور احسانوں کے بدلے اتار دیے جائے تو پھر کوء امید نہیں رکھنی چاہیے محبت جتنی گہری ہو اتنی خاموش ہوتی ہے دریا کی طرح ساتھ ساتھ بہتی ہے نہ کوئی شکوہ نہ شکایت نہ کوئی لب پر گلہ رکھتی ہے وہ محبت ہی کیا جو بار ہا باور کرا دی جائے انگلیوں پر گنوا دی جائے محبتوں کو سنبھالے رکھنے کیلیے انا کو اپنے جذبات کو پس پشت ڈالنا ہی پڑتا ہے۔

پتا ہے کیا، کبھی کبھی جو انسان چاہ رہا ہوتا ہے ویسا اس لیے بھی نہیں ہوتا کہ ممکن ہے جب اس کو اپنی خواہش کی چیز مل جائے تو وہ دنیا میں گم ہو جائے اور اللہ سے ہی دور ہو جائے جیسے قارون کو مال ملا تو اس نے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے تکبر کا مظاہرہ کیا، اور نعمت اس کے لیے زوال بن گئی انسان کو لگتا ہے فلاں چیز میرے لیے نعمت ہوگی لیکن کبھی وہ ہی زحمت بن جاتی ہے، چاہے اسے کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگتی ہو اس لیے ہمیشہ یہی سوچنا چاہیے کہ اللہ میرے ساتھ ہے، اللہ میری طرف ہے وہ میرے لیے ہر معاملے میں آسانی پیدا کرے گا، اللہ اکیلے ہی سب کے لیے کافی ہے وہ کسی کو نہیں چھوڑتا، کچھ نہیں بھولتا۔

ارشد اقبال چوہان۔ فیصل آباد

شاطر مرد بے وقوف عورت

مرد عورت کا دل شکار کرنے کے لیے بڑی

ہوشیاری سے اس کی پسند کا چولا پہنتا ہے پھر جب اس عورت کو حاصل کر لیتا ہے تو اپنے اصلی رنگ ڈھنگ میں آ جاتا ہے عورت سمجھتی ہے مرد بدل گیا ہے حالانکہ وہ بدلتا نہیں ہے اپنے اصل پر واپس لوٹتا ہے کچھ رنگ نئے میں۔

شازیہ چوہدری

بیٹی

جہیز کیا ہوتا ہے
اس باپ سے پوچھو
جس کی زمین بھی چلی گئی
اور بیٹی بھی

روشن کرنیں

جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں اسی طرح وقت سے پہلے جنم لینے والی محبت بھی کمزور ہی رہتی ہے۔

اٹلی کی کہاوت ہے کہ جیسی بیٹی چاہتے ہو وہی ہی بیوی لاؤ عزت کے موتی پر اگر ذرا سا بھی میل آ جائے تو سینکڑوں افراد بھی دھو نہیں سکتے اگر کوئی آپ سے سچی محبت کا دعویدار ہے تو اس سے نکاح کا حلال رشتہ جوڑیئے۔

ہم عورت اُسی کو سمجھتے ہیں جو ہمارے گھر کی ہو باقی ہمارے گھر کی ہو باقی ہمارے لیے کوئی عورت نہیں ہوتی بس گوشت کی دکان ہوتی ہے اور ہم اس دکان کے باہر کھڑے کتوں کی طرح ہوتے ہیں جن کی ہوس زدہ نظر ہمیشہ گوشت پر ٹکی رہتی ہے۔

محبت تو جذبوں کی امانت ہے فقط بستر کی سلوٹ زدہ چادر پر گزارے جانے والے چند بدبودار لمحے محبت نہیں کہلاتے۔

عورت اور مرد کے درمیان اس وقت تک مفاہمت کا کوئی راستہ پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ میاں بیوی نہ بن جائیں اس سے پہلے عورت مرد کی طرف یوں دیکھتی ہے جیسے بکری قصائی کی طرف۔

............*

واہ وے ڈھولا

کنج بدلے نی راہ وے ڈھولا
واہ وے ڈھولا واہ وے ڈھولا
کیہ کھٹیا اے من مرضی دے
گل وچ پاہ کے پھاہ وے ڈھولا
مڑ کے خودے کد بیجاں گے
سانجھی کنک کپاہ وے ڈھولا
ستلج کنڈھے رل کے پیتی
پل گئوں گڑھ دی چاہ وے ڈھولا
آفیسرو پڑھا اکو کرپے
کندھاں ڈیے ڈھاہ وے ڈھولا
ہوندے نہیں پر ہو جاندے نہیں
لوکی بے پرواہ وے ڈھولا
میتھوں ودھ اُڈ یکے تینوں
ساڈے پنڈ دی راہ وے ڈھولا

سعدیہ وحید سعدی۔ اسلام آباد

بھول

پروفیسر صاحب دوپہر سے رات گئے تک ایک صاحب کے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آخر کار میزبان بولا۔ ''مجھے کہتے ہوئے اچھا نہیں تو نہیں لگ رہا لیکن مجھے علی الصباح اٹھ کر اسلام آباد کے لیے فلائٹ پکڑنی ہے۔ آیئے میں آپ کو دروازے تک چھوڑنے چلوں۔''

''خدا کی پناہ......!'' پروفیسر صاحب یکدم گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم مجھ سے ملنے میرے ہاں آئے ہو۔''

مرسلہ: شازیہ عارف۔ ساہیوال

حضرت مسکی

بصرہ میں ایک بزرگ رحمۃ اللہ علیہ ''مسکی'' کے نام سے مشہور تھے۔ مشک کو عربی میں مسک کہتے ہیں۔ لہٰذا مسک کے معنی ہوئے مشکبار یعنی مشک کی خوشبو میں بسا ہوا۔ وہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ ہر وقت خوشبودار رہا کرتے تھے یہاں تک کہ جس راستے سے گزر جاتے وہ راستہ بھی مہکتا۔ جب داخلِ مسجد ہوتے تو ان کی خوشبو سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت مسکی تشریف لے آئے ہیں۔

کسی نے عرض کی حضور آپ کو خوشبو پر کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہوگی؟ فرمایا میں نے کبھی خوشبو خریدی نہ لگائی میرا واقعہ بڑا عجیب و غریب ہے۔

میں بغداد معلی کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا جس طرح امراء اپنی اولاد کو تعلیم دلواتے ہیں۔ میری بھی اسی طرح تعلیم ہوئی میں بہت خوبصورت اور باحیا تھا میرے والد صاحب سے کسی نے کہا۔

اسے بازار میں بٹھاؤ تاکہ لوگوں سے گھل مل جائے اور اس کی حیا کچھ کم ہو چنانچہ مجھے ایک (بزاز) یعنی کپڑا بیچنے والے کی دکان پر بٹھا دیا گیا۔ ایک روز ایک بڑھیا نے کچھ قیمتی کپڑے نکلوائے پھر بزاز یعنی کپڑے والے سے کہا میرے ساتھ کسی کو بھیج دو تاکہ جو پسند ہو انہیں لینے کے بعد قیمت اور بقیہ کپڑا واپس لائے۔ بزاز نے مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ مجھے ایک عظیم الشان محل میں گئی اور آراستہ کمرے میں بھیج دیا۔

گیا دیکھتا ہوں کہ ایک زیورات سے آراستہ خوش لباس جوان لڑکی تخت پر بچھے ہوئے منقش قالین پر بیٹھی ہے تخت و فرش سب کے سب زریں ہیں اور اس قدر نفیس کہ ایسے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس لڑکی پر شیطان غالب آیا اور وہ ایک دم میری طرف لپکی اور چھیڑ خانی کرتے ہوئے منہ کالا کروانے کے درپے ہوئی میں نے گھبرا کر کہا اللہ عزوجل سے ڈر......!

مگر اس پر شیطان ان پوری پوری طرح مسلط تھا۔ جب میں نے جب اس کی ضد دیکھی تو گناہ سے بچنے کی ایک تجویز سوچ لی اور اس سے کہا۔

مجھے استنجا خانے جانا ہے۔

اس نے آواز دی تو چاروں طرف صرف لونڈیاں آ گئیں۔ اس نے کہا اپنے آقا کو بیت الخلا میں لے جاؤ۔

میں جب وہاں گیا تو بھاگنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی مجھے اس عورت کے ساتھ منہ کالا کرتے ہوئے اپنے رب سے حیا آ رہی تھی اور مجھ پر عذاب جہنم کے خوف کا غلبہ تھا۔

چنانچہ ایک ہی راستہ نظر آیا اور یہ کہ میں نے استنجا خانے کی نجاست سے اپنے ہاتھ منہ وغیرہ سان لیے اور خوب آنکھیں نکال کر اس کنیز کو ڈرایا جو باہر رومال اور پانی لیے کھڑی تھی۔ میں جب دیوانوں کی طرح نہ چیختا ہوا اس کی طرف لپکا تو وہ ڈر کر بھاگ گئی اور اس نے پاگل پاگل کا شور مچا دیا سب لونڈیاں اکٹھی ہو گئیں اور انہوں نے مل کر مجھے ایک ٹاٹ میں لپیٹا اور اٹھا کر ایک باغ میں ڈال دیا۔

میں نے جب یقین کر لیا کہ سب جا چکی ہیں تو اٹھ کر اپنے کپڑے اور بدن کو دھو کر پاک کر لیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

مگر کسی کو یہ بات نہیں بتائی اسی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ تم کو حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام سے کیا ہی خوب مناسبت ہے اور کہتا ہے کہ کیا تم مجھے جانتے ہو؟

میں نے کہا: نہیں۔

تو انہوں نے کہا میں جبرئیل علیہ السلام ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے میرے منہ اور جسم پر اپنا ہاتھ پھیر دیا اسی وقت سے میرے جسم سے مشک کی بہترین خوشبو آنے لگی یہ حضرت سیدنا جبریل علیہ السلام کے دستِ مبارک کی خوشبو ہے۔

حیا

حیا کے معنی ہیں عیب لگائے جانے کے خوف سے جھینپنا۔

اس سے مراد وہ وصف ہے جو ان چیزوں سے روک دے جو اللہ اور اس کی مخلوق کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔

لوگوں سے شرما کر کسی ایسے کام سے رک جانا جو ان کے نزدیک اچھا نہ ہو ''مخلوق سے حیا'' کہلاتا ہے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ عام لوگوں سے حیا کرنا دنیاوی برائیوں سے بچائے گا اور علماء و صلحا سے حیا دینی برائیوں سے باز رکھے گا۔ مگر حیا اچھا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مخلوق سے شرمانے میں خالق کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اور نہ کسی کے حقوق کی ادائیگی میں وہ حیا رکاوٹ بن رہی ہو۔

اللہ سے حیا یہ ہے کہ اس کی ہیبت و جلال اور اس کا خوف دل میں بٹھاؤ اور اس کام سے بچے جس سے اس کی ناراضگی کا اندیشہ ہو۔

حضرت سیدنا شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں۔ اللہ کے عظمت و جلال کی تعظیم کے لیے روح کو جھکانا حیا ہے اور اسی قبیل (قسم) سے حضرت سیدنا اسرافیل کی حیا ہے جیسا وارد ہوا کہ وہ اللہ سے حیا کی وجہ سے اپنے پروں سے خود کو چھپاؤ ہو ہیں۔ (تحت الحدیث)

حیا اور ادب کا آپس میں گہرا تعلق ہے، باحیا باادب بھی ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر مسلمان ایک دوسرے کی حرمت و عزت کا پاسدار، حسنِ اخلاق کا آئینہ دار، باادب و حیادار سنتِ رسول کی چلتی پھرتی یاد ہوا کرتا۔ فرزند و دختر اپنے مادر پدر سے اور شاگرد و مرید اپنے استاد و پیر سے آنکھ ملانا تو کجا پیش رو ہونے سے کجاتے، دمِ گفتگو آنکھیں جھکاتے، آواز دباتے اور جو حکم ہوتا بجالاتے۔ عدم موجودگی میں بھی ادب ملحوظِ خاطر رہتا اور بڑوں کو نام سے نہیں القاب سے یاد کرتے۔ الغرض ہر آن و ہر گام مرتبہ و مقام کا لحاظ و پاس اور بڑے چھوٹے کی تمیز برقرار رکھتے۔

مگر افسوس کہ ہم میں سے تقریباً ہر مرد و زن، ہر دختر و فرزندان پیارے اصولوں سے نابلد، اخلاق و آداب سے نا آشنا، قوانینِ شریعت سے ناواقف، بے زمام و لگام، خانگی اور معاشرتی نظام کی تباہی و بربادی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بے حیا اور بداخلاقی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

بیٹا باپ کی آنکھوں میں نہیں گریباں میں ہاتھ ڈال کر بات کر رہا ہے، بیٹی ماں کا ہاتھ اگرچہ نہیں بٹاتی لیکن ماں پر ہاتھ ضرور اٹھاتی ہے۔

چھوٹے ہیں کہ خلیق نہیں، بڑے ہیں کہ شفیق نہیں اور دوست ہیں کہ واقعتاً رفیق نہیں، بیٹا رحیم نہیں تو باپ حلیم نہیں، بیٹی ترش رو ہے تو ماں تلخ گو ہے۔ شاگرد حیادار نہیں تو استاد نیک کردار نہیں۔

علمِ دین سے محرومی اور اچھے ماحول سے دوری کی بنا پر والدین اولاد کی اسلامی تربیت کر رہے ہیں نہ بچے والدین کی خدمت۔ الغرض ہماری بے ادبیاں اور بدلحظیاں ہیں کہ جنہوں نے ہماری گھریلو و معاشرتی زندگی کو تہ و بالا کر کے تلخ و ترش کر کے رکھ دیا ہے۔

جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے سے زندگی خوش حال اور خوش خیال بن جاؤ۔

اس سلسلہ کی چند احادیث درج ذیل ہیں۔

حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

حیا کا نتیجہ صرف خیر ہے۔ (بخاری شریف)

اور ایک روایت میں ہے کہ

حیا ساری کی ساری خیر ہی ہے۔ (بخاری شریف)

حضرت زید بن طلحہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ہر دین کی (خاص) عادت ہوتی ہے اسلام کی عادت حیا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت ابنِ عمر حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: حیا اور ایمان دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی اٹھ جائے تو دوسرا بھی خود بخود اُٹھ جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ پہلے انبیا کے کلام سے لوگوں نے یہ جملہ بھی پایا ہے کہ اگر تو حیا نہ کرے تو جو چاہے کر (یعنی کو چیز تجھ کو برائی سے روکنے والی نہ ہو گی)۔ (بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی نے ارشاد فرمایا: حیا ایمان کا (اہم ترین) شعبہ ہے۔ (بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: حیا ایمان میں سے ہے، اور ایمان (یعنی اہلِ ایمان) جنت میں سے ہیں اور بے حیا بدی میں سے ہے اور بدی (والے) جہنمی ہیں۔ (ترمذی شریف)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

بے حیائی جب بھی کسی میں ہو گی تو اسے عیب دار ہی بنائے گی، اور حیا جب بھی کسی چیز میں ہو گی تو اسے مزین اور خوبصورت ہی کرے گی۔ (ترمذی شریف)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ محسنِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے حیا کی صفت چھین لیتا ہے، پس جب اس سے حیا نکل جاتی ہے تو وہ (خود) بغض رکھنے والا اور (دوسروں کی نظر میں) مبغوض ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ بغیض و مبغوض ہو جاتا ہے تو اس سے امانت نکل جاتی ہے۔ جب اس سے امانت نکل جاتی ہے تو وہ (لوگوں کی نظر میں) بددیانت ہو جاتا ہے۔ جب وہ بددیانت ہو جاتا ہے، تو اس میں سے رحم کا مادہ نکل جاتا ہے۔ جب اس سے رحمت نکلتی ہے تو وہ لاعن و ملعون ہو جاتا ہے، پس لاعن اور ملعون ہوتا ہے تو اس سے اسلام کا پھندا (عہد) نکل جاتا ہے۔ (ابنِ ماجہ شریف)

علی حمزہ۔ اقبال نگر ساہیوال

مسکرایا کریں

مسکرانا ایک فطری عمل ہے۔ آپ بھی مسکرایا کیجیے۔ مسکرانے سے آپ کا کچھ نقصان نہیں ہو گا۔ دکھ سکھ زندگی کا ایک حصہ ہے۔ غمگینی اور اداسی تو ایک آکاش بیل ہے جو انسان کو اندر ہی اندر سے چاٹ لیتی ہے مگر مسکراہٹ ایک روشنی ہے۔ زندگی ہے، مسکراہٹ ہی زندگی کی امید میں کرن پیدا کرتی ہے اور اسی میں طویل عمری کا راز بھی پنہاں ہے۔ یاد رہے حد سے زیادہ سنجیدگی بھی چہرے کو بگاڑ دیتی ہے اور مسکراہٹ سے چہرے پر گلاب سے کھلتے ہیں ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ خوشی و مسرت کی نوید ہوتا ہے لہٰذا مسکرانے کے معاملے میں کبھی کنجوسی نہ کیجیے گا۔ کیونکہ مسکراہٹ ہی زندگی کا حسن پنہاں ہے ورنہ تو مسلسل اداسی اور خاموشی ہے زندگی۔

مرسلہ: نورین۔ پشاور

پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں......

اور نئی ریلیز ز......

حماد زیدی

PSL

کرونا وائرس نے ساری دنیا کو اپنی انگلیوں پر

نچا رکھا ہے اور اسی وجہ سے پہلے PSL کے غیر ملکی کھلاڑی اپنے اپنے وطن واپس لوٹ گئے پھر تمام میچز بنا شائقین کے کھیلے گئے یعنی خالی اسٹیڈیم میں اور آخر سیمی فائنل اور فائنل تمام میچز منسوخ کرنا پڑے PSL کی رونقیں ماند تو پڑ گئیں مگر لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ بھی ضروری تھا کیونکہ صحت سب سے بڑی نعمت ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا

شعیب منصور کے نام سے کون واقف نہیں دل دل پاکستان کے خالق نے اس بار خواتین کے لیے ایک بہت خوبصورت گانا تیار کیا ہے جس میں ماہرہ خان دلہن کے روپ میں موجود ہیں۔ شادی کے موقعہ پر لڑکی کو جو دعائیں دی جاتی ہیں کہ اب تمہارا جنازہ ہی شوہر کے گھر سے اٹھے گا' ہر زیادتی کو سہنا تمہارا ایمان ہونا چاہیے۔ ایسی غلط سوچ کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے اگر آپ لوگوں نے یہ ویڈیو نہیں دیکھی تو ضرور دیکھیے۔

کھیل اور جنگ

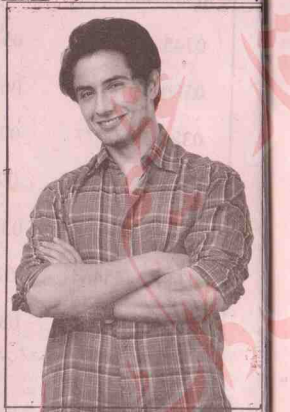

علی ظفر نے PSL کی افتتاحی تقریب میں ہونے والی Controversy کے بعد اختتامی تقریب کے لیے گانا تیار کرلیا تھا مگر برا ہو کرونا کا کہ افتتاحی تقریب تو ہمارے لوگوں نے خراب کی اور اختتامی تقریب پر کرونا ہاتھ صاف کر گیا۔ علی عظمت اور علی ظفر دونوں ہی بہت

بڑے اور پسندیدہ راک اسٹارز ہیں انہیں آپس میں لڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ رائے ایک دوست سے مختلف ہونا درست ہے مگر الزام تراشیاں کچھ مناسب نہیں۔ کھیل اور دنگل میں فرق ہونا چاہیے اور اب تو علی ظفر نے کرونا پر بھی گانا تیار کرلیا ہے یہ آگاہی مہم ہے یا میڈیا میں رہنے کی دیوانگی خدا بہتر جانتا ہے۔

ماں

لبنیٰ اسلم نے بے شمار ڈراموں میں کام کیا جن میں اکثریت ان ڈراموں کی ہے جس میں ان کا کردار ماں کا تھا انہوں نے ہمیشہ اپنی اداکاری سے ناضرین کو محظوظ کیا مگر ڈرامہ الف میں ان کا کردار اگر دیکھا جائے تو وہ بہت مضبوط ہے اور ان کی اداکاری بھی لاجواب ہے لیکن یہاں اگر منظر صہبائی صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ انہوں نے حمزہ علی عباسی (قلب مومن) کے دادا کا کردار نبھایا ہے اور کیا خوب نبھایا ہے۔ منظر صہبائی صاحب پہلی بار 2011 میں شعیب منصور کی فلم بول میں آئے تھے اور اسی فلم میں اپنے کردار پر Lux ایوارڈ بھی جیت چکے ہیں سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے اس فنکار کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

رونا بھی ضروری نہیں

پچھلے دنوں ہمایوں سعید کی ایک ویڈیو سوشل میڈیا پر

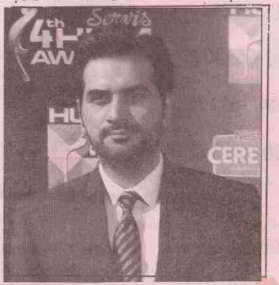

وائرل رہی جس میں وہ مزاحیہ انداز میں کہتے سنے گئے 'کرونا مجھے نا ہونا' لوگوں نے ان کی اس حرکت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ دنیا بھر میں بے شمار لوگ مر رہے ہیں۔ WHo نے جس بیماری کو خطرناک ترین بیماری قرار دیا ہے اس کے لیے ایسے بھونڈے مذاق کرنا درست نہیں بلکہ ان کو تو چاہیے تھا کہ وہ لوگوں میں Awarnes پیدا کرتے۔ یہی یہ بھی طریقہ ہے لوگوں کو بتانے کا کہ کیا چل رہا ہے ضروری تو نہیں ہر بات رو کر کی جائے۔

سچی کہانیاں ملنے میں اگر دشواری ہے تو ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

کراچی ایجنٹ	0300-2680248	
لاہور ایجنٹ	042-37249813	0300-4009578
راولپنڈی	051-5765665	0345-5058891
ملتان	061-4586533	0300-6301461
حیدر آباد	022-2780128	0321-3060477
پشاور	091-2212515	0344-9290185
فیصل آباد	0300-6698022	041-8503629
نواب شاہ	0244-362138	0344-3445464
الفتح نیوز ایجنسی، سکھر	0300-9313528	071-5613548

نمائندہ خصوصی

جاوید راہی	0300-9479844	اوکاڑہ
ارشد اقبال چوہان	0300-9657926	فیصل آباد/جڑانوالہ
عبدالغفار عابد	0300-4319264	چیچہ وطنی/ساہیوال
مور شاہد	0301-2868143	قمبر/شہداد کوٹ
مجید احمد جائی	0301-7472712	ملتان
چوہدری یاسر وکی	0303-3334464	دیپالپور